جنّت دو قدم

نبیلہ عزیز

پیش لفظ

اللہ ہمیشہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے۔ اور اُن کی ہر برائی، ہر غفلت، ہر لاپروائی سے بے نیاز ہو کر نوازتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کون کتنا بُرا ہے؟ اور کتنا گناہ گار ہے؟

وہ بس یہ دیکھتا ہے کہ یہ "میرا" بندہ ہے، اِسے دینے والا صرف میں ہوں، یہ مجھ سے مانگ رہا ہے، اسے میرے سوا کوئی نہیں دے گا...... اور وہ سچ مچ اُسے دیتا ہے، اُسے نوازتا ہے! اور کبھی کبھی تو اللہ اپنے گنہگار بندوں کو بنا مانگے ہی سب کچھ دے دیتا ہے، اُنہیں اُن کی توقعات سے بڑھ کے نواز دیتا ہے، یہاں تک کہ بندہ بے یقین سا ہو کے رہ جاتا ہے اور یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ "کیا میں اللہ کی اس قدر مہربانیوں کے قابل تھا؟" اور جب اپنے ضمیر سے اس سوال کا جواب "نفی" میں ملتا ہے تو انسان شرمساری اور ندامت کے باعث کچھ کہہ ہی نہیں پاتا اور وہ مان لیتا ہے کہ میں حقیقتاً اس قابل نہیں تھا جس قابل مجھے میرے رب نے بنا دیا ہے...... اور میں بھی اللہ کے انہی گنہگار بندوں میں شمار ہوتی ہوں جنہیں اللہ بن مانگے نواز دیتا ہے، میں بھی اکثر یہی سوچتی ہوں کہ میں اللہ کی اس قدر مہربانیوں کے قابل ہرگز نہیں تھی...... ایک ہی سال میں میری دو کتابوں کی اشاعت؟ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی مگر پھر بھی اللہ نے سب ممکن بنا دیا...... "جنت دو قدم" میرا ایک ایسا افسانہ ہے جو میرے ناولز سے بھی زیادہ پسند کیا گیا تھا جس کو پڑھنے کے بعد بہت سی رائٹرز اور بہت سی قارئین بہنوں نے باقاعدہ فون کالز کر کے اور باقاعدہ خطوط لکھ کر مجھ سے اس کی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور میری کاوش کو بے حد سراہا تھا جس پہ مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور میری بہت زیادہ خواہش تھی کہ میرا یہ افسانہ

میری کتاب میں شامل ہو اور میری کتاب اسی افسانے کے عنوان سے منظرِ عام پہ آئے ......اور میری اس خواہش کو ''ادارہ علم وعرفان'' نے پایہ تکمیل تک پہنچا کر مجھے بے پناہ خوشی سے ہمکنار کر دیا ہے جس کے لیے میں ادارہ علم وعرفان کے ایک انتہائی اہم رکن جناب گل فراز صاحب کی بے حد شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع فراہم کیا اور میرے اس افسانے کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا ہے اللہ تعالیٰ اس ادارے کو مزید ترقی اور کامیابی عطا کرے (آمین)

آپ سب کی دُعاؤں کی طالب

''نبیلہ عزیز''
(ڈھلیان شریف ڈنگہ)

جنت دو قدم

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔

''نفس زرد کتا ہے! اور جب ایک کتا بے لگام اور منہ زور ہو جاتا ہے تو وہ اپنے پرائے کی، اچھائی برائی کی اور گناہ ثواب کی تمیز بھول جاتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کس پہ بھونک رہا ہے؟ کس کو کاٹ رہا ہے؟ اور کیا کر رہا ہے؟ کیونکہ وہ ہر احساس سے بے بہرہ اور اندھا ہو چکا ہوتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ اس آدمی کو بھی اندھا کر ڈالتا ہے جو اسے اپنے جسم کے اندر اور اپنے جذبات کے اندر پرورش دیتا ہے اور سب سے زیادہ نقصان بھی اسی آدمی کا ہوتا ہے۔''

جب یہ زرد کتا اپنی ہوس، اپنی آگ، اپنی بھوک مٹا لیتا ہے تو پھر اک لمبی اور گہری نیند سو جاتا ہے لیکن یہ لمبی اور گہری نیند سونے سے پہلے انسان کے ضمیر کی آنکھ کو جگا دیتا ہے وہ آنکھ جس میں ایسی بصیرت ہوتی ہے کہ پوری دنیا کی نظریں خود پہ محسوس ہونے لگتی ہیں ہر آنکھ ہمیں کھوجتی نظر آتی ہے اپنا آپ بُرا اور غلیظ لگنے لگتا ہے اپنے وجود سے گھن آنے لگتی ہے، اپنی ذات ''داغ شدہ'' محسوس ہوتی ہے۔

تاریکیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، کہیں جائے پناہ نہیں ملتی، کہیں سکون نہیں ملتا اور تب انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا نہ اس زرد کتے کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ضمیر کی آنکھ بند کر سکتا ہے شاید اس لئے کہ آنکھ ایک (بار بند ہو) جائے تو پھر سمجھ لینا [illegible] کہ یا تو انسان مر گیا ہے یا پھر ضمیر مر گیا ہے۔

اور یہیں پہ آ کر میرا جینا اور مرنا دوبھر ہو گیا تھا کیونکہ ابھی تک شاید (شاید اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ابھی بھی پکا یقین نہیں ہے) میں بھی زندہ تھا اور میرا ضمیر بھی! [illegible] دونوں

میں سے کوئی بھی ''مردہ'' نہیں ہوا تھا کہ (کچھ محسوس ہی نہ ہوتا،) مجھے اپنا آپ کیچڑ اور غلاظت میں لت پت نظر آ رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی اپنے وجود سے کراہت کا احساس ہوتا تھا میں آئینہ دیکھتا تو میری آنکھیں آئینے کو سیاہ کر دیتی تھیں میں اپنی صورت بھی نہیں دیکھ پاتا۔ میں گہری تاریکی اور پستی میں گر چکا تھا۔

فرشتے مجھ پہ لعنت بھیجتے تھے، آسمان مجھے حقارت سے دیکھتا تھا زمین مجھے عذاب سمجھتی تھی کیونکہ میں نے زرد کتے کا کہا مانا تھا اور زرد کتے کا کہا ماننے والا کبھی سکون اور راحت نہیں پا سکتا کبھی قابل احترام نہیں ہو سکتا! بہت پہلے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ''جنت دو قدم'' ہے اور میں یہ پڑھ کر حیران ہوا تھا کہ جنت دو قدم کیسے ہو سکتی ہے؟ پھر میں نے اس عنوان کے نیچے درج پیراگراف کو پڑھا کسی بزرگ کا فرمان تھا کہ:

''جنت دو قدم'' ہے اور جواباً کسی شخص نے پوچھا تھا کہ ''جنت دو قدم'' کیسے ہو سکتی ہے؟'' تو بزرگ نے فرمایا۔

''ایک قدم تم اپنے نفس پہ رکھ دو تو دوسرا قدم خود بخود جنت میں پہنچ جائے گا۔''

مجھ پہ ادراک ہوا تھا کہ نفس کو کچلنا ایک امتحان ہے۔ پل صراط پہ چلنے کے مترادف ہے لیکن پھر بھی میں نفس کا اندھا ہی رہا تھا نفس مجھے کچل گیا تھا مجھے پل صراط پر سے گرا گیا تھا بھانبڑ مچاتے شعلوں میں! اور میں جلنے کے لئے رہ گیا تھا، میں جنت کے دو قدم گنوا چکا تھا، میں گمراہ ہو گیا تھا میں نفس پہ قدم نہیں رکھ سکا تھا میں زرد کتے کو نہیں مار سکا تھا میں نے اپنا ہی نقصان نہیں کیا تھا بلکہ کسی کی عزت چھین لی تھی کسی پہ ناجائز و ناحق تسلط جمایا تھا۔ کسی کے جسم سے کھیل کھیلا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ زرد کتا میرے ساتھ کھیل کھیل گیا تھا اور میں سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔

❁....❁....❁

میرے کپڑے پریس ہو گئے؟ میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ذرا کی ذرا ٹھہر کر ماسی حمیدہ سے پوچھا تھا کیونکہ میں جاگنگ پہ جانے سے پہلے انہیں کپڑے پریس کرنے کا کہہ گیا تھا۔

''جی صاحب گلو سے کہہ دیا تھا اس نے کر دیے ہوں گے۔'' گلنار، ماسی حمیدہ کی لاڈلی اور محنتی بیٹی تھی جسے کبھی کبھار پیار سے وہ گلو کہتی تھیں اور گلو حقیقتاً گلنار ہی تھی انار کے

پھول جیسی خوبصورت۔

ماسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے لئے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھوں تا کہ وہ اپنی گلو کی شادی سے فارغ ہو سکیں اور میں نے دیکھا بھی تھا لیکن وہ ماسی کو پسند نہیں آیا تھا کیونکہ وہ لڑکا خاصا لاابالی تھا اور لاابالی تو ماسی کی گلو بھی تھی شاید اسی لئے ماسی کو اعتراض ہوا تھا کہ دو لاابالی زندگی کی گاڑی آسانی سے نہیں چلا سکتے ایک کو ذمہ دار اور سمجھدار ہونا چاہئے بہرحال کوئی مل ہی جاتا دنیا میں لڑکوں کی کمی تو نہ تھی اور ویسے بھی ماسی کے کہنے پہ میری تلاش ابھی بھی جاری تھی جو گلو کے لیے ماسی کے سٹینڈرڈ کا لڑکا ڈھونڈ سکتی۔

''صاحب جوتے بھی پالش کر دوں؟'' میرے خیال کا تسلسل گلنار کی آواز سے ٹوٹا تھا میں نے ریک میں رکھے جوتے دیکھے سب پہ گرد نظر آ رہی تھی جبھی اس کی آفر قبول کرنا پڑی۔

''براؤن شوز کر دو بلیک رہنے دو۔'' میں اپنے جاگرز کے تسمے کھولتے ہوئے بتا رہا تھا وہ برش اور پالش لے کر قالین پہ ڈٹ کے بیٹھ گئی تھی اور یہی اس کے محنتی ہونے کا ثبوت تھا کہ وہ خود کام ڈھونڈ ڈھانڈ کے نکال لیتی تھی اور پھر جی جان سے جت جاتی تھی وہ ایسے لاپروا اور مگن انداز میں کام کرتی کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا اور وہ تھکتی بھی نہیں تھی اگر تھکی ہوتی تو اس طرح ایک ایک شوز کو رگڑ رگڑ نہ چمکا رہی ہوتی۔

ماسی کہتی تھیں کہ اس میں ہڈی نہیں ہے صرف ماس ہی ماس ہے اور ہم ماسی کی بات پہ ہمیشہ مسکرا دیتے تھے جو اپنی ہی بیٹی کو تاڑتی رہتی تھی اور جواباً گلنار بی بی کا کہنا ہوتا تھا۔

''ہاں سارا ماس میں نے لے لیا ہے اور ہڈیاں اپنی اماں کو دے دی ہیں۔'' کیونکہ ماسی کافی دھان پان قسم کی تھیں جبکہ گلنار بی بی حد درجہ گداز تھیں اور اسی میں اس کی خوبصورتی اور معصومیت تھی۔

میں واش روم سے شاور لے کر نکلا تو وہ میری تمام چیزیں سیٹ کر کے رکھ گئی تھی اور کمرہ بھی سنوار گئی تھی میں تیار ہونے لگا مجھے آج آفس میں ایک اہم میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی اور میٹنگ کے فوراً بعد سائٹ پہ جانا تھا پھر شام کو زری آپا کے ساتھ میٹنگ کا ارادہ تھا جس میں مجھے ان سے فائنلی بات کرنا تھی اپنی شادی کے متعلق، اپنے اور علیزہ کے متعلق اور...... اور اپنی محبت کے متعلق......

کیونکہ میں علیزہ کو بہت پسند کرتا تھا مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی جبکہ زری آپا

میرے لئے اپنی نند کو پسند کئے بیٹھی تھیں اور مسئلہ یہ تھا کہ اس پسند کو میرے بہنوئی فرحان صاحب بھی جانتے تھے اس لئے میرا انکار مہنگا بھی پڑ سکتا تھا اگر وہ طیش میں آجاتے تو مجھے علیزہ سے یقیناً ہاتھ دھونا پڑ سکتے تھے خیر اللہ کا نام لے کر آج کے دن کا آغاز کیا تھا اب دیکھنا یہ تھا کہ ہوتا کیا ہے؟

⁂

دن کا آغاز اللہ کا نام لے کر کریں اور کام نہ ہو؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا! میں نے دن بے حد مصروفیت میں گزارا تھا جس کی وجہ سے کچھ تھکن بھی ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود زری آپا کی آمد اور ان سے میٹنگ کے وقت میں خاصا چاق و چوبند تھا اور اپنا کیس ایک منجھے ہوئے وکیل کی طرح لڑا تھا جس کے نتیجے میں کیس فرحان صاحب کی رائے تک ملتوی کر دیا گیا تھا تاکہ ان سے پوچھ لیا جائے کہ ان کو اپنی بہن سے رشتہ نہ کرنے پہ ”طیش“ تو نہیں آئے گا اور اگر ان کا جواب نہیں میں ہوا تو پھر علیزہ بخاری میری ہوگی۔

میں نے دل ہی دل میں ہزاروں منتیں مان لی تھیں ویسے بھی میں پرہیزگار اور نمازی ٹائپ بندہ تھا اٹھارہ سال کی عمر سے پنجگانہ نماز ادا کرتا آ رہا تھا اکثر لوگ جو میرے حلقہ احباب میں شمار ہوتے تھے میری نماز کی پابندی اور عادت کی پختگی دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کیونکہ جب بھی نماز کا وقت ہوتا تھا میں اہم سے اہم کام بھی ترک کر دیتا تھا۔

اس کے علاوہ سگریٹ، شراب اور عورتوں سے ناجائز تعلقات سے ریکارڈ قائم کرنے کی حد تک دور بھاگتا تھا اور ان چیزوں کو نظر بھر کے دیکھنے اور استعمال کرنے کا کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا یہی وجہ تھی کہ میں نے اکثریت کی آنکھوں میں اپنے لئے ستائش دیکھی تھی اور ان ہی بہت سی آنکھوں میں، میں نے دو آنکھیں ایسی بھی دیکھیں تھیں جن میں میرے لئے محبت تھی، والہانہ پن تھا، لپکتی ہوئی چاہت تھی اور یہ آنکھیں...... میری علیزہ کی آنکھیں تھیں جن کو میں اپنے نام لکھنا چاہتا تھا اپنی دسترس میں اپنی قربت میں لانا چاہتا تھا۔

میری اس چاہت میں فرحان صاحب...... سوری...... ”فرحان بھائی“ ڈھال بن گئے تھے انہوں نے فیصلہ میرے حق میں لکھ دیا تھا اور میرے قدم ہواؤں میں پڑ رہے تھے خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا اور میری اس خوشی میں سبھی شریک ہو رہے تھے زری آپا فرحان بھائی، ماسی حمیدہ اس کے بیٹے اور گلنار بھی! میں نے سب کو مٹھائی لا کر دی اور خود علیزہ کو فون کرنے چل دیا تھا۔

کیونکہ کل زری آپا، فرحان بھائی اور پھپھو نے ان کے گھر جانا تھا پھپھو لاہور میں رہتی تھیں وہ کل صبح کی فلائٹ سے صرف میری خاطر کراچی آ رہی تھیں علیزہ میری کلاس فیلو ہی نہیں میرے بابا کے دوست کی بیٹی بھی تھی اور میرا آئیڈیل بھی، اس کی محبت میرے لئے فخر تھی، میرے شریک سفر کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور اب سب کی رضامندی نے ریلیکس ہی نہیں بلکہ سرشار کر دیا تھا میں حد سے زیادہ خوش تھا بے انتہا خوش۔

⁂

”ولید! زری آپا شادی پہ اصرار کر رہی تھی لیکن......“

”لیکن کیا؟“ علیزہ کو لفظ لیکن پہ ٹھہرتے دیکھ کر میں نے فوراً استفسار کیا تھا وہ بات کرتے ہوئے کچھ جھجک کا شکار ہو رہی تھی آج اتفاقاً وہ اپنی ممی کے ساتھ مارکیٹ میں نظر آ گئی تھی اور میں آنٹی سے اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ لنچ کے لئے لے آیا تھا۔

”بولو نا علیزہ لیکن کیا؟“ میں نے اپنے روبرو بیٹھی بے چینی سے ہاتھ مسلتی علیزہ کو بات مکمل کرنے پہ اکسایا تھا۔

”تم جانتے ہو پچھلے چند ماہ سے پاپا کا بزنس کافی کرائسس کا شکار رہا اب چند دنوں سے حالات سنبھلے ہیں تو پاپا چاہتے ہیں کہ دو تین ماہ تک وہ اپنے بزنس پہ توجہ دیں اور بعد میں شادی کی تیاری کریں۔“ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا اور میں کچھ سنبھل کے گویا ہوا۔

”دیکھو علیزہ، زری آپا بھی اپنی جگہ درست ہیں دراصل فرحان بھائی کے پوسٹنگ آرڈرز متوقع ہیں اور اگر وہ کہیں چلے گئے تو شادی کے انتظام کون کرے گا؟ زری آپا کے سوا تو میرا اور کوئی سگا رشتہ ہی نہیں ہے......“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ولید، ممی پاپا اس شادی کے مسئلے پہ بہت پریشان ہیں اور ان کی پریشانی مجھے ٹینشن دے رہی ہے پلیز آپ ابھی شادی کا مسئلہ ملتوی کر دیں۔“ علیزہ کافی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور میں اتنی سنجیدگی افورڈ نہیں کر سکتا تھا مجھے اس کا ہنستا مسکراتا فریش چہرہ اچھا لگتا تھا۔

”ڈونٹ وری یار! کچھ نہیں ہوتا میں عجلت دکھا کر اپنی دلہن کو ڈسٹرب نہیں کر سکتا ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہو گی۔“ ویٹر کے آنے تک میں اسے ہر ٹینشن سے آزاد کر چکا تھا وہ یکدم ہلکی پھلکی نظر آنے لگی تھی۔

''آپ بہت اچھے ہیں......''

''میں جانتا ہوں۔'' اس کی بے ساختہ تعریف کرنے پہ میں نے برجستہ جواب دیا تو وہ یکدم کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''کافی ذہین بھی ہیں۔''

''اب نہیں رہا۔''

''کیوں؟''

''بھئی منگیتر والا جو ہو گیا ہوں یعنی منگنی شدہ اور یہاں جب کوئی ''شدہ'' ہو جاتا ہے۔ تو اس کی عقل ماری جاتی ہے۔ وہ اس کی تفصیل شدہ بات پہ اور زیادہ ہنسی تھی۔''

''لگتا ہے فلاسفر ہو گئے ہیں؟''

''شادی اور منگنی کے بعد بندہ یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر فلاسفر کیونکہ فلسفے اور پاگل پن کے درمیان ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے جب وہ پردہ پھٹ جاتا ہے تو بندہ یا تو پاگل پن میں کود جاتا ہے یا فلسفے میں! اور میں یقیناً فلسفے کی سمت آ گیا ہوں بہرحال تم بے فکر رہو نہ شادی دور ہے نہ پاگل پن دونوں کام ہو جائیں گے۔'' میں نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے شرارت سے دیکھا وہ میری باتوں سے جی بھر کر محظوظ ہو رہی تھی اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ ٹینشن فری ہو جائے......

''یعنی مجھ سے شادی کر کے آپ پاگل ہو جائیں گے کیا میں اتنی بُری ہوں!'' اس نے مجھے گھور کے کہا تھا۔

''ارے یہ میں نے کب کہا اب تو تمہاری باری ہے میں فلاسفر ہوا ہوں تو کسی کو پاگل بھی تو ہونا ہے اسی لئے تو کہا ہے دونوں کام ہو جائیں گے۔'' میں نے یکدم اپنی بات کو نیا رخ دے دیا تھا اور وہ میری بات پہ اپنی ہنسی کنٹرول نہیں کر پائی تھی۔

''سچ کہتے ہیں کہ مرد کے پاس باتوں کے جال کبھی ختم نہیں ہوتے اور عورت مچھلیوں کی طرح پھنس جاتی ہے۔'' وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھی اور میں بل پے کر کے اس کے پیچھے ہی نکل آیا تھا۔

علیزہ مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بے ارادہ ہی میری نظر سامنے سے آتی لڑکی پہ ٹھہر گئی تھی وہ ایک غیر معمولی حسن کی مالک تھی لیکن انتہائی سادہ لباس اور اسکارف میں ملبوس تھی اس کا ملکوتی حسن ہر دیکھنے والی نگاہ کو مبہوت کر رہا تھا جس

کے باعث کئی قدم ٹھٹک جانے پہ مجبور ہو رہے تھے اور میں بھی اتنے غیر معمولی حسن کو دیکھ کر چونک گیا تھا میرے قدموں میں بھی ''توقف'' آیا تھا میری نظریں بھی مچل گئی تھیں اور شاید ایک آدھی ہارٹ بیٹ بھی مس ہوئی تھی لیکن صرف اک لمحے کے لئے......

اس سے زیادہ کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا یا پھر میرے پاس سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا وہ لڑکی پاس سے گزر کر جا چکی تھی جبکہ علیزہ کسی گہری سوچ میں اتر گئی تھی اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ میری سمت پلٹی۔

''ولید! یہ مرد ہر چہرے پہ کیوں فدا ہو جاتے ہیں؟'' وہ یقیناً مجھے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے دیکھ چکی تھی اس کی آنکھوں میں بڑا سنجیدہ پن تھا میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سوال کیوں پیدا ہوا ہے؟

''جہاں تک میری سوچ کا پوچھتی ہو تو میں یہی کہوں گا کہ مرد ہر چہرے پہ فدا نہیں ہوتا بلکہ مرد کا نفس ہر چہرے پہ فدا ہوتا ہے ہر خوبصورتی پہ مرمٹتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ نفس اس قدر زور آور ہو جاتا ہے کہ چہرے بھی نہیں دیکھتا ورنہ تو خود مرد صرف ایک ہی چہرے کا عاشق ہوتا ہے اور ایک ہی چہرے پہ فدا ہوتا ہے یہاں تک کہ جان لٹا دیتا ہے۔'' میں نے حقیقتاً ایک سچی کھری بات کہی تھی کبھی کبھی مرد صرف جسم دیکھتا ہے اور کبھی کبھی چہرے، جن کو دیکھ کر مرد کے اندر ضمیر کی کھونٹی سے بندھا رہنا والا زرد کتا (نفس) کان اٹھا لیتا ہے دم ہلانے لگتا ہے۔

جیسے ابھی ابھی اس لڑکی کو دیکھ کر میرے اندر اس زرد کتے نے دُم ہلائی تھی، غرغرایا تھا، بھونکنا چاہا تھا لیکن مجھے فی الحال اس کتے پہ اختیار تھا میں نے اسے خاموشی سے اپنے پاؤں سے دبا دیا تھا مگر یہ کتا ''ہمیشہ'' ہی دب جائے؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

جو مرد اور عورتیں اسے ہمیشہ دبا لیتے ہیں، اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں وہ بہت عظیم اور طاقتور لوگ ہوتے ہیں اور میں ایسے عظیم اور طاقتور لوگوں میں شامل نہیں ہو سکا تھا میں تو اس کتے کے ہاتھوں اندھی کھائی میں گرا تھا اور ایسی چوٹ آئی تھی کہ مرہم کی تمنا بھی شرمندگی اور ندامت کا باعث لگتی تھی۔

❂......❂......❂

''گلنار! یہ سارے کپڑے اٹھا کر صاحب کے کمرے میں جو اٹیچی رکھا ہے اس میں رکھ آؤ۔'' زری آپا اپنی طرف سے بری کی شاپنگ شروع کر چکی تھی ان کا خیال تھا کہ جو چیزیں زیادہ ٹائم لیتی ہیں وہ پہلے ہی بنوا لینی چاہئیں جن میں علیزہ کے ڈریسز اور زیورات شامل تھے۔

آج وہ علیزہ کو لے کر اس کے پسندیدہ بوتیک پہ گئی ہوئی تھیں اور میں دن بھر ان کے ساتھ خوار ہوتا رہا تھا گھر آتے ہی صوفے پہ نیم دراز ہو گیا تھا اور زری آپا، گلنار کے ساتھ مل کر شاپنگ کا پھیلاوا سمیٹنے لگی تھیں وہ کپڑے میرے کمرے میں پہنچا کر دوبارہ آ گئی تھی۔

''آپ تھک گئی ہوں گی آپا جی میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں۔'' اس کی بات پہ میں اور زری آپا بیک وقت ہنسے تھے۔

''کیا ہوا آپا جی؟'' وہ ہماری ہنسی سے ہونق بن گئی تھی۔

''پگلی جب کوئی تھک جائے تو پاؤں اور ٹانگیں دبائی جاتی ہیں سر نہیں۔'' زری آپا نے اس کے گال پہ تھپکی دی۔

''تو میں پاؤں دبا دیتی ہوں۔'' وہ جھٹ سے ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

''ارے نہیں ایسی بھی تھکن نہیں ہوئی بس تم چائے لے کر آؤ فرحان آتے ہی ہوں گے مجھے گھر جانا ہے کافی لیٹ ہو چکی ہوں۔'' اس نے زری آپا کو چائے پلائی اور وہ فرحان بھائی کے ساتھ گھر چلی گئیں۔

میں وہیں صوفے پہ آڑا ترچھا لیٹا رہا تھا۔

''صاحب آپ کے پاؤں دبا دوں؟'' وہ اب میری سمت متوجہ ہو چکی تھی۔

''نہیں نہیں بس ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو۔'' میں نے ریموٹ اٹھا کر نیوز چینل سرچ کیا اور گلنار کو وہاں سے جانے کا سگنل دیا تھا۔ ابھی وہ باہر کو قدم بڑھا ہی رہی تھی کہ شارق نے دھاوا بول دیا تھا۔

''گلنار صاحبہ آج میرے کھانے کا انتظام بھی یہیں کر دینا میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' شارق نے باہر نکلتی گنار سے کہا تھا وہ میرا اکلوتا دوست اور ہمراز تھا اکثر میرے گھر آتا رہتا تھا اور گلنار کا کافی مذاق اڑاتا تھا ایک تو وہ کافی گداز یعنی صحت مند تھی اور پھر اس کی معصومیت میں خوبصورتی رچی تھی۔

اس کے علاوہ اس کا نام بھی کافی دلکش تھا اور وہ کہتا تھا کہ گلو چلتی پھرتی معصوم شہزادی ہے بس بھولے سے اک ملازم کے گھر پیدا ہو گئی ہے۔

''جی صاحب کر دوں گی۔''

''جیتی رہو میری بچی اللہ تمہیں صحت مند رکھے۔''

وہ اسے چھیڑتا ہوا میری طرف آ گیا تھا اور آتے ہی مجھے ٹھوکر ماری تھی۔

''ذلیل، کمینے شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں اور مجھے بتایا بھی نہیں۔'' اس نے چھوٹتے ہی شکوہ داغ دیا۔

''ارے ابھی تو صرف زری آپا کی تیاریاں شروع ہوئی ہیں باقی سب کچھ تو تمہیں بتانے اور ڈیٹ طے ہونے کے بعد ہی ہو گا نا؟''

''اوئے طوطا چشم میں تیری ساری بہانے بازیاں جانتا ہوں تو بس اپنے مطلب کے وقت ''یار'' بنتا ہے اس وقت تو بار بار میری یاد آتی تھی جب مس علیزہ بخاری سے اظہار محبت جھاڑنا تھا اور آج خبر ہی نہیں، ہرجائی میاں مٹھو۔'' وہ مجھے عجیب و غریب لقب دے رہا تھا اور میں اسے گھورنے لگا۔

''کہیں پی کر تو نہیں آئے؟'' میں نے مشکوک لہجے میں دریافت کیا تھا۔

''پی کر آتا تو کسی لڑکی کے پاس جاتا تیرے جیسے چھ فٹے مرد کے پاس کیوں آتا؟'' اس کی بات پہ میرا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا اب وہ مجھے گھور رہا تھا۔

''لگتا ہے آج کسی نے لفٹ نہیں کروائی بے چارے کو؟'' میں نے اس کی پھڑکتی ہوئی رگ پہ ہاتھ رکھا اس کا کام لڑکیوں کی زلفوں سے کھیلنا تھا اور میں ہمیشہ اسے روکنے اور سمجھانے کی کوششیں کرتا رہ جاتا تھا۔

''لفٹ؟'' وہ جی کھول کر ہنسا۔

''تم جانتے ہو ولید واسطی، شارق گیلانی لفٹ لیتا نہیں دیتا ہے۔'' وہ میرے برابر بیٹھتے ہوئے فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا لہجے میں سرشاری تھی (برائی کی سرشاری)

''اسی لئے تو کہتا ہوں لینا بھی چھوڑ دو، دینا بھی چھوڑ دو، جرم انسان کو برباد کر دیتا ہے سیدھے رستے پہ آ جاؤ......'' میں نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی جو ہمیشہ کی طرح سعی لاحاصل ٹھہری تھی وہ صوفے پہ بازو پھیلاتے ہوئے بڑے مگن اور دلکش لہجے میں بولا تھا۔

پسند اللہ کو کیا چاہیے کیا آ جائے اے زاہد!
مجھ کو شرم گناہ، تجھ کو تکبر ہے عبادت کا

اس کا شعر میرے اعصاب پہ بم کی طرح گرا تھا میں دہل سا گیا تھا۔

''یہ کیا بولتے رہتے ہو اللہ معاف کرے، میں کب تکبر کر رہا ہوں صرف تمہیں

سمجھانے کے لئے کہا ہے۔"

"یار ولید بات سیدھی سی ہے دوسروں کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے جبکہ خود سمجھنا بہت مشکل! بیشک تم نمازی ہو، پرہیزگار ہو، اللہ کو چاہنے اور اللہ کا حکم ماننے والے ہو لیکن تمہاری ان سب باتوں کا مزا تو تب آئے گا جب تم پہ کبھی اللہ نے آزمائش کا وقت ڈال دیا پھر دیکھیں گے تمہاری عبادتوں کا اثر، ویسے یار عبادت میں صداقت نہ ہو تو اللہ عبادتیں واپس پھیر دیتا ہے۔" شارق عجیب لاپروائی سے کہتا مجھے دہلا رہا تھا میرے اندر کا کمزور انسان مزید کمزور ہونے لگا تھا۔

"یار میں تو ہمیشہ تمہیں سیدھی راہ......"

"دیکھو ولید تم اچھے ہو! ہمیشہ اچھے ہی رہو لیکن اپنی اچھائی اور عبادتوں سے ہمیں شرمندہ تو مت کیا کرو سیدھی راہ صرف مصلاّ بچھا لینے سے نہیں ملتی اس کے لئے دل اور نیت کو بھی سیدھا پھیلانا پڑتا ہے جو فی الحال ممکن نہیں جب ہوا کر لیں گے۔ تم اللہ کے سامنے اپنے لئے جوابدہ ہو گے ہمارے لئے نہیں۔" اس نے بہت سنجیدگی سے مجھے ٹوکا تھا۔

"وہ سب یہی سمجھتے تھے کہ اگر میں نماز پڑھتا ہوں اور حرام چیزوں سے دور بھاگتا ہوں تو اپنے آپ کو بہت اچھا، باکردار اور نیک سمجھتا ہوں اور باقی سب میری نظروں میں حقیر سے انسان ہیں جبکہ ایسا بالکل نہیں تھا میں تو بہت ہی کمزور انسان تھا نہ جانے اپنی اس پرہیزگاری کے پردے میں اپنا کونسا پہلو چھپا رہا تھا اور اچھا بننا چاہتا تھا لیکن یہ لوگ...... ہائے...... یہ لوگ! نہ اچھا بننے والے کو چھوڑتے ہیں نہ بُرا بننے والے کو! اپنی وے لوگوں کا کیا ہے کسی کو خوش اور مطمئن نہیں ہونے دیتے ان کی باتوں پہ دھیان نہیں دینا چاہئے ہمیں اپنی زندگی جینا ہے اور لوگوں کو اپنی زندگی......!"

❋......❋......❋

اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنی نہیں رہتی لوگوں کی ہو جاتی ہے اور یہ صرف ہماری غلطی اور گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مجھ سے بھی ایک گناہ ہوا تھا، میں اندھا ہو گیا تھا مجھے سیاہ و سفید بھول گئے تھے مجھ پہ شیطان حاوی ہو گیا تھا اور اس شیطان نے سوئے ہوئے زرد کتے کو جگا دیا تھا جو مجھے اور میری ذات کو کھا گیا تھا۔

جس نے ولید واسطی کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا جس نے مجھے پاتال میں گرا دیا تھا اور میں آج بھی اس وقت پہ پچھتاتا ہوں جب وہ میرے پاس آئی تھی......

یہ ان دنوں کی بات ہے جب زری آپا دو ماہ پہلے ہی میری شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں وہ روزانہ صبح بچوں کو اسکول بھیج کر یہاں آ جاتی تھیں اور سب کام نپٹا کر شام کو چلی جاتی تھیں۔

یہاں کے کافی کام ماسی حمیدہ اور گلنار نے بھی سنبھال رکھے تھے پورے گھر کی صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھ بھی ہو رہی تھی اس روز بھی زری آپا اور ماسی حمیدہ واشنگ مشین لگا کر پردے، بیڈ شیٹس، کشن کور اور تکیوں کے کور دھو دھو کر پھیلائے جا رہی تھیں جبکہ گلو خشک ہو جانے والے کپڑوں کو استری کرنے کا کام سرانجام دے رہی تھی عصر کے قریب کچھ کام نپٹا ہی تھا کہ ماسی حمیدہ کے گاؤں سے قریبی عزیز کی فوتگی کی اطلاع آ گئی سو وہ آناً فاناً چھوٹے کو ساتھ لے کر گاؤں چلی گئیں اور دس گیارہ سالہ اجی کو گلنار کے پاس چھوڑ گئیں۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر گلو نے کھانا بنایا اور دن بھر کے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگی میں کھانا کھانے کے بعد ڈرائینگ روم میں ہی آ بیٹھا تھا اور ٹی وی آن کر لیا وہ اپنے کام ختم کر کے جا چکی تھی اور میں ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہیں نیم دراز ہو گیا تھا۔

مجھے نہیں خبر کہ کب میری آنکھ لگی اور کب بارش اور طوفان نے ہلہ بول دیا اچانک زوردار دھماکے پہ میری آنکھ کھلی تھی ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پٹ زوردار طریقے سے آپس میں ٹکرائے اور دراڑ پڑنے کی وجہ سے شیشہ ٹوٹ کے بکھر گیا تھا۔

"اتنا شدید طوفان ہے؟" میں نے ٹی وی بند کرتے ہوئے قریب جا کر کھڑکی بھی بند کرنا چاہی۔

"صاحب یہ کپڑے......" میرے پیچھے گلنار کی پھولی ہوئی سانسوں بھری آواز ابھری میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔

"کچھ کپڑے اوپر ہی رہ گئے تھے سوچا طوفان سے کہیں اُڑ جائیں گے اسی لئے جا کر لے آئیں یہاں رکھ دوں سارے بھیگے ہوئے ہیں؟" اس نے فرش پہ ایک کونے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ باقی سب دروازے تو اس وقت بند تھے......

"صاحب کپڑے رکھ دوں؟" وہ دُہرا کے بولی جبکہ میری نظریں اس کے نوخیز گداز سراپے کی رعنائی میں اُلجھی ہوئی تھیں اس کی بے خبری اور لاپروائی کے باعث اس کے کئی پوشیدہ راز کھل رہے تھے اور میری فراموشی کے باعث میرے ضمیر کی کھونٹی سے بندھا زرد کتا بھی کھل گیا تھا اس کتے کی غرغراہٹ میرے کانوں میں سنائی دے رہی تھی وہ دم ہلاتا ہوا کان چوکنے کر کے

اپنے چاروں پنجوں پہ کھڑا ہو گیا تھا اس کا بھونکنا شروع ہو چکا تھا۔

میں ہر چیز بھول گیا تھا شیطان نے میرے اندر کے زرد کتے کو خوب بھڑکایا تھا اور میں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کرتے ہوئے، گناہ ثواب کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا اس کے ہاتھوں سے کپڑے ہٹاتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔ اور پھر ''دو قدم'' کی جنت گنوانے کے لئے قدم اٹھا لیا تھا ایسا قدم جو گناہ تھا۔ جو کیچڑ تھا، غلاظت تھی اور میں اس غلاظت کی دلدل میں اُتر گیا تھا صرف ایک کتے کی ہوس اور آگ بجھانے کے لئے۔ یہاں تک کہ گلو کے تمام احتجاج اور چیخ و پکار دم توڑ گئے وہ بے دم ہو گئی تھی۔

اور پھر اگلی صبح میرے گناہ کی صبح تھی میرے گناہ کی زندگی شروع ہو چکی تھی شیطان خوش ہو چکا تھا اور رات کو چاروں اطراف غرانے والا زرد کتا لمبی اور گہری نیند سو چکا تھا لیکن ضمیر کی آنکھ جاگ گئی تھی اور اس آنکھ کے جاگنے سے بہت کچھ جاگ گیا تھا۔ گناہ کا احساس، ندامت کا احساس، کچھ کھو دینے کا احساس اور اپنے مقام سے گرنے کا احساس جس کے باعث میرے دل و دماغ میں کانٹے سے اُگ آئے تھے میری سوچ مفلوج ہو چکی تھی۔

میرے کردار، میرے دعوؤں کا قتل ہو چکا تھا میرا صاف ستھرا دامن گند سے بھر گیا تھا اور ساتھ ہی اس لڑکی کو بھی تباہ کر ڈالا تھا جو اپنی معصومیت اور لاپروائی کے ہاتھوں ماری گئی تھی نہ وہ میرے پاس، میرے سامنے لاپرا حلیے میں آتی نہ میرے نفس کی بھوک بے دار ہوتی لیکن شاید اللہ نے اسے میری آزمائش کے لئے بھیجا تھا اور میں اس آزمائش پہ پورا نہیں اتر سکا تھا۔

جب انسان شیطان کے بہکاوے میں آتا ہے تو وہ کبھی بھی اللہ کی آزمائش پہ پورا نہیں اتر سکتا اور جو اللہ کی آزمائش پہ پورا نہیں اترتا وہ سکھ کیسے پا سکتا ہے؟ وہ تو اپنے لئے جہنم کی آگ خریدتا ہے گناہوں کے عوض جہنم ہی مل سکتا ہے جنت تو نہیں۔

سکھ چین اور دائمی خوشیوں کا خزانہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے شیطان کے پاس تو وقتی جذبات کی تسکین اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں، بربادی بھی ایسی جو کیچڑ میں لت پت کر ڈالے اور دوزخ کا نوالہ بنا ڈالتی ہے اور میں یہ نوالہ بن گیا تھا جس کا ادراک مجھے گناہ کا نشہ اترنے کے بعد ہوا تھا۔

میں نے کھوئے ہوئے انداز میں وال کلاک کی سمت دیکھا رات وقت کے صفحات

میں پلٹی جا چکی تھی اور جو چیز پیچھے پلٹ دی جائے وہ نشان ماضی بن جاتی ہے اس وقت اک نئی رات کے لئے ایک نئے دن کا اہتمام ہو رہا تھا اس اہتمام میں ہر ذی روح شریک تھا ہر رنگ موجود تھا ہر احساس پنہاں تھا صرف ولید واسطی نہیں تھا وہ ولید واسطی جسے اپنے آپ پہ اپنے کردار پہ فخر ہوتا تھا شاید یہی فخر مجھے منہ کے بل گرا گیا تھا میں ہر فخر سے خالی ہو گیا تھا خالی ہاتھ، البتہ گناہوں کی پوٹلی کندھوں پہ آ گئی تھی جس کا بوجھ سہارنا میرے لئے بے حد مشکل اور جان لیوا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہئے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں حلق کے بل چیخا تھا اور میرا پیون یکدم گھبرا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

میں اپنے دل میں اُبلتے آتش فشاں کے ہاتھوں فرسٹریشن کا شکار ہو چکا تھا میرے دل و دماغ پہ کئی بوجھ آ پڑے تھے میں پاگل ہو رہا تھا گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میرے ضمیر میں بربادی کا سا سماں تھا ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے کے بعد دوسری کی زندگی سے کھیلنے جا رہا تھا جو میرے کمزور کردار سے بے خبر مجھے اچھائی کی اونچی مسند پہ بٹھائے میرے ساتھ پہ فخر کر رہی تھی جبکہ دوسری طرف میں اونچی مسند سے گر کر پاش پاش ہو چکا تھا اور اس قدر دور تک بکھرا تھا کہ سمٹنے کی امید اور امکان ہی نہیں بچا تھا۔

ایسے میں غصہ سر پہ سوار ہونے لگتا تھا بات بے بات جھگڑنے لگا تھا اسی کیفیت کو نوٹ کرتے ہوئے علیزہ، زری آپا اور شارق بھی استفسار کر چکے تھے مگر میں اپنا گناہ اپنا جرم کیسے بتاتا؟ کہاں سے اتنا حوصلہ لاتا کہ سب کے سامنے خود کو زمین بوس کر سکتا اپنی غلطی اپنا گناہ دکھا سکتا، کیسے کہتا کہ میں نے کسی کی عزت روندی ہے ماسی حمیدہ کی گلو کا دامن تار تار کیا ہے۔

''کاش میں پاگل ہو جاؤں، کاش میرا دماغ مفلوج ہو جائے۔'' میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بازو ٹیبل پہ ٹکا دیے تھے اور چند سیکنڈز بعد میرا سیل بجنے لگا تھا۔

سختی سے مٹھیاں بھینچ کر نمبر دیکھا تو سکرین پہ علیزہ کا نام جگمگا رہا تھا لب بھینچ کر میں نے سیل آف کر دیا تھا۔

ایک انسان کی غلطی کی سزا اس کے اپنوں کو بھی بھگتنا پڑتی ہے اور ایسا ہی میرے اپنوں کے ساتھ ہو رہا تھا میں بے چینی سے اٹھ کر آفس روم سے نکل آیا تھا علیزہ کی ممی پاپا شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا کہہ رہے تھے اور میں دو بارہ انہیں ٹال چکا تھا اسی لئے میرے اس گریز پہ

سب کو تشویش ہو رہی تھی وہ سب وجہ جاننے کی کوشش کرتے تھے اور میں وجہ بتاتا تو کہیں کا نہ رہتا سبھی مجھ پہ تھوک دیتے اور میں......

سڑکوں پہ آوارہ اور بے مقصد گاڑی دوڑاتے ہوئے اپنے آپ کو کوس رہا تھا بہت دن ہوئے میں اپنے رب سے دور ہو چکا تھا شارق سچ کہتا تھا مجھ میں صداقت (صدق) نہیں ہے اسی لئے تو پل بھر میں گمراہ ہوا تھا اور اب اللہ سے دوبارہ رشتہ استوار کرتے ہوئے اس کے سامنے جھکتے ہوئے ڈر لگتا تھا شرمندگی ہوتی تھی کیسے معافی مانگتا بھلا کس منہ سے؟

اور اللہ سے ڈرنے والا انسان اللہ کے بندوں سے بھی ڈرتا ہے، صرف اس لئے کہ مجھ سے کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے، مجھ سے کسی کا دل نہ دکھ جائے، مجھ سے کسی کا نقصان نہ ہو جائے یا پھر میری ذات کسی کے لئے باعث آزار نہ ہو اور اسی ''آزار'' نہ بننے کے واسطے انسان قدم قدم پہ ٹھہرتا ہے، لفظ لفظ سوچتا ہے اور ہر مقام پہ اپنے رب سے مدد مانگتا ہے جیسے میں مانگ رہا تھا جیسے میں ٹھہر رہا تھا، جیسے میں سوچ رہا تھا اور میرا اب فیصلے کی ڈور میرے دماغ کو تھما رہا تھا اور دماغ نے یہ ڈور تب تھامی جب ماسی حمیدہ میرے پاس آئی۔

''صاحب جی آپ نے گلو کے لئے کوئی لڑکا دیکھا؟'' میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا اکیلا سوچوں کی گردش میں بھٹک رہا تھا جب میری محویت ماسی حمیدہ کے سوال سے ٹوٹی میں چونک گیا تھا اچانک میرے ماتھے پہ پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے۔

مجھے ماسی حمیدہ کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت نظر آئی مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی میرا گریبان پکڑ کر میرے چہرے پہ تھپڑ مارنا شروع کر دیں گی مجھ پہ لعنت بھیجیں گی مجھے بد دعائیں دیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا یہ تو صرف وہم تھا ایک ایسا وہم جو چوری کے بعد ہر چور کو ہو جاتا ہے اور میں بھی اس وہم میں سب سے چھپتا پھر رہا تھا کبھی زری آپا اور شارق سے کبھی علیزہ اور ماسی حمیدہ سے اگرچہ ماسی حمیدہ کو خبر ہی نہ تھی لیکن میں چور تھا ڈر تو لگنا تھا۔

''صاحب جی آپ ٹھیک تو ہیں؟'' میری چپ، چوروں جیسی آنکھیں اور ماتھے پہ آیا پسینہ دیکھ کر ماسی کو تشویش ہوئی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہوں آپ کس لیے آئی ہیں؟'' میں ان کا سوال بھول چکا تھا۔

''صاحب جی گلو کے لئے لڑکا دیکھنے کا کہا تھا، میں اب بڑی جلدی اس کا بیاہ کر دینا

چاہتی ہوں نگوڑی بے وقوف کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے چپ لگ گئی ہے اور بیٹھے بیٹھے رونے لگتی ہے اب تو کام بھی نہیں کرتی مجھے ڈر ہے کہیں روگی نہ ہو جائے۔'' میرے استفسار پہ ماسی بولتی چلی گئی اور میں نظر جھکانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

''کچھ دن انتظار کرو ماسی میں کوشش کروں گا۔'' ماسی کو تسلی دے کر میرے دماغ نے ایک فیصلہ کیا تھا اک ڈور تھامی تھی...... بس دل کو سنبھالنا باقی تھا اور ویسے بھی جن لوگوں کے جسموں میں زرد کتے کا زور چلتا ہو وہاں دل کو جینے کی راہ نہیں ملتی سو میرے دل کے لئے بھی راہیں مسدود ہو چکی تھیں اب میرے دل کو بھی بھلا کہاں جینا تھا؟ کیونکہ میرے ضمیر کی آنکھ کے سامنے گلنار کا وجود اور بے گناہی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کے رہ گئے تھے جن سے نگاہ چرانا میرے ضمیر کی موت کے برابر تھا اور ضمیر کی موت اتنی آسانی سے ممکن نہیں ہوتی۔

اور میرا یہ فیصلہ مزید پختہ تب ہوا جب میں نے بہت دنوں بعد گلنار کو دیکھا تھا تو وہ میرے گناہ کا آئینہ تھی اس کا ویران حلیہ اور اجاڑ آنکھیں مجھے زمین میں گاڑ گئیں وہ اپنے آپ سے بھی خفا لگ رہی تھی اور میرے رب کو مجھ سے خفا کر رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ وحشت زدہ ہو کر واپس اپنے کوارٹر میں بھاگ گئی۔

اور ایک دن میں نے اپنے دل کو سچ مچ کچل ڈالا تھا اگر میں اپنے دل کو نہ کچلتا تو پھر گلنار کچلی جاتی کیونکہ وہ بہت زیادہ بیمار تھی اور ماسی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی اور واپسی پہ ماسی نے اسے مارنا شروع کر دیا تھا اور وہ اپنا بچاؤ کرنے کی بجائے مار کھاتی رہی شاید وہ اپنے آپ کو سزا دے رہی تھی اپنی لاپروائی اور معصومیت کی سزا، کیونکہ اگر وہ لاپروا نہ ہوتی تو اس دن رات آگئے یوں بے خبر حلیے میں میرے پاس نہ آتی بلکہ باقی لڑکیوں کی طرح احتیاط کرتی، گریز کرتی۔

بہرحال اس سے غلطی بے خبری اور بھول پن میں ہوئی تھی جبکہ مجھ سے غلطی ارادتاً اور نفس کے بہکاوے اور جذبات کی آگ میں جل کر ہوئی تھی اور اس نے تو احتجاج بھی کیا تھا مجھے روکا بھی تھا لیکن میں نے اس کے ہر احتجاج کو پس پشت ڈال دیا تھا سو مجرم اور سزا کا مستحق میں ہی تھا میرے گناہ کا پلڑا بھاری تھا اور اب جو بھی سہنا تھا مجھے سہنا تھا اسی لئے ماسی کا ہاتھ روک دیا۔

''ماسی آپ کا مجرم میں ہوں یہ نہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں صاحب جی؟'' ماسی حمیدہ کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

''ہاں یہ بے گناہ ہے، غلطی مجھ سے ہوئی ہے آپ سزا مجھے دیجیے میں آپ کی ہر سزا

کے لیے تیار ہوں۔'' میری گردن جھکی ہوئی تھی میرے لئے آج کا دن روزِ حساب تھا۔

''یہ...... کک...... کیسے صاحب جی؟'' گلو فرش پہ بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھی اور ماسی بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دو ماسی میں نہ اپنی عزت کا پاس رکھ سکا نہ تمہاری عزت کا۔'' میں نے ماسی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے گناہ کے بعد معافی مانگتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے لیکن ایسی بھی نہیں ہونی چاہئے کہ بندہ معافی ہی نہ مانگے اور اللہ کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے کیونکہ اللہ کو منہ دکھانے سے پہلے اللہ کے بندوں کو منہ دکھانا پڑتا ہے اس لئے ان سے معافی مانگنا بھی اللہ کے حکم میں سے ہے جو میں ہر ممکن طریقے سے کرنا چاہتا تھا اس کے لئے چاہے دل روندتا چاہے دل کی دنیا، مجھے بس معافی درکار تھی۔

❁......❁......❁

''ولید تم یہاں؟'' علیزہ مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی میرا ان کے گھر کبھی آنا جانا نہیں رہا تھا جبکہ وہ لوگ کل شادی کی ڈیٹس فکس کرنے کا کہہ رہے تھے ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور میں ان کے گھر چلا آیا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' میری ذات کا خالی پن شاید وہ بھی دیکھ چکی تھی۔

''ہوں۔'' میرا مختصر سا اشارہ دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔

''بیٹھو نا کھڑے کیوں ہو؟'' اس نے کپڑے ہٹا کر صوفے کی سمت اشارہ کیا علیزہ کے ڈریسز شاید آج ہی بوتیک سے تیار ہو کر آئے تھے۔

''کیا بات ہے ولید تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' وہ بے چین نظر آنے لگی تھی۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کہو کیا بات ہے۔''

''کیا تم ایک بدکردار شخص سے شادی کرنا چاہو گی؟'' ''کیا مطلب ہے؟'' اس کا رنگ بدلا تھا۔

''مطلب کہ اگر میں بدکردار ہوتا تو پھر بھی تم مجھ سے شادی کر لیتیں؟'' میرا لہجہ اور انداز بہت کچھ کہہ رہے تھے علیزہ سفید پڑ گئی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں میں تمہیں اندھیرے میں رکھ کر زندگی نہیں گزار سکتا علیزہ، مجھ

سے گناہ ہوا ہے میں نے اپنے گھر کی ملازمہ پہ ہاتھ ڈالا ہے......'' میں نے وہ سب کہہ دیا جو مجھے دنیا کی نظروں میں گرانے کے لئے کافی تھا اور میں گر گیا تھا علیزہ نے مجھے گھر سے نکال دیا شارق مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتا رہا اور زری آپا کئی دن میرے گھر ہی نہیں آئی تھیں علیزہ سے شادی کا انکار سب کے لئے دھماکہ ثابت ہوا تھا لوگ طرح طرح کی باتیں اور سوال کر رہے تھے اور میں گردن جھکائے ہوئے تھا۔

❁......❁......❁

علیزہ سے شادی کا انکار اور پھر گلنار سے شادی کرنا بے حد مشکل مراحل تھے جو میں نے طے کرنا تھے اور کر بھی لئے تھے کئی انگلیاں اٹھیں، کئی نشتر لگے، سزا تو بھگتنا تھی سو بھگت لی، آخر گناہ کیا تھا نیکی تو نہیں کہ بدلے میں مجھے پھولوں کے ہار پہنائے جاتے لوگوں کی کاٹ دار نظروں کا سامنا کرنا تھا، تمسخر دیکھنا تھا جو جی بھر کے دیکھا تھا پھر بھی وہی کیا جو اللہ کی رضا تھی نکاح کے چھ ماہ بعد گلنار نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا اور میں رونے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

بلکہ اب تو میں تنہائی میں اکثر ہی اللہ کے حضور رو پڑتا تھا شاید اپنے گناہ کی ندامت کچھ مزید بڑھ جاتی تھی میں گلنار کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن وہ گم سم سی رہتی تھی، میں اس کی نظروں میں کیا تھا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا جبکہ میں اس کی عزت اور قدر کرتا تھا اسے اس محبت سے بھی بڑھ کر چاہا جو مجھے علیزہ سے تھی کیونکہ علیزہ میری رضا تھی اور گلنار میرے رب کی رضا تھی اسے اپنانے کا فیصلہ مسجد میں نماز پڑھتے اور دعا مانگتے ہوئے مجھ پہ وارد ہوا تھا اور میں اس فیصلے سے کیسے منکر ہو سکتا تھا۔

بس کبھی کبھی دل کی کیفیت طبیعت پہ چھائی ہوتی تو علیزہ کے کھو جانے کا احساس جاگتا تھا اور اس کے ساتھ ہی پچھتاوے نوچنے لگتے تھے تب اللہ کو یاد کرتا تو سب کچھ بھول جاتا تھا سوائے ''دو قدم کی جنت'' کے جو مجھ سے بیٹھے بٹھائے چھن گئی تھی۔

بے شک اللہ سے معافی مانگتے مانگتے اکثر رات گزر جاتی تھی بے شک میری زندگی اک عام ڈگر پہ آ گئی تھی بے شک میری بیوی بچے بھی خوش تھے لیکن پھر بھی میں خوش نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ میں نے جنت کھوئی تھی صرف اور صرف دو قدم جنت بھی نہیں پا سکا تھا اور جنت نہ پانے کا احساس میرے دل میں ''کانٹے'' کی طرح چبھا رہتا تھا ہر آن ہر گھڑی...... صرف ''دو قدم جنت۔''

......❁......

نی میں کملی آں

"پارو" اور کہیں ٹک کر بیٹھ جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا اور وہ کسی کا انتظار بھی کرے ناممکن! اور اس پہ ایک اور قیامت کہ وہ اپنی بھوک اور نیند بھی برداشت کرے......تو یہ بھی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

پارو کے مزاج آشنا پارو کے بارے میں ایسے ہی گماں رکھتے تھے مگر آج ان کے خیال کے برعکس وہ متواتر چار گھنٹوں سے ایک ہی جگہ بیٹھی ہوئی تھی اور انتظار بھی کر رہی تھی اس پہ تیسری قیامت یہ کہ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی پھر بھی وہ برداشت کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اس کا کوئی مزاج آشنا دیکھ لیتا تو یقیناً غش کھا جاتا اور سب سے پہلے یہی سوچتا کہ ایسی کونسی بات ہو گئی ہے جس نے پارو جیسی "اتھری" اور بے لگام چیز کو لگام ڈال دی ہے لیکن کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ پارو کی آنکھوں کے سامنے اس وقت بھی اپنی ماں کے جڑے ہوئے ہاتھ لہرا رہے ہیں اور التجائیہ آنسو بہہ رہے ہیں جو اسے برداشت کرنے پر مجبور کر رہے تھے ورنہ دنیا کی ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو اسے اس طرح مجسمہ بن کر بیٹھنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ ورنہ تو وہ کب کی اپنی من مانی کر کے اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلا چکی ہوتی۔

اسے بھاری کامدار لہنگے اور زیورات سے وحشت ہو رہی تھی اس پہ میک اپ سے الجھن کا احساس مزید طبیعت کو بے زار کر رہا تھا مگر وہ اسے بے زاری کے باوجود رات کی اس پہر بھی صبر و ضبط کئے بیٹھی اپنی فطرت کے خلاف ریکارڈ توڑ رہی تھی اور جس شخص کے لئے ایسا کیا جا رہا تھا وہ ابھی تک کمرے میں تشریف نہیں لایا تھا اور ابھی بھی دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ پارو اپنے سرکش دل کو الٹی سیدھی باتیں سوچنے سے باز رکھتی اپنی ہی کلائی میں کھنکھتی

چوڑیوں کو انگلیوں سے چھیڑ رہی تھی کہ اسے آہٹ کا احساس ہوا اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا مگر دروازہ ابھی بھی بند تھا یہ آہٹ اس کا وہم تھی اس نے ایک بار پھر مایوس ہو کر چہرہ جھکا لیا۔

مایوسی اسے اس کے نہ آنے سے نہیں ہو رہی تھی مایوسی اسے اپنی حالت پہ ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنا حلیہ تبدیل کرنا چاہتی تھی اپنے آپ کو آزادی دلانا چاہتی تھی اور جب تک وہ نہ آتا بقول بڑی آپا کے اسے اسی حلیے اور انداز میں رہنا تھا۔

"ملک صاحب شکر ادا کرو کہ پارو آج مجبور ہے ورنہ......" وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑائی اور آخری لفظ کو ذرا لمبا کھینچ کر لب بھی بھینچ لئے تھے۔

پارو کے اندر غصے کا زہر بھر رہا تھا وہ بل کھا رہی تھی اور ایک عجیب سی آگ تھی جو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سلگنے پہ مجبور کر رہی تھی اس سے پہلے کہ سلگنے کے بعد شعلوں کا عمل شروع ہوتا دروازہ کھولا گیا اور چند سیکنڈز بعد بند کر دیا گیا۔ قدموں کی چاپ سے ہی آنے والی ہستی کی سرد مہری کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ دو منٹ کے وقفے سے دوسری سرد مہری کا مظاہرہ ہوا......

"کیا دن بھر دلہن بننے کا شوق پورا نہیں ہوا جو رات کے تین بجے بھی اتنے ذوق و شوق سے تیار بیٹھی ہو؟"

پارو ایک دم تڑپی کیونکہ یہ سرد مہری نہیں زہر میں بجھا ہوا حقارت آمیز نشتر تھا جو وہ اس کے وجود میں اتار چکا تھا تکلیف تو ہونا ہی تھی اسی تکلیف کے باعث اس نے براہِ راست گردن موڑ کر ملک آژمیر حیات کو دیکھا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھ کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔

"آپ کو شاید اندازہ نہیں ملک صاحب کچھ مجبوریاں دیکھنے والوں کو شوق نظر آتی ہیں لیکن وہ شوق نہیں ہوتیں مجبوریاں ہی ہوتی ہیں۔"

اُدھار رکھنا اسے بھی نہیں آتا تھا کھڑے کھڑے حساب چکاتی تھی۔

"اس کمرے سے باہر تو مجبوری کا بہانہ مان سکتا ہوں لیکن اندر ایسی کون سی مجبوری تھی جس نے تمہیں ابھی تک باندھ رکھا ہے؟" ملک آژمیر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ پارو کے تلوے سے لگی اور سر پہ بجھی تھی اس نے تلملا کر رخ اس کی سمت پھیرا۔

"پارو میرے جڑے ہاتھوں کی لاج رکھنا کوئی کچھ بھی کہے تجھے ہر حال میں چپ رہنا ہے دیکھ ماں باپ کی عزت اب تیرے ہاتھ میں ہے دوسرے پنڈ جا کر ہمارے سر پہ خاک

نہ ڈلوانا ہم پہلے ہی......"

پارو کی زباں پہ آئے جلتے سُلگتے تیز الفاظ یکدم سرد پڑ گئے ماں کی التجائیں دوبارہ کانوں میں گونجنے لگیں اور مرحوم باپ کی عزت کا خیال آتے ہی اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا کیونکہ انہیں وہ پہلے ہی ایک دھچکا لگ چکا تھا۔

"میں لائٹ آف کر رہا ہوں اگر صبح تک اسی طرح بیٹھنے کا ارادہ ہے تو صوفے پہ چلی جاؤ۔" اس نے چونک کر دیکھا وہ سگریٹ ختم کر کے کپڑے بھی بدل چکا تھا اور بیڈ پہ اس کے قریب بیٹھا اسے اٹھنے کا اور اپنا ساز و سامان اتارنے کا سگنل دے رہا تھا پارو نے آج برداشت کا عہد کیا تو اسے نبھانا بھی تھا، سو خاموشی سے اٹھ کر کمرے کے ساتھ بنے ایک چھوٹے کمرے میں آ گئی جہاں اس نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔

کافی دیر بعد وہ واپس کمرے میں آئی تو کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ کیونکہ اسے جو کچھ سمجھایا گیا تو وہ کچھ اور تھا اور جو اس وقت ہو رہا تھا وہ کچھ اور تھا اور اس کچھ اور کے متعلق تو کسی نے کوئی ہدایت ہی نہ دی تھی نہ ہی ایسی صورتِ حال کے لئے اسے تیار کیا گیا تھا بلکہ سبھی کا یہی خیال تھا کہ ملک آژمیر اسے دلہن بنے دیکھے گا تو دل و جاں سے فدا ہو جائے گا دیوانہ ہو جائے گا لیکن وہ دیوانہ تو نہیں البتہ بیگانہ ضرور ہو گیا تھا۔

"وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کس سمت مڑنا چاہئے صوفے کی سمت یا پھر بیڈ کی سمت؟ اتنی دیر سوچ بچار کے بعد اس کے قدم صوفے کی سمت اٹھ گئے اسے اس کے پہلو میں جانا گوارا نہیں تھا اور وہ ریلیکس ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

"اری پارو یہ تو بتا رونمائی میں کیا ملا؟" وہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا جب پارو کی کسی سہیلی کا پرشوق جملہ ان کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا اور اسی وقت اس نے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی پارو کو دیکھا اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر معنی خیزی لڑکیاں معنی سے ہنستی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئیں وہ صبح سے نکلا ہوا تھا اس وقت نہا کر کپڑے تبدیل کرنے آیا تھا تنہائی میسر آتے ہی وہ الماری کی سمت بڑھا اور پھر اس کے قریب آ گیا۔

"یہ تمہارا رونمائی کا تحفہ ہے کل اماں نے دیا تھا مجھے نہیں پتہ کہ اس میں کیا ہے میں

رات کو دینا بھول گیا تھا آئم سوری......" پیکٹ بیڈ پہ اس کے سامنے تقریباً پٹخنے والے انداز میں رکھا گیا تھا اور ساتھ یہ بھی جتا دیا گیا کہ اماں نے دیا ہے میری طرف سے مت سمجھنا...... اور وہ چپ چاپ بیٹھی بس دیکھتی رہی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور ملک آژمیر اس کی مسلسل خاموشی سے حیرت میں غرق ہو رہا تھا کیونکہ جو کچھ بچپن سے پارو کے بارے میں جانتا تھا یا پھر جیسا لوگ پارو کے بارے میں اظہار کرتے تھے وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی تھی حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ پارو کوئی "دنگل" مچائے تاکہ اماں کو اپنی لاڈلی بھانجی کے کرتوت تھوڑا دھچکا تو لگاتے مگر پارو تو جیسے دنگل کرنا ہی چھوڑ چکی تھی اور وہ مایوس ہو رہا تھا۔

"پارو پتر ناشتا آ چکا ہے اندر بھیج دیں؟" اماں نے دستک دی تو دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے جھانک کر اسے بھی دیکھ لیا لیکن آژمیر کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر اندر آ گئیں۔

"تم بھی آ چکے ہو؟ چلو اچھا ہوا ناشتا تو اکٹھے ہی کرنا تھا بیٹھو تم دونوں میں بھیجتی ہوں، صفیہ آتی ہے ناشتا لے کر۔" آژمیر کو موجود دیکھ کر انہیں مزید تسلی ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد صفیہ آپا ان کا ناشتا لے کر آئیں اور ٹیبل پر سجا کر باہر نکل گئیں۔ پارو ان سے کافی نارمل بلکہ سرسری انداز میں ملی تھی وہ اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ خاموشی سے کھانا کھایا گیا اور وہ بھی اٹھ کر چلا گیا اس کے بعد لڑکیوں کا جھرمٹ تھا اور طرح طرح کی عورتیں تھیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پورا گاؤں اس کے کمرے میں سمٹ آیا ہو عورتیں اشتیاق سے ملک آژمیر حیات کی "ووہٹی" دیکھنے آ رہی تھیں اور سب ہی کو ووہٹی پسند بھی آئی تھی مگر کچھ نظریں ایسی بھی تھیں جن میں ووہٹی کا رنگ و روپ تیر کی طرح چبھا تھا انہیں ملک آژمیر حیات کی ووہٹی ذرا بھی نہ بھائی تھی اور یہ ان کے اندر کے حسد اور جلن کا نتیجہ تھا ورنہ پارو سادگی میں بھی کسی جگہ ٹھہر جاتی تو وہ جگہ سج جاتی تھی۔

"پارو یہ ماہین ہے چچا قدیر کی بڑی بیٹی۔" ساجدہ آپا نے آگے بڑھ کے تعارف کروایا تھا اور ماہین نے چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ پارو کے مہندی رچے دودھیا ہاتھ میں ماہین کا ہاتھ بہت حد تک سنولا گیا تھا حالانکہ ماہین کو اپنی گوری چمڑی پہ بڑا ناز ہوتا تھا۔

"ساجدہ آپا! یہ آژمیر کی اب آخری شادی ہے نا؟ کہیں یہ نہ ہو کہ پھر چھ ماہ بعد نئی

شادی کی خبر مل جائے۔"

پارو سے ہاتھ ملا کر ماہین نے ساجدہ آپا کو مخاطب کیا اور اس کی بات پہ جہاں ساجدہ آپا ٹھٹکیں وہیں پارو بھی لب بھینچ کر رخ موڑ گئی تھی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو ماہین وہ کون سا آٹھ دس شادیاں کر چکا ہے جو تم ایسا کہہ رہی ہو۔" ساجدہ آپا کو غصہ تو آیا مگر کیا کرتیں آخر وہ چچا زاد تھی اور موقع بھی کچھ نازک تھا اس لئے فی الوقت انہیں خاموش ہونا پڑا تھا پھر ماہین کو رخصت کر کے وہ پارو کے قریب آ گئیں۔

"دیکھو! یہ لوگ ہماری ذرا ذرا سی خوشی سے جل اٹھتے ہیں اور ہمیشہ فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، تمہیں ان کی باتوں پہ دھیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا یہ گھر بھی تمہارا اپنا ہے اور اس میں رہنے والے فرد بھی تمہارے اپنے ہیں اور اپنی چیز سے بدظن نہیں ہوتے ہم نے بڑی مشکلوں سے تجھے بیاہا ہے میری جان خیال رکھنا کسی کے جال میں مت آنا۔"

آپا، ملک آژمیر کی بڑی بہن اور پارو کی سگی خالہ زاد بہن تھیں وہ آس پاس کے حالات سے واقف تھیں اس لئے اسے بھی چوکنا اور پرسکون رہنے کی تاکید کر رہی تھیں اور وہ سنے جا رہی تھی۔

ولیمہ کی رونق ماند ہوئی تو گھر میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ سر شام ہی گاؤں کا ازلی سناٹا جھینگروں کی آوازوں کو نمایاں کرنے لگا تھا وہ آج اس کا انتظار کرنے کی پابند نہیں تھی اسی لئے فوراً ہی کپڑے بدل کر آرام دہ حلیے میں آ گئی تھی اتنے دنوں کی تھکن اور نیند کی کمی اسے سونے پہ اکسا رہی تھی۔

"لیکن سوؤں کہاں؟" اس نے صوفے کو دیکھ کر پھر بیڈ کو دیکھا وہ ابھی کمرے میں نہیں آیا تھا۔ "اگر نیند میں صوفے سے گر گئی تو؟ ہونہہ میں کیوں گروں گی؟ کل وہ بیڈ پہ سویا تھا آج میں سوؤں گی میں یہاں صوفے پہ سونے کے لئے تو نہیں آئی...... اور جب مجھے بیڈ پہ سویا دیکھے گا تو اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لے گا۔"

وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اس پر عمل کرنے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھوڑی دیر بعد وہ بیڈ پہ محو خواب ہو چکی تھی لیکن رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب زوردار آہٹ پہ اس کی نیند

ٹوٹ گئی اس نے چونک کر دیکھا وہ شاید غصے میں تھا اپنی گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پہ کافی زور سے پٹخی تھی اور اب بیڈ پہ بیٹھ کر جھکتے ہوئے اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے سوتی بن گئی۔ مگر سونے میں اور سوتا بننے میں بڑا فرق ہوتا ہے پھر انتظار میں تھی کہ وہ کہاں سوتا ہے اسے یقین تھا کہ وہ بیڈ پہ نہیں سوئے گا مگر اس کا یقین رائیگاں گیا وہ کپڑے بدل کر بیڈ پہ ہی آ کر لیٹا تھا۔

"محترمہ ماہ پیکر میں جانتا ہوں کہ تم جاگ رہی ہو اور سونے کا صرف ڈرامہ کر رہی ہو لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ مجھے تمہارے سونے یا نہ سونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مجھ پہ تمہاری موجودگی کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتی نہ بیڈ پہ سونے سے تم میرے دل کے قریب آ سکتی ہو اور نہ دور جانے سے مجھے تمہاری کمی محسوس ہو سکتی ہے اس لئے اس کمرے میں تم جیسے چاہو رہ سکتی ہو تم پہ کوئی پابندی نہیں۔ کیونکہ تمام پابندیاں اپنے دل کے لئے ہیں دل قابو تو سب کچھ قابو...... یقیناً تم سمجھ گئی ہو گی؟" وہ اتنے سکون اور اطمینان سے بات کر رہا تھا کہ پارو تلملا کے رہ گئی تھی لیکن پھر بھی ضبط کئے لیٹی رہی۔

"لیکن اس سب کے باوجود یہ بات خاص طور پہ یاد رکھنا کہ تم کبھی بھی ریناں کی جگہ نہیں لے سکتیں۔" آژمیر کا یہ نشتر اتنا زہریلا اور تیز دھار تھا کہ پارو جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"مجھے اس کی جگہ لینے کا شوق بھی نہیں ہے ملک صاحب ہاں وہ میری جگہ لینے کی کوشش ضرور کر چکی ہے۔" پارو سچ کہہ رہی تھی مگر ملک آژمیر کو یہ سچ کبھی بھی گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔

"تمہاری میرے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی جبکہ میرا پورا دل ہی اس کے لئے تھا بلکہ اب بھی ہے اور جب دل ہی اس کے لئے ہے پھر تم اس دل میں کیسے رہ سکتی ہو؟" وہ پارو کو سرتاپا جلا کر راکھ کر دینا چاہتا تھا اور پارو جل تو رہی تھی مگر راکھ نہیں ہو رہی تھی اس وقت بھی اس کا دل اس کے الفاظ پہ جیسے شعلوں کی نذر ہوا تھا مگر وہ ان شعلوں کو برداشت کر گئی۔

"میرے رہنے کے لئے دل اور بہت ملک صاحب، دلوں کی کمی کہاں؟" وہ برداشت کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑتی انتہائی تحمل سے گویا ہوئی اور ملک آژمیر پہلی بار اسے دیکھ کر رہ گیا تھا زیرو بلب کی ملگجی سی روشنی میں بھی وہ دمک رہی تھی۔

"پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟ میں تو سمجھ رہا تھا تم کبھی بھی اس شادی کے لئے ہامی نہیں بھرو گی لیکن میرا خیال ہے تمہیں اس پرپوزل کا انتظار تھا جس کے آتے ہی فوراً ہامی بھر لی گئی۔" اس کا لہجہ طنزیہ اور کافی حد تک کاٹ دار تھا۔

"میں نے رات کو بھی کہا تھا کہ کچھ مجبوریاں دیکھنے میں شوق نظر آتی ہیں لیکن وہ شوق ہوتی نہیں اور آپ سے شادی کیوں کی؟ یہ سوال آپ اپنی ماں سے کرتے بہتر جواب ملتا کیونکہ انہوں نے ہی اپنا دوپٹہ اتار کر میری ماں کے قدموں پہ رکھا تھا کہ ہم شادی کے لئے ہامی بھر لیں۔" وہ بھی لفظ چبا چبا کر کہتی کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھی۔

ملک آثر میر کو منہ توڑ جواب مل چکا تھا۔ اس لئے چپ کا چپ رہ گیا۔ مگر پھر بھی پارو کا انداز اور لب ولہجہ ذرا نہیں بھایا تھا اسی لئے سلگتی ہوئی نظر سے اس کی کمر کو گھورا تھا۔

"شنو تو ٹھہر میں اوپر چڑھتی ہوں پر دیکھ سارے سوہے (سرخ) بیر میرے، اگر ایک بھی خراب کیا تو ہاتھ توڑ دوں گی سمجھی؟" شنو کو بیری پہ چڑھنے میں ناکامی ہو رہی تھی اور درختوں اور دیواروں پر چڑھنے کی ماہر پارو کو یہ ناکامی برداشت نہ ہوئی اور فوراً آگے بڑھی لیکن ساتھ ہی اپنے لئے سرخ سرخ بیروں کی بکنگ بھی ضروری سمجھی تھی۔

"چل ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔" شنو بھی آخر اس کی سہیلی تھی وہ بھی "دا" لگانا جانتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد پارو بیری فتح کر چکی تھی بیری کی شاخوں پہ بیٹھے طوطے، بلبل اور چڑیا جو سکون سے بیٹھے بیر ٹھونگ رہے تھے پارو کی آمد پہ ایک ہلچل آمیز شور مچاتے آگے پیچھے اڑتے چلے گئے۔

"ارے کم بختو! میں کیا تمہیں کھانے لگی تھی جو یوں تڑپتے ہوئے جا رہے ہو؟" اس نے اڑنے والوں کو کھری کھری سنائی۔

"ارے وہ سمجھ رہے تھے کہ بیری پہ کوئی چڑیل وارد ہو گئی ہے۔" شنو نے اس کا مذاق اڑایا۔

"ایسی کی تیسی مجھے چڑیل سمجھنے والوں کی اور یہ تو کیوں دانت نکوس رہی ہے؟" وہ بیری پہ چڑھ کے بھی شنو کے لتے لینے کھڑی ہو گئی تھی حالانکہ دونوں کافی گہری اور جگری سہیلیاں تھیں لیکن جہاں دونوں میں اختلاف ہو جاتا وہاں تو تو میں میں کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے روٹھ بھی جاتی تھیں۔

دیکھ پارو چھیتی چھیتی کر ماسی آ گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔" شنو نے سنجیدہ صورت بنالی اور اسی چھیتی چھیتی میں اچانک ایک دھماکہ ہوا اور پارو زمین سے آ لگی۔

"ہائے پارو مر گئی...... ہائے پارو مر گئی...... ماسی پارو مر گئی۔" شنو شور مچاتی ہوئی صحن

کی سمت دوڑی اور پھر شنو کے ساتھ پارو کی اماں اور آپا پچھواڑے میں دوڑتی آئیں لیکن وہاں پارو بالکل ٹھیک ٹھاک بیٹھی کافی بلند آواز سے چیخ رہی تھی اور اپنی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

"ہائے پارو مری نہیں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ آپا پارو کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہائے اللہ پارو کی ٹانگ۔"

"ٹانگ ٹوٹے تیرے خصم کی میری کیوں توڑ رہی ہے منحوس کلموہی۔" پارو نے اندھا دھند واویلا کرتی شنو کی کمر میں دھموکا جڑ دیا اور شنو یکدم ٹھنڈی ہو گئی اور اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ پارو کی کوئی ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی سب سلامت ہیں۔

اور اس سلامتی پہ اسے تھوڑی مایوسی بھی ہوئی تھی کیونکہ وہ تو سوچ رہی تھی کہ پارو چار دن بستر پر پڑی تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے اور یہ جو ہر ایک پہ چوہدرانی بنی پھرتی ہے تھانیداروں کی طرح کام کرواتی ہے سب کچھ بھول جائے گی لیکن شنو یہ بھول رہی تھی کہ تھانیدار یا پھر چوہدری اگر ٹوٹ پھوٹ بھی جائیں تو اپنے کام پھر بھی باآسانی نکلوا لیتے ہیں۔

"اللہ سمجھے تجھے پارو میری زندگی کو عذاب بنا کر کیا ملتا ہے تجھے؟" اماں اس کی خراشوں پہ مرہم لگانے کے بعد اب اپنا ماتھا پیٹ رہی تھی۔

"اماں تیری زندگی میں نے عذاب نہیں کی۔" پارو اماں سے زیادہ بے زار ہوئی، انداز میں وہی لاپروائی تھی جو بچپن سے چلی آ رہی تھی اور کوئی اس لاپروائی کو ختم نہیں کر سکا تھا۔

"پارو کیوں تنگ کرتی ہے اماں کو؟" صفیہ آپا آج کل میکے آئی ہوئی تھیں لیکن اماں کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں کیونکہ صفیہ سے چھوٹی ربیعہ کی شادی ہو رہی تھی اماں پہ کام کا کافی بوجھ تھا اوپر سے پارو نے ہر ایک کا ناک میں دم کر رکھا تھا ایک تو اوٹ پٹانگ حرکتیں اور اوپر سے منہ پھٹ زبان نے اسے زبان زد عام کر رکھا تھا ہر کوئی توبہ توبہ کرتا تھا۔

"آپا میں کب اماں کو تنگ کرتی ہوں اور الٹا اماں مجھے......"

"کم بخت آگ لگے تیری اس چپڑ چپڑ چلتی زبان کو الٹا دوسروں کو الزام دیتی ہے۔" اماں نے دوہتڑ دے مارا اور پارو بلبلا کر رہ گئی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھی جھلملانے لگے تھے۔

"دیکھا آپا؟ اب بھی میں ہی غلط ہوں ایک تو مجھے چوٹ لگی اوپر سے اماں بھی اپنا شوق پورا کر رہی ہے۔"

پارو کی بھرائی ہوئی آواز پہ صفیہ آپا کا دل بھی لمحہ بھر کو پسیج گیا۔

"چھوڑو اماں کیوں پریشان ہوتی ہو اگر یہ گری ہے تو چوٹ بھی تو اپنے آپ کو لگی ہے ہمیں کیا، دوبارہ جا کر چڑھ جائے ہماری بلا سے۔" آپا نے اماں کو بہلانا چاہا۔

"ارے کیسے چھوڑ دوں سولہ سال کی لوتھا ہوگئی ہے پر عادتیں دیکھ آٹھ سالوں والی بھی نہیں ہیں ارے میں کہتی ہوں اس کے یہی ڈھنگ رہے تو میرا جینا حرام ہو جائے گا میرے سینے پہ مونگ دلے گی یہ منحوس۔" اماں اپنا سر پیٹ رہی تھی لیکن پارو پہ ذرا اثر نہیں تھا آخر صفیہ نے ہی ماں کو سمجھایا اور اللہ سے بہتری مانگنے کا مشورہ دیا۔

❁......❁......❁

قمر النساء اور فخر النساء ماں باپ کی دو ہی بیٹیاں تھیں اور ماں باپ کی لاڈلی بھی بہت تھیں قمر النساء بڑی اور فخر النساء چھوٹی تھیں لیکن دونوں بہنوں میں اس قدر پیار محبت اور انڈر سٹینڈنگ تھی کہ انہیں کبھی کسی اور بہن بھائی کی ضرورت یا کمی محسوس نہیں ہوئی تھی دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتی اور چاہتی تھیں ماں باپ کے آنگن میں خوب عیش و آرام کی زندگی دیکھی لیکن جیسے ہی دونوں کی شادیاں ہوئیں دونوں کی قسمت کے دھارے بدل گئے۔ قمر النساء اپنے تایا کے گھر بیاہ کر گئی تھیں جو ان ہی کی طرح زمیندار تھے، البتہ فخر النساء ملک خاندان کی بہو بن گئیں دونوں بہنوں کو اولاد کی امید بندھی تو بڑے ارمانوں سے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ اگر دونوں میں کسی کے ہاں بھی بیٹی بیٹا پیدا ہوا تو وہ دونوں کا رشتہ پکا کر دیں گی لیکن جب قمر النساء کے ہاں صفیہ اور فخر النساء کے ہاں ساجدہ پیدا ہوئی تو دونوں بہنیں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں دونوں کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں پھر قمر النساء کے ہاں دوسری بیٹی کی ولادت ہوئی اور پیدا ہونے کے پانچویں دن ہی اسے اس کی پھوپھی نے مانگ لیا اور اس طرح ربیعہ اپنی پھوپھی کی امانت ٹھہری اور ایسے حالات میں فخر النساء کچھ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ ان کی گود بیٹے جیسی نعمت سے خالی تھی اگر یہ نعمت ان کے پاس ہوتی تو وہ کبھی بھی ربیعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتیں مگر پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مایوسی کا دامن نہ چھوڑا اور بڑی منتوں مرادوں کے بعد ان کے ہاں آژ میر پیدا ہوا آژ میر ساجدہ سے پانچ سال چھوٹا تھا قمر النساء کو بھی پانچ سال بعد بہن کی گود دوبارہ آباد ہونے پہ بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔

"قمری آپا اب تو آپ کے ہاں بیٹی پیدا ہونی چاہئے میرا بیٹا جوان ہو رہا ہے۔" فخر النساء نے اپنے ایک ماہ کے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا تو قمر النساء ہنس پڑیں۔

آژ میر سچ مچ سب کو بہت پیارا تھا اور اسی لاڈ پیار کا نتیجہ تھا کہ وہ کافی تنگ مزاج ثابت ہو رہا تھا اور سب کو اس کا یہ مزاج بھی بہت منفرد لگتا تھا سب کا خیال کہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے یہ سب اس کا حق ہے ایسا مزاج ایک فطری عمل تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اس کی اماں فخری اس کے لئے کیا کیا سوچے بیٹھی ہے ابھی وہ آٹھ سال کا تھا جب قمری خالہ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی یہ ان کی تیسری بیٹی تھی سبھی کو بیٹے کی آس تھی لیکن پھر بھی خادم حسین کی پیشانی پہ ناگواری کی کوئی لکیر نہ تھی بیٹی کی موہنی سی صورت دیکھی تو بے اختیار اس کا نام بھی تجویز کر ڈالا...... ماہ پیکر! نام بہت خوبصورت تھا لیکن ماحول سے میل نہیں کھاتا تھا۔

لیکن پھر بھی سب کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اس کا نام ماہ پیکر ہی رجسٹرڈ کروایا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ بچی کا نام آسان سا ہو گاؤں میں نام بگاڑنے کی عادت تو عام پائی جاتی ہے سو ماہ پیکر خادم سب کے بگاڑ کی وجہ سے پارو بن گئی اور اس کو پارو آژ میر نے ہی بنایا تھا کیونکہ جب بھی اس کی دلکش موہنی سی صورت دیکھ کر وہ قریب آتا وہ بدک کے دور ہو جاتی وہ اٹھانے کی کوشش کرتا تو ہاتھوں سے پھسل جاتی ایسے میں آژ میر کا غصہ بجا تھا کیونکہ ہمیشہ وہ خود لوگوں کی محبت اور توجہ کا مرکز ہوتا تھا اور اب اگر وہ اپنی خالہ زاد کو محبت اور توجہ دے رہا تھا تو وہ دور بھاگتی تھی اسے سال ڈیڑھ سال کی بچی سے چڑ ہونے لگی تھی اب وہ اسے صرف گھورنے پر اکتفا کرتا تھا اور پہلی بار اسی نے اس کا نام بگاڑ کر پارو کہا تھا اماں بیٹے کی خفگی پہ ہنستی تھیں۔

وہ میٹرک میں تھا جب اماں نے بتایا کہ اس کی شادی پارو سے ہی ہو گی اسے اس اطلاع پر خاصا گہرا دھچکا لگا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا اماں مجھے پارو سے شادی نہیں کرنی۔"

"ارے کیوں نہیں کرنی تیرے سے زیادہ سوہنی ہے۔"

"اماں سوہنی کو عمر بھر بیٹھ کر دیکھا نہیں جا سکتا ایک تو وہ مجھ سے چھوٹی ہے اور پھر اس کی حرکتیں تو پنگوڑے سے نظر آ رہی ہیں پورے کا پورا فتنہ ہے وہ۔" آژ میر ابھی چھوٹا تھا لیکن سمجھ بوجھ تھی اسی لئے اسے پارو کے کرتوت اچھی طرح معلوم تھے۔

"منہ سنبھال کر بات کر تیری اکلوتی ماسی کی بیٹی ہے وہ۔" اماں کو غصہ آ گیا۔

"میں بھی ماسی کا اکلوتا بھانجا ہوں ماسی کو بھی میرا خیال کرنا چاہئے اپنی ایسی پٹاخہ بیٹی میرے پلے باندھ کے میری زندگی تو خراب نہ کرے۔"

"خبردار آج ایسی بات کہی ہے، آئندہ کہی تو کبھی بخشوں گی نہیں۔" اماں ایک دم جلال میں آ گئی اور آژمیر جھنجھلاتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

"ہونہہ پارو سے شادی...... اسے پارو سے چڑ تھی کبھی بھولے سے جو اپنی اماں کے ساتھ ان کے گھر آ جاتی تو پھر آژمیر کی ہر چیز تہس نہس کر جاتی تھی ہر چیز کا تیا پانچا کر کے دیکھنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ آژمیر کو اب مزید بُری لگنے لگی تھی اس کا جی چاہتا تو دس سالہ پارو اکیلے میں ملے تو وہ اس کا گلا دبا دے مگر وہ اکیلی ملتی بھی تو چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی تھی۔

خادم حسین کو پارو سے اتنی محبت اور لگاؤ تھا کہ لاڈ پیار کر کر کے اسے کافی خود سر بنا دیا تھا اس کے مزاج میں ہٹ دھرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی باپ سے ضدیں منوانے میں ماہر تھی اور قمر النساء خادم حسین کو اس کا ہم نوا دیکھ دیکھ کر ہولتی رہتی تھیں۔ پارو باپ کے زور بازو پہ عیش کر رہی تھی لیکن اس کے یہ عیش بہت تھوڑے عرصے کے ثابت ہوئے دس سال کی عمر میں باپ کا ساتھ چھوٹ گیا تھا سب سے زیادہ باپ کی کمی پارو کو ہی محسوس ہوئی اتنے دن وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی لیکن رفتہ رفتہ سب نے اسے بہلا لیا بچپنا تھا اس لئے جلد بہل گئی اس کی ضدیں عروج پہ پہنچ چکی تھیں اکثر و بیشتر اماں اسے ٹوکنے کی کوشش کرتیں جس پہ وہ اور زیادہ ضد کرتی حالانکہ صفیہ اور ربیعہ بھی تو ان ہی کی بیٹیاں تھیں انہیں ان کی طرف سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی مگر پارو کے معاملے میں تو ان کا دل ہمیشہ دہلتا رہتا تھا۔ وہ اس کی ماں تھیں اور یقیناً اس کے بارے میں بہتر ہی جانتی تھیں لیکن پھر بھی فخر النساء کو اپنی ہونے والی بہو پہ بڑا ناز تھا وہ اس کی حرکتوں اور شرارتوں کو معصومیت کے کھاتے میں ڈالتی تھیں۔

اور انہیں اسکی یہ شرارتیں بہت پسند تھیں کیونکہ ان کو ایسی ہی زندہ دل بہو چاہیے تھی جو ان کے گھر کو رونقوں سے بھر دیتی مگر نجانے کیوں آژمیر حیات پارو کے لئے کہیں بھی کوئی نرم گوشہ نہیں پا رہا تھا وہ اکثر اپنی خالہ سے کترایا کترایا رہتا تھا کبھی ان کے گھر بھی نہیں گیا تھا مگر آج کل ربیعہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس لئے اماں بار ہا اسے ساتھ چلنے کی تاکید کر رہی تھیں مجبوراً سب کے ساتھ اسے بھی مہندی کے روز ہی آنا پڑا تھا۔

"پارو تیری ماسی دا پتر تے بڑا سوہنا اے۔" تاجی نے کسی اور ہی رنگ میں کہا تھا اپنے بالوں کی چوٹی لہراتی پارو نے تاجی کی نظروں اور بات کے تعاقب میں دیکھا وہ کسی رشتہ دار سے باتوں میں مصروف تھا۔ حال ہی میں وہ شہر سے کوئی ڈگری لے کر آیا تھا اور سننے میں آیا تھا

کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ یا امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"میری اماں کہہ رہی تھی پارو بیاہ کر اپنی ماسی کے گھر ہی جائے گی......" شنو نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا اور پارو جیسے اچھل پڑی۔

"اری سچ کہہ رہی ہوں میری اماں کو خود تیری اماں نے بتایا تھا۔" شنو پرسکون تھی پارو نے ایک بار پھر آژمیر کو دیکھا اب کے دھڑکن کی لے بدلی ہوئی تھی۔

"کیوں؟" "ہو گئی نا لٹو؟" شنو اور تاجی نے ایک ساتھ اسے چھیڑا۔

"ارے لٹو ہوتی ہے میری جوتی ہونہہ میں کسی کو کیا جانوں؟" وہ بدتمیزی سے کہتی ہوئی صحن کے دوسرے حصے کی سمت مڑ گئی اور ملک آژمیر حیات نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اس کی کمر پہ موٹی سی چوٹی جھول رہی تھی چوٹی کے ہر بل میں تفاخر جھلک رہا تھا اور اس کا جی چاہا اس کا یہ فخر و غرور یہ اکڑ چکنا چور کر کے رکھ دے۔

مہندی اور پھر شادی کے فنکشن میں بھی وہ بس اندر ہی اندر کھولتا رہا تھا پارو کی شکل جہاں بھی نظر آتی نفرت سے رخ موڑ لیتا تھا اور پارو جو اپنی سہیلیوں سے بچنے کے لئے اتنی کوفت بے زاری اور نفرت کا مظاہرہ کر کے آ گئی تھی اپنے دل کی دھڑکنوں پہ قابو ہی نہ پا رہی تھی وہ مہندی اور شادی کی تمام رسموں میں چوری چوری اسے دیکھتی رہی لیکن وہ کچھ زیادہ ہی روکھا پھیکا محسوس ہو رہا تھا۔ پارو جیسی نٹ کھٹ لڑکی کو چاہت کے مدہوش جذبے نے چھوا تو وہ چند دنوں میں ہی نکھرتی چلی گئی تھی...... اس کی شرارتوں میں اب شوخیاں بھی سما گئی تھیں ان ہی دِنوں معلوم ہوا کہ آژمیر انگلینڈ جا رہا ہے اسے یونیورسٹی کی طرف سے سکالرشپ مل گیا تھا۔

پارو تھوڑی اداس ہوئی لیکن جب خالہ نے آ کر باقاعدہ منگنی کی رسم کرنے کا اظہار کیا تو پارو کی یہ اداسی کچھ دیر کے لئے رفع ہو گئی تھی قمر النساء کو اپنی چھوٹی بہن پہ حیرت ہوئی جو ان کی اتنی بد دماغ بیٹی کو خوشی خوشی بہو بنانا چاہ رہی تھی۔

"قمری آپا کیوں جھلی ہو گئی ہے پارو تو میری خواہشوں کا آئینہ ہے مجھے ایسی ہی بیٹی کی ضرورت ہے اب ساجدہ کو دیکھو چپ چاپ بڑی ہوئی چار جماعتیں پڑھیں اور اپنے گھربار کی ہو گئی نہ گھر میں موجودگی کا پتہ چلا نہ گھر سے غیر موجودگی کی خبر ہوئی پر دیکھنا جب پارو تیرے گھر سے رخصت ہو گی تو تجھے بڑا احساس ہو گا کہ پارو چلی گئی ہے۔" انہوں نے بہن کو تسلی دلاسہ دیا اور پھر منگنی کی تیاری شروع کی گئی آژمیر کے جانے سے دو روز قبل پارو کو منگنی کی انگوٹھی

پہنائی گئی اس کی سکھی سہیلیوں نے اسے خوب خوب تنگ کیا اور وہ کھلکھلاتی ہوئی ہر طرف رنگ بکھیرتی رہی اس کے دل میں نئے جذبوں نے جنم لیا تو ہر سو خوشبو کا بسیرا ہو گیا تھا اس کے کورے کاغذ سے دل پہ صرف اور صرف آژمیر کا نام لکھا تھا اور وہ اس میں خوش تھی۔

منگنی کی وجہ سے آژمیر کی گھر والوں سے خاصی بدمزگی ہو چکی تھی۔

اور اسی بدمزگی میں ہی وہ گھر سے رخصت ہوا تھا پارو کے خلاف اس کے دل میں شعلے لپکتے تھے لیکن اماں نے اس کے انکار کے باوجود زبردستی اس کی منگنی کر کے ہی دم لیا تھا لیکن اس کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے بدظن ہو چکا تھا اسے احساس ہونے لگا کہ اماں کو صرف اور صرف بہن اور بھانجی کی پرواہ ہے میری زندگی اور میری خوشیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

رینا اس کی کلاس فیلو تھی بنیادی طور پر وہ پاکستانی ہی تھی البتہ اپنے طور اطوار سے وہ کہیں سے بھی پاکستانی نہیں لگتی تھی لیکن اس کے باوجود آژمیر کو اس کی ایک بات اچھی لگی کہ وہ زیادہ فرینک نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی شارٹ ڈریس پہنتی تھی ہمیشہ جینز شرٹ میں رہتی تھی اسے لڑکے لڑکیوں کی بے تکلفی اور دوستی کے نام پہ "بے حیائی" بھی ناپسند تھی اسی لئے اسے سنجیدہ سنجیدہ آژمیر حیات سب سے مختلف نظر آیا اور ایک پاکیزہ دوستی کا آغاز کیا جب دونوں کو اپنے جذبوں کی شدت کا احساس ہوا تو دونوں نے بہت اعتماد اور سکون سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

آژمیر پہلے ہی گاؤں کی گنوار اور جاہل پارو سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا سو بہت آسانی سے رینا کو اپنی زندگی کا شریکِ سفر بنا لیا تھا ایک سال دوستی میں اور دوسرا سال میاں بیوی کے رشتے میں بندھ کے گزارا تو دونوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا مشکل ہو گیا تھا دو سال بعد جب وہ واپس پاکستان لوٹا تو رینا اس کے ساتھ تھی لیکن رینا کا وجود اماں پہ کسی بم کی طرح پھٹا تھا انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹے سے ملنے کی بجائے سر تھام کر قدم واپس موڑ لئے تھے۔"

"اماں میری بات تو سنو....." آژمیر یکدم آگے بڑھا مگر اماں اس کے بڑھنے سے پہلے ہی چکرا کر گری تھیں ملک ضمیر حیات (آژمیر کے والد) بھی اس دفعہ چپ نہیں رہ سکے تھے۔

"چلے جاؤ یہاں سے مر گئے تم ہمارے لئے۔" انہوں نے ہمیشہ آژمیر کو ماں سے الجھے دیکھا تھا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ بس کچھ دیر کے لئے ماں کو ستا رہا ہے لیکن وہ ماں کو ستانے کے لئے اس حد تک چلا جائے گا انہیں امید نہیں تھی اور جب وہ حد پار کر گیا تو ان کا مشتعل ہونا

لازمی امر تھا......

رینا حیرت سے اس سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام کا وقت تھا اس لئے آژمیر اسے لے کر کہاں جا سکتا تھا واپسی کے لئے گھر سے نکلا تو چچا قدیر سے سامنا ہوا۔

ان کا گھر ملک ضمیر حیات کے پڑوس میں ہی تھا بائیں دیوار دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار تھی چچا قدیر اسے اور رینا کو ساتھ ہی لے آئے تھے چچا قدیر کی بڑی بیٹی ماہین شروع سے ہی آژمیر کو بہت پسند کرتی تھی لیکن اپنی تائی کی زبان پہ ہمیشہ پارو کا ورد دیکھ کر ماہین کا خون جل کر رہ جاتا تھا لیکن آج جب پارو کی جگہ کسی اور کو دیکھا تو ماہین کو قدرے تسلی ہوئی تھی ایک دم دل پہ پھوار سی برسی......انہوں نے رینا کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ چچا قدیر کی فیملی کو اپنا ہم نوا دیکھ کر آژمیر کو تھوڑا حوصلہ ہو گیا تھا اس کے خیال میں وہ اماں ابا کو سمجھانے اور راضی کرنے میں اس کی مدد کر سکتے تھے وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھا اور رینا اپنی سوچوں میں......

"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ آپ کی انگیج منٹ ہو چکی ہے......" تنہائی ملتے ہی وہ بولی۔

"میں اس انگیج منٹ کو نہیں مانتا کیونکہ اس رشتے میں میری مرضی یا پھر میری پسند ایک پرسنٹ بھی شامل نہیں تھی اور نہ ہی اب ہے میں نے اگر کسی کو پسند کیا ہے تو وہ صرف تم ہو اسی لئے شادی بھی کر چکا ہوں اگر اماں ابا نہیں مانتے تو میں شہر جا کر فلیٹ لے لوں گا مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔" آژمیر حیات بھی ان ہی کی اولاد تھا اپنی مرضی چلانے والا۔

"لیکن آپ کو کم از کم اس رشتے کا ذکر تو کرنا چاہئے تھا میں کیوں خوامخواہ کسی کی قسمت کے آڑے آ گئی۔"

رینا کو افسوس ہو رہا تھا مگر آژمیر نے اسے زیادہ دیر اس کیفیت میں نہیں رہنے دیا تھا بہت جلد وہ آژمیر کو اپنی قسمت ماننے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن اماں ابا نے اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مجبوراً آژمیر رینا کو لے کر شہر چلا گیا تھا جہاں وہ اپنی تنہا اور الگ دنیا بسانے میں مصروف ہو چکا تھا اور اس دنیا سے کچھ دور پارو کی دنیا ساکت رہ گئی۔

"آژمیر شادی کر کے بیوی کے ساتھ واپس آیا ہے۔" یہ اطلاع اس کے ہنستے کھیلتے دل پہ تیزاب کی مانند گری تھی اس کے خواب اس کے خیال اس کی خواہشیں اس کے ارمان سب جل گئے پہلی پہلی محبت اور مہکے مہکے خواب اتنی جلدی بے وقعت ہوں گے اسے اندازہ نہیں تھا

اماں بھی اس خبر سے ڈھے سی گئی تھیں کیونکہ آج کل وہ صفیہ آپا کی طرف سے بھی پریشان تھیں صفیہ شادی کے اتنے برس بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھیں اور ان کے سسرال والے آج کل بچوں کے لئے کچھ زیادہ ہی بے قراری ظاہر کر رہے تھے پہلے تو ان کا شوہر ان کے ساتھ تھا مگر اب وہ بھی بچوں کی خواہش ظاہر کرنے لگا تھا۔

جس پہ صفیہ آپا پریشان ہونے لگی تھیں اور ان کی پریشانی اماں کا بھی دامن پکڑ چکی تھی ایک تو جوانی میں ہی بیوگی کا روگ لگ گیا اوپر سے تین تین بیٹیوں کا بوجھ...... دو بیٹیوں کے فرض سے تو وہ فارغ ہو چکی تھیں تیسری کا مسئلہ ابھی باقی تھا اور تیسری کے لئے ان کے دل میں تھوڑا اطمینان بھی رہتا تھا مگر آج وہ اطمینان بھی رخصت ہو چکا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟ پارو کا کیا بنے گا؟'' اماں کی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے خدشے ناچنے لگے پارو خود بھی اس دھچکے کا شکار ہوئی تھی لیکن نجانے کیوں وہ اپنا روگ اماں کو نہیں لگانا چاہتی تھی۔

''دیکھ اماں مجھے تو وہ شروع سے ہی چنگا نہیں لگتا تھا اپنے آپ کو بڑا طرم خان سمجھتا ہے میں بھی کسی سے کم نہیں میری طرف سے بھاڑ میں جائے میرے لئے کوئی کمی ہے رشتوں کی، ایک اشارہ کروں تو لائن لگ جائے۔'' اس نے اماں کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ اپنے اندیشوں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں ایسی ہی کچھ کیفیت پارو کی بھی تھی، مگر وہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی کہ آژمیر حیات اس کے لئے کیا اہمیت رکھتا تھا اگر ظاہر کرتی تو الٹا سہیلیاں اس کا مذاق اڑاتیں اور وہ اپنی محبت کا اپنے جذبوں کا مذاق نہیں بنوانا چاہتی تھی۔

اسی لئے اپنے اس زخم کو وہ بے نیازی اور لاپروائی کے مرہم سے ڈھک رہی تھی حالانکہ اس پہ جو قیامت گزر چکی تھی اس کے بعد ایسا حوصلہ اور ہمت رکھنا کافی حیران کن عمل تھا پارو کی سہیلیوں کو پتہ چلا تو انہیں بھی افسوس ہوا تھا مگر پارو نے خود پہ کوئی افسردگی طاری نہیں ہونے دی تھی انتہائی جذباتی، منہ پھٹ اور بدتمیز پارو سے ایسے رویے کی امید رکھنا اپنی امیدوں پہ پانی پھیرنے کے برابر تھا لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ ہی نظر آ رہا تھا پارو سہیلیوں کی باتوں اور اماں کی پریشانی کی وجہ سے لاپروائی کا چولا پہن چکی تھی اسے آژمیر سے کوئی مطلب نہیں تھا لیکن در حقیقت دل رو رہا تھا۔

صفیہ کی طلاق قمر النساء کو بستر سے لگا گئی اور قمر النساء کا دکھ فخر النساء کو کھائے جا رہا تھا وہ بہن کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھیں پہلے پارو کی طرف سے دکھ ملا اب صفیہ کی طرف سے تو عمر بھر کا داغ لگ گیا تھا قمر النساء کی ساری توانائی رخصت ہو گئی وہ دنوں میں مزید بوڑھی ہو گئی تھیں...... انہی دنوں ساجدہ آپا اور آژمیر کا ٹکراؤ ہو گیا تھا اور آژمیر سے ہی پتہ چلا کہ رینا امید سے ہے یہ خبر اماں کو ملی تو پہلو بدل کر رہ گئیں اور ان کی بے چینی ملک ضمیر حیات سے چھپی نہ رہ سکی۔

''نیک بخت اتنی پریشان کیوں ہو؟'' انہوں نے اپنی پگ اتار کر چارپائی پہ رکھی اور اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے گھروالی سے مخاطب ہوئے۔

''ابھی بھی پوچھتے ہو ملک جی کہ پریشان کیوں ہو؟'' ان کا لہجہ بھرا گیا تو ملک جی لمحہ بھر کے لئے چپ سے ہو گئے۔

''دیکھ فخری بیگم تیری بہن بھی صرف ایک ہے اور ہمارا پتر بھی صرف ایک تیری بہن سمجھدار ہے اولاد کی منہ زوریاں سمجھتی ہے لیکن ہمارا پتر نا سمجھ ہے ماں باپ کی مجبوریاں نہیں سمجھ سکتا اس لئے ایک کو سمجھا اور ایک کو خود سمجھ......'' ملک ضمیر حیات کی بات پہ وہ خود نا سمجھی سے دیکھنے لگی تھیں۔

''ارے میری جھلی ملکانی عقل سے کام لے اپنے پتر کی خوشی میں خوش ہونا سیکھ اپنے پوتے پوتی کے لئے دعا کر ہو سکتا ہے رب پارو کے نصیب اور اچھے کر دے اور بہن کو سمجھا کہ اولاد کسی کے بھی اختیار میں نہیں ہوتی اولاد اڑیل گھوڑی کی طرح ہوتی ہے کبھی قابو آ جاتی ہے کبھی بے قابو ہو جاتی ہے اور ہماری اولاد بھی بے قابو ہو گئی ہے لیکن بے قابو اولاد ہو یا گھوڑی اسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا نا؟'' انہوں نے رفتہ رفتہ بیوی کو کچھ قائل کر ہی لیا تھا اور پھر اماں ابا کے ساتھ رینا کی ڈلیوری سے ایک روز قبل ان سے ملنے شہر آ گئی تھی۔

''آنٹی آپ؟'' فلیٹ کا دروازہ رینا نے ہی کھولا تھا۔ آژمیر گھر پہ نہیں تھا اس نے کافی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اماں بھی اس کے خلاف دل میں موجود تمام کدورتیں دھو کر آئی تھیں کافی دیر بعد آژمیر گھر میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔

''اتنی دیر لگا دی آپ نے، انکل اور آنٹی کب سے آئے بیٹھے ہیں۔'' رینا اٹھ کر اس کے قریب گئی وہ رینا اور اماں ابا کے اچھے تعلقات کی جھلک ان کے چہروں سے دیکھ چکا تھا اسی لئے آگے بڑھ کر اس نے بھی ماں کے قدم تھام لئے۔

''اماں مجھ سے جو بھی غلطی ہوئی ہے مجھے معاف کر دیں میں رینا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس نے پردیس میں میرا اتنا ساتھ دیا میرا خیال رکھا اپنے دیس آ کر میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پارو سے منگنی آپ کی اپنی جلد بازی تھی میں نے آپ کو روکا تھا کہ ایسا مت کریں۔ وہ بھی ماں کو دکھ دے کر خوش نہیں تھا اسے بھی ندامت ہوتی تھی مگر اب ساری ندامت ڈھل چکی تھی۔

❂......❂......❂

''آژمیر آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہے۔'' رینا ہسپتال جانے سے پہلے اس کے قریب آ گئی تھی۔

''جب سے تم ملی ہو تب سے وعدے ہی تو کر رہا ہوں۔'' وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔

''جو میں کہہ رہی ہوں وہ بتائیں۔'' رینا بضد تھی۔

''او کے بابا کہو کیسا وعدہ لینا ہے۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ آئندہ کبھی انکل اور آنٹی کا دل نہیں دکھائیں گے اور کبھی ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں کریں گے آپ ان کے اکلوتے بیٹے ہیں ان کے بہت سے ارمان آپ کی ذات سے جڑے ہیں اگر آپ ان کے ارمانوں کو جھٹکتے ہیں تو ان کا دل بجھ جاتا ہے پلیز مجھ سے وعدہ کریں جو وہ کہیں گے آپ وہی کریں گے۔''

رینا نے اس سے وعدہ لیا تھا وہ آج تو وہ اپنے آنے والے بچے کے لئے اتنا خوش تھا کہ رینا اس سے دنیا چھوڑنے کا وعدہ لیتی تو وہ فوراً یہ وعدہ بھی کر لیتا اسے اپنے بچے کی آمد کا بڑی بے چینی اور شدت سے انتظار تھا اماں ابا بھی ساتھ ہی ہسپتال گئے دن بھر کی ٹریٹ منٹ کے بعد رینا کو شام کے وقت لیبر روم لے جایا گیا تھا اور پھر آژمیر کے انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں۔ اماں جائے نماز بچھا کر مسلسل دعائیں کر رہی تھیں ابا بھی پریشان تھے تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ کیس میں کافی پیچیدگیاں ہیں دونوں میں سے کسی ایک کی جان بچائی جا سکتی تھی آژمیر کے لئے دونوں ہی اہم تھے وہ دونوں کی زندگی چاہتا تھا لیکن دل پہ پتھر رکھ کے صرف ایک کا نام لینا بہت دشوار مرحلہ تھا پھر بھی اس نے رینا کا نام لیا تھا مگر رب کو کچھ اور منظور تھا مردہ بچے کو جنم دینے والی رینا خود بھی ڈلیوری کے بعد صرف ایک گھنٹہ جی سکی تھی اور آژمیر خالی ہاتھ کھڑا دھواں دھواں نظروں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے سامنے پڑے مردہ

وجود اس کی زندگی کا حصہ تھے اور اس کی زندگی سے کٹ گئے ہیں زندگی کے حصے کٹ جائیں تو انسان یونہی بے حس و حرکت ہو جاتا ہے وہ بھی بے حس ہو چکا تھا اماں ابا اس دکھ پہ بہت روئے تھے لیکن وہ تو رونے کے قابل بھی نہیں تھا۔ آژمیر کا سنبھلنا بے حد مشکل ہو چکا تھا اس کے دل میں خلا بن چکا تھا۔

❂......❂......❂

رینا کی موت کا سن کر صفیہ اور ربیعہ دونوں بہنیں اظہار تعزیت کے لئے آئی تھیں اماں ان دونوں سے شرمندہ بھی تھیں اور بیٹے کے دکھ پہ دکھی بھی ہو رہی تھیں۔

''خالہ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں اگر پارو کا نصیب آپ کے آنگن سے وابستہ نہیں تھا تو اس میں آپ کا یا پھر کسی اور کا کیا قصور آپ سمجھدار اور با حوصلہ ہیں آپ اپنے آپ کو سنبھالیں اور آژمیر کو بھی تسلی دیں اس وقت اسے آپ کی تسلی اور محبت کی ضرورت ہے۔''

ربیعہ نے کافی متانت اور بردباری سے اپنی خالہ کو سمجھایا تھا۔

''پر میں قمری آپا کو کیا منہ دکھاؤں گی اور جس کے لئے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا وہ بھی نہیں رہی اور ساتھ ہی اولاد جیسا دکھ بھی دے گئی کیسی قسمت تھی بدنصیب کی......'' انہیں سچ مچ رینا اور بچے کی موت کا بہت دکھ پہنچا تھا۔

''یہ بھی اللہ کے فیصلے ہیں خالہ حوصلہ رکھو رب بہتر کرے گا اور اماں کی فکر نہ کرو وہ بھی سنبھل جائے گی اس پہاڑ سی زندگی میں اتنے اتنے دکھ دیکھے ہیں ایک اور سہی۔ صفیہ کی مسلسل خاموشی کے باعث ربیعہ کو ہی بولنا پڑ رہا تھا۔ ربیعہ پھوپھی زاد سے بیاہی گئی تھیں اور اس وقت دو سالہ بیٹے کی ماں تھیں اس کی طرف سے قمر النساء کا دل پر سکون تھا کافی دیر وہ لوگ بیٹھی رہیں آژمیر سے بھی سرسری سا سامنا ہوا وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

❂......❂......❂

رینا کی موت کے ایک سال بعد اماں ابا نے باہمی مشورے کے بعد ایک ارادہ کیا تھا اور ان کا ارادہ جب آژمیر کی سماعتوں تک پہنچا تو وہ پورے ایک سال بعد کسی آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑا تھا۔

''پھر وہی پارو؟ اماں یہ پارو میری زندگی کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہی؟ یہ پارو مر کیوں نہیں جاتی؟ رینا کی جگہ یہ کیوں نہیں مری آسیب کی طرح چمٹ گئی ہے۔ میری ذات کو،

اس کی وجہ سے آپ نے رینا کو ٹھکرا دیا گھر سے نکال دیا اسے، اسی کی وجہ سے آپ نے میری خوشیاں قبول نہیں کیں اسی کی وجہ سے آپ کو اپنے سگے بیٹے کی پروا نہیں رہی کاش میں اس پارو کا قتل کرسکوں۔''

آژمیر کا بس چلتا تو پارو کو کسی بم سے اڑا دیتا وہ پارو کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا اسے پارو کی ذات سے نفرت اور زیادہ ہوگئی تھی اس کا نام ہی اسے شعلوں پہ گرانے کے لئے کافی تھا۔اماں ابا اس کا اس قدر شدید ردعمل دیکھ کر اس بار خوش نہیں ہوئے تھے انہوں نے اسے کہہ دیا تھا اس بار حتمی فیصلہ کرلے، والدین عزیز ہیں تو ان کی بات ماننی ہوگی ورنہ...... اور وہ اس بار تمام ہتھیار ڈالنے پہ مجبور ہوگیا تھا۔

''پارو ایک بار اس گھر میں آجاؤ بڑے حساب نکلتے ہیں تمہاری طرف، تم نے میری زندگی اجیرن کی ہے میرے والدین کو بھی میرا نہیں رکھا میں تمہارا پھر بھی نہیں ہوں گا۔''

اس نے پارو کے خلاف اپنے دل میں ایک نفرت کا جہان آباد کرتے ہوئے اپنی رضا مندی اماں ابا کے حوالے کردی اور اماں کے تو سمجھو قدم ہی زمین پہ نہ پڑ رہے تھے انہوں نے آژمیر کو ہزاروں دعائیں دے ڈالیں اس کے ماتھے پہ پیار بھی کیا اور وہ خاموش سرد مہری سے بس اماں کا چہرہ دیکھتا رہا اس کی خوشی میں وہ لوگ خوش نہیں ہوئے تھے اب ان لوگوں کی خوشی میں وہ خوش نہیں تھا اس کے تمام احساسات سپاٹ ہوچکے تھے اس کے دل میں اب سرد لہو گردش کرتا تھا۔البتہ نفرت کے احساس سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا۔

❁......❁......❁

''میری طرف سے انکار ہے......'' پارو نے اماں اور ماسی کے سامنے دو ٹوک اور صاف صاف انکار کردیا تھا۔

''پارو زبان بند رکھو اپنی۔'' اماں کو غصہ آیا اس کی منہ پھٹ زبان سے پہلے ہی وہ ڈرتی تھیں آج وہ ماسی کے سامنے کو بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بول پڑی تھی مزید نجانے کیا گل افشانی کرتی۔

''اماں میری زبان بند ہے، کھلوانے کی کوشش نہ کر، مجھے تیری بہن کے گھر بیاہ نہیں کرنا تو نہیں کرنا بس میں نے کہہ دیا۔'' پارو کو پاس ہی بیٹھی خالہ فخرالنساء کی کوئی پروا نہیں تھی۔

خالہ چپ ہوگئیں انہیں پتہ تھا ایک بار رشتہ توڑ کر دوبارہ جوڑنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔مگر وہ کسی بھی حال میں اپنی بہن سے رشتہ جوڑنا چاہتی تھیں انہوں نے بڑی بہن سے ہاتھ

جوڑ کر معافی بھی مانگی پھر ملک ضمیر حیات بھی بیٹے کی وجہ سے شرمندہ ہو رہے تھے ایسے میں قمر النساء سے نظرانداز کرنا مشکل ہوگیا تھا اور اماں کو نرم پڑتے دیکھ کر پارو ضد کر بیٹھی اس نے انکار کردیا تھا......

''قمری آپا ہم پرسوں پھر آئیں گے آپ آرام سے صلاح مشورہ کرلیں۔'' وہ جاتے جاتے ان کو کچھ اور وقت دے گئیں تاکہ وہ پارو کو سمجھا سکیں لیکن پارو تو کسی کو پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دے رہی تھی۔

''آخر تو چاہتی کیا ہے؟'' اماں کو پارو پہ تاؤ آرہا تھا۔

''بس میں اس سے بیاہ نہیں کرنا چاہتی اماں میرا بیاہ جس سے چاہے کردے پر اپنی بہن کے بیٹے کا نام نہ لے میرا دل جل جاتا ہے اس کے نام سے۔''

پارو نخوت اور نفرت سے کہتی باہر چلی گئی اور اماں کے لئے اور زیادہ پریشانی چھوڑ گئی تھی پھر صفیہ آپا نے انہیں تسلی دی اور اسے پیار سے سمجھانے کا مشورہ دیا تھا مگر پارو کو ملک آژمیر حیات سے اس قدر نفرت اور بےزاری ہوچکی تھی کہ وہ نہ پیار سے سمجھ رہی تھی نہ ڈانٹ سے......ایسے میں اماں کے سر میں نجانے کیسا درد اٹھا کہ شہر کے ہسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا صفیہ اور ربیعہ تو پریشان تھیں ہی پارو کا بھی بُرا حال ہوچکا تھا ان بہنوں کا واحد سہارا صرف اماں ہی تو تھیں اور ان ہی کے دم سے آج وہ ایک چھت تلے بیٹھی تھیں۔

قمرالنساء نے ہوش میں آنے کے بعد بھی پارو سے مان جانے کی التجا کی تھی اور پارو نے چھم چھم نیر بہاتے ہوئے سراثبات میں ہلا دیا ورنہ ابھی تک اپنے ٹھکرائے جانے کا زخم پارو کے دل کو بُری طرح تڑپا رہا تھا اس کا جی چاہتا جس طرح ملک آژمیر نے اس کی محبت اس کے معصوم جذبات اور اس کی ذات کو ٹھکرایا تھا اسی طرح وہ بھی اسے ٹھکرا سکتی بلکہ ایک بار نہیں کئی بار ٹھکراتی تب بھی اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوتا مگر اماں کی تکلیف کے آگے ہار گئی اس نے اماں کی خاطر ملک آژمیر کی یہ گستاخی درگزر کر ڈالی لیکن اس کے اندر جو اُبال اٹھتے تھے وہ اماں کو بخوبی نظر آتے تھے انہیں معلوم تھا کہ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے اسی لئے رخصتی سے قبل انہوں نے اپنے ہاتھ جوڑ کے اسے اپنی عزت اور تربیت کی لاج رکھنے کا واسطہ دیا تھا اور وہ جو کبھی بھی کسی بھی چیز کے آگے جھکتی نہیں تھی نہ ہی موم ہوتی تھی۔اور نہ ہی کبھی اس پہ کسی چیز کا اثر ہوسکتا تھا وہی ماں کے جڑے ہوئے اور بےبسی سے بہتے آنسو دیکھ کر جھک گئی تھی موم ہوگئی اس پہ ماں کے دکھوں کا اثر

ہوگیا تھا اسے ماں کی تکلیف اور پریشانی کا احساس ہوگیا تھا اس نے اپنے دل سے عہد کرلیا کہ اب کبھی اماں کو تنگ نہیں کرے گی چاہے کچھ بھی ہو اور اس عہد کو نبھانے کے لئے ابھی اسے کچھ وقت کی ضرورت تھی ابھی اسے صبر وضبط کے آداب سیکھنے کے مراحل سے گزرنا تھا۔اس کے اندر پہلے جیسے جوش اور غصے کے ابال اٹھتے تھے مگر وہ برداشت کررہی تھی یعنی برداشت کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا کیونکہ کل رات سے لے کر اب تک وہ آژمیر کے کچھ ڈھکے چھپے اور کچھ عیاں ہوتے نشتر کافی حد تک خاموشی سے سہہ چکی تھی اور آئندہ بھی وہ اپنے عہد پہ عمل پیرا ہونا چاہتی تھی اس نے سب کو ستانے کا ارادہ ترک کردیا تھا......اب شاید وہ صرف اور صرف اپنے آپ کو ستانا چاہتی تھی اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی۔

❁......❁......❁

آج وہ شادی کے دو دن بعد پہلی بار میکے جارہی تھی اس کے ساتھ فروٹ، مٹھائیاں اور میوہ جات کے ٹوکرے بھیجے جارہے تھے۔

آژمیر صبح سویرے ہی شہر جانے کے لئے نکل چکا تھا اس نے شہر میں ایک دوست کے ساتھ مل کر پارٹنرشپ کے طور پہ بزنس شروع کررکھا تھا نیا نیا کام جمایا تھا اس لئے زیادہ توجہ کا حامل تھا فخر النساء نے روکنے کا ارادہ کیا پھر رک گئیں کہ جاتا ہے تو جائے شام تک آجائے گا اور انہوں نے شام تک آنے کی تاکید بھی کی تھی لیکن پارو کو پتہ تھا کہ وہ نہیں آئے گا شام کو جب ربیعہ اپنے شوہر کے ساتھ اسے لینے کے لئے آئی وہ اس وقت بھی نہیں آیا تھا اور پارو چلی بھی گئی تب بھی اس کی آمد کا کوئی آثار نہیں تھا اور پارو آج ایک نئے عمل سے گزر رہی تھی یعنی دکھاوے اور چھپانے کے عمل سے اس نے آج تک کچھ نہیں چھپایا تھا سوائے آژمیر کی محبت کے جو وہ اس سے کرتی تھی اور آج بھی وہ سب کچھ بتا رہی تھی سوائے آژمیر کی نفرت کے جو وہ اس سے کرتا تھا اس نے سہیلیوں کے سامنے دکھاوا کیا اماں اور بہنوں سے سب کچھ چھپایا تا کہ وہ لوگ اس کی طرف سے پریشان نہ ہوتیں۔البتہ خود اس نے تنہائی ملتے ہی خوب دل کھول کر آنسو بہائے تھے اور اپنے دل کا غبار نکالا تھا۔

❁......❁......❁

پارو کو واپس سسرال آئے ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا لیکن آژمیر ابھی تک نہیں لوٹا تھا ملک ضمیر حیات دوبار اسے فون کرچکے تھے لیکن وہ جواباً یہی کہتا کہ کام نیا نیا ہے توجہ مانگتا ہے اور وہ

ہمیشہ اس جواب پہ جھنجھلا جاتے کہ بیوی بھی نئی نئی ہے توجہ مانگتی ہے کچھ اس کا ہی خیال کرلو جس پہ وہ جلد آنے کا وعدہ کرکے فون بند کردیتا تھا لیکن اماں کو بیٹے کی فطرت کا اندازہ تھا انہیں احساس تھا کہ وہ انہیں...... گجھی مار (اندرونی مار، سزا) دینا چاہتا ہے اور یہ سارے بہانے صرف پارو کے لئے بنا رہا ہے حالانکہ پارو کو اس کے ہونے اور نہ ہونے کی کوئی پروا نہیں تھی وہ ان آٹھ دن دنوں میں اپنے لئے مصروفیت ڈھونڈ چکی تھی۔

میکے میں تو اس کا مشغلہ تھا دیواروں اور درختوں پہ چڑھنا بچوں کے ساتھ کھیلنا اور سہیلیوں کے ساتھ شرارتیں کرنا دن بھر اماں کو چھیڑنا اور پھر صلواتیں سننا البتہ یہ سارے کام وہ یہاں نہیں کرسکتی تھی اس لئے خالہ اماں کے کئی کام اپنے ذمے لے لئے تھے۔جن میں مصروف ہوکر وہ کافی مطمئن اور پرسکون بھی تھی اس وقت بھی وہ پورا صحن جھاڑو سے صاف کرکے مرغیوں کا ڈربا کھولے ان کو دانہ ڈال رہی تھی جب برابر والے گھر کی دیوار سے ماہین کا چہرہ نمودار ہوا لیکن پارو مرغیوں کی چہل قدمی اور دانہ چگنے کا منظر دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ دیکھ نہ سکی۔

”لگتا ہے آژمیر کچھ زیادہ ہی گہری سوچیں سونپ گیا ہے؟“ ماہین کا لہجہ کافی خوشگوار تھا لیکن اس خوشگواریت کے پیچھے کانٹوں کی چبھن پل بھر میں اسے اپنا آپ باور کرواگئی تھی۔

”جتنی سوچیں مجھے سونپ کر گیا ہے اتنی ہی میں نے بھی اس کے ساتھ بھیجی ہیں میں تو رات کو سوجاتی ہوں وہ تو سوتا بھی نہیں۔“ پارو نے مٹھی سے سارا باجرا مرغیوں کے آگے گراتے ہوئے ہاتھ جھاڑا اور پوری کی پوری ماہین کی سمت گھوم گئی۔

”اگر رات کو سوتا ہی نہیں تو پھر تمہارے پاس ہی آجائے نا؟“ ماہین کے لہجے میں طنز وافر تھا۔وہ ہلکے سے مسکرائی اور ماہین کا دل سلگ گیا۔

”وہ تو آتا ہے میں نے ہی منع کیا تھا اصل میں باجی جدائی میں بڑا مزہ ہے پیار بڑھتا ہے۔“ پارو بھی اس کی رگ جان چکی تھی ماہین کا رنگ نیلا پیلا ہونے لگا تھا۔

”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ شہر میں رینا کی یادیں تازہ کرنے کے لئے رہتا ہے۔“

”یادیں بھی تو ان ہی کی تازہ کی جاتی ہیں جو مردہ ہوجاتے ہیں اور مردہ چیزوں سے مجھے کیا مطلب اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے میں تو زندہ ہوں......“ پارو آخر پارو تھی۔

ماہین کو دیوار سے اترتے ہی بنی لیکن بعد میں اس کا دل سچ مچ بجھ کررہ گیا تھا وہ آژمیر کا رویہ تو برداشت کرسکتی تھی مگر لوگ...... جو طنزیہ نظروں سے دیکھتے اور نوک دار باتیں کرتے تھے وہ

برداشت کرنا ذرا مشکل ہو جاتا تھا۔

''پارو کیوں کھڑی ہے پتر؟'' اماں رسوئی (کچن) سے نکلیں تو اتنی دیر سے اسے یونہی چپ چاپ کھڑے دیکھ کر تشویش سے پوچھ بیٹھیں۔

''کچھ نہیں بس وہ ماہین باجی کھڑی تھیں اس لئے میں بھی رک گئی۔'' اس نے سر جھٹک کر اپنی سوچوں کو بھی جھٹک دیا تھا۔

''اماں ایک بات کہوں؟'' پارو نے بھی کبھی بات کرنے سے پہلے کسی سے اجازت لینا تھی حیرت کا مقام تھا۔

''ارے پتر لکھ واری آکھ۔'' خالص پنجابی اور خالص محبت سے اجازت دی گئی۔

''تو ابا سے پیار کرتی ہے یا ابا تجھ سے پیار کرتا ہے؟'' اس کی بات پہ اماں کے چہرے پہ چمک اور رنگ دوڑ گئے اور کچھ بھولی بسری شرم وحیا بھری مسکان بھی ہونٹوں پہ آٹھہری۔

''نگلی یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہی تو اہم بات ہے اماں!'' پارو نے زور دیا۔

''سچی پوچھو تو ہم دونوں ہی بڑا پیار کرتے تھے ملک جی غصے کا نام بھی نہیں جانتے پر میں بڑی چھیتی غصہ کر جاتی تھی اس لئے وہی مجھے مناتے تھے اور جب میں نہیں مانتی تھی تو وہ اندر باہر چپ چاپ پھرتے رہتے تھے پھر قمری آپا صلح صفائی کرواتی تھیں اس لئے ہمارے پیار و محبت میں قمری آپا بھی شامل ہیں۔'' اماں کی بات پارو نے مکمل دلچسپی سے سنی تھی۔

''یعنی زیادہ پیار ابا ہی کرتے تھے؟'' پارو کی بات پہ اماں نے کسی اور ہی رنگ میں چونک کر دیکھا ان کا دھیان آژمیر کی طرف چلا گیا تھا۔

''نہ پتر زیادہ پیار مرد بھی اسی وقت تک کرتا ہے جب تک اس کی بات مانتی رہو اور اسے غصہ نہ دلاؤ، جہاں بات نہ مانی اور مرد کو غصہ آ گیا سمجھو سارا پیار محبت ہوا ہو گیا یوں سمجھو مرد مطلب سے پیار کرتا ہے اور عورت بغیر مطلب کے۔'' اماں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اسے تھوڑا سمجھانے کی سعی کی ابھی نجانے یہ گفتگو کیا رخ اختیار کرتی محلے کی دو خواتین آ گئیں اور پارو اٹھ کر سبزی بنانے چلی گئی۔

شام کا پنچھی گاؤں کی کچی پکی دیواروں لہلہاتے سرسبز کھیتوں اور گنگناتے درختوں پہ

اپنے سرمئی پروں کا سایہ پھیلا چکا تھا کہیں سے خوشبودار ہنڈیا کی مہک اور کہیں سے روٹیاں بناتے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں کی کھنک اٹھ رہی تھی کوئی ماں اپنے بچے کو آوازیں دے کر شام ہونے پہ گھر بلا رہی تھی اور کوئی بچہ ماں کا آنچل تھامے بھوک پہ بے صبری کا اظہار کر رہا تھا پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں اپنی جگہ سیٹ کرتے ہوئے شور مچا رہے تھے اور کوئی اپنی جگہ چھن جانے پہ واویلا کرتے ہوئے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا ایسے میں مؤذن کی پکار پہ پورے ماحول پہ ایک سکون بھرا سناٹا چھا گیا کئی لڑکیوں بالیوں نے بے اختیار دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھا کر سر ڈھانپ کر اس پکار کو عقیدت سے سنا کئی مردانہ قدم مسجدوں کی طرف اٹھنے لگے اور کئی عورتیں وضو کرنے چل دیں۔

انتہائی خاموش بیٹھی پارو نے ابا کو نماز کے لئے گھر سے نکلتے دیکھا پھر نظر اماں کی طرف اٹھی وہ بھی مرغیوں کا ڈربا بند کر کے وضو کرنے جا رہی تھیں۔ چڑیوں اور کوؤں کے شور میں اب خاموشی اتر چکی تھی سب کو علم ہو گیا کہ ایک دن تمام ہو چکا ہے اللہ کا شکر ادا کرنے کی گھڑی ہے سو سبھی اس کے حضور جھکتے جا رہے تھے بے اختیار پارو کے قدم بھی غسل خانے کی جانب بڑھنے لگے تھوڑی دیر بعد وہ نماز پڑھ کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا رہی تھی جب باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

''آژمیر آیا ہے؟'' بے اختیار اماں خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں پارو آواز سن چکی تھی مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی وہ ہنوز دعا کی حالت میں بیٹھی رہی اماں نے جلدی جلدی پچھواڑے کا کام کرنے والی نسرین کو دروازے کی چابی دے کر بھیجا لکڑی کے گیٹ سے چمچماتی ہوئی لینڈ کروزر اندر داخل ہوئی۔

''اس کو دوسری سائڈ پہ باندھ آؤ یہ گاڑی خراب بھی کر سکتی ہے۔'' اس نے گاڑی سے اترتے ہی گیٹ کے قریب بندھی بڑے بڑے سینگوں والی بھینس کو بیزاری سے دیکھا۔

''اسے ہی کھولنے آئی تھی ملک جی ابھی لے جاتی ہوں۔'' نسرین نے جھک کر بھینس کو کھونٹے سے کھولا اور گھر کے رہائشی حصے کی سائیڈ سے گزر کر پچھواڑے میں لے گئی جہاں بھینسوں بکریوں اور دوسرے پالتو جانور رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جس کو دیہاتی زبان میں تھارا بولتے تھے۔

آژمیر نے قریب آ کر اماں کو سلام کیا ان کے دل میں بے پناہ خفگی تھی مگر بیٹے کو

سامنے جھکے دیکھ کر خفگی برقرار نہ رکھ پائیں اور انتہائی نرمی اور پیار سے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

''جیتے رہو۔'' اسے دعائیں دیتیں وہ ممتا کے احساس سے مغلوب تھیں۔ آخر اتنے دنوں بعد بیٹے کو دیکھ رہی تھی البتہ چارپائی پہ بیٹھے ہوئے آژمیر کی بے ارادہ نظر برآمدے کی طرف اٹھ گئی جہاں وہ جائے نماز بچھائے نماز کے بعد دعاء کر رہی تھی۔ اس نے دوسرے لمحے نظروں کا زاویہ بدل ڈالا اسے اس کو دیکھنے کا کوئی شوق بھی تو نہیں تھا۔

''پارو پتر جلدی سے ٹھنڈا شربت لے کر آ اور پنکھا بھی چلا دے بڑی گرمی ہے۔'' وہ آژمیر کے سامنے والی چارپائی پہ بیٹھ چکی تھیں۔

''نہیں اماں شربت نہیں سادہ پانی چاہئے۔'' اس نے روک دیا۔

پارو سن چکی تھی اس لئے برآمدے میں رکھی فریج سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی جو انتہائی خاموشی سے اس کی سمت بڑھا دیا تھا نہ دعا نہ سلام۔ اماں تو پارو کے پانی لانے سے قبل ہی وہاں سے غائب ہو چکی تھیں کہ نسرین ابھی تک دودھ لے کر نہیں آئی لیکن اماں جن کے لئے غائب ہوئی تھیں وہ جذباتی طور پر خود غائب تھے ان میں فی الحال ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا جو ان کو جذباتی طریقے سے ایک دوسرے کے قریب کرتا یا پھر شادی کے بعد پہلی بار ملاقات ہونے پہ کچھ انوکھا سا اچھوتا سا احساس دلاتا دونوں طرف لاتعلقی اور بے نیازی عروج پہ تھی۔

اس کے ہاتھ سے گلاس تھامتے ہوئے بھی آژمیر نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور وہ بھی لاپروائی سے کھڑی گلاس خالی ہوتے ہی الٹے قدموں لوٹ گئی تھوڑی دیر بعد گھر میں کچھ چہل پہل سی ہونے لگی۔

ابا نماز پڑھ کے آ چکے تھے چچا قدیر کو آژمیر کی آمد کا پتہ چلا تو وہ بھی ملنے چلے آئے، چچی زہرہ بھلا کیوں پیچھے رہتیں ایسے میں پارو کو احساس ہوا کہ دیوار پار سے بھی کسی نے آژمیر کی آمد کو ''ویلکم'' کیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد کافی دیر یونہی صحن میں محفل لگی رہی البتہ پارو ان لوگوں کو چائے دے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی گرمی کا احساس کافی تھا لیکن وہ کمرے سے باہر سونے کی عادی نہیں تھی اسی لئے تین چار روز قبل ملک ضمیر حیات اس کے لئے روم کولر لے آئے تھے پارو کے ان ناز نخرا اٹھائے جانے پہ ماہین نے کافی ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''اب ایسی بھی کیا نازک مزاجی کی صحن میں نہ سویا جا سکے ہم بھی تو سوتے ہیں ہونہہ فضول

میں آٹھ دس ہزار روپیہ خرچ کروانا ضروری تھا؟'' پارو اسے جواب کیا دیتی ابا خود ہی بول پڑے۔

''جب گھر بار ہی اس کا ہے تو پھر آٹھ دس ہزار کیا اہمیت رکھتے ہیں۔'' جس پہ ماہین مزید جل کر رہ گئی......

''میرا آسمانی سوٹ کہاں ہے؟'' بے حد تیکھے...... بے زار اور برہم لہجے میں پوچھا گیا اور غنودگی میں اتری پارو یکدم چونک کر بے دار ہوئی آژمیر الماری کھولے کھڑا تھا۔ پارو کی ناسمجھ سوالیہ نظریں دیکھ کر اور تلملایا۔

''محترمہ! میں پوچھ رہا ہوں میرا آسمانی رنگ کا سوٹ کہاں ہے اگر ہوش و حواس مکمل ہیں تو بتا دیں تاکہ میں کپڑے بدل سکوں۔'' لہجے کی کاٹ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پارو نے اس کا سوٹ نچلے خانے میں تہ کر کے رکھا ہوا تھا اس لئے خود ہی بیڈ سے اتر آئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پارو آگے بڑھ کر الماری سے سوٹ نکالنے لگی بے زاری کے عالم میں آژمیر نے اس کی پشت کو گھورا مگر چونک گیا سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی ناگن کی طرح نازک کمر پہ جھول رہی تھی اس کی نظر دراز چوٹی کو چھوتے ہوئے اس کی گردن اور کندھوں تک چلی گئی دوپٹہ شانوں پہ تھا البتہ سر سے ڈھلکا ہوا تھا۔ نچلے خانے سے سوٹ نکالنے کے لئے وہ جھکی اور چوٹی بل کھا کر شانے سے گزر کے نیچے جا گری۔

''یہ لیجئے۔''

وہ یکدم پلٹی تو آژمیر یکدم ٹپٹا گیا۔ نگاہ لڑکھڑا کے رہ گئی تھی سوٹ لے کر تیزی سے کمرے سے چلا گیا تھا اندر ہی اندر اپنے آپ کو جھڑک دیا کہ پارو کو اس طرح دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی میرے لئے پہلا اور آخری حسن صرف رینا کا ہی تھا باقی ساری دنیا کی خوب صورتی میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی اور میرے دل میں اب کوئی حسن کوئی خوبصورتی اور کوئی جذبہ نہیں پنپ سکتا...... وہ اپنے آپ کو ہدایت دے کر اور مضبوط کر کے دوبارہ کمرے میں آیا تھا اب کی بار وہ سچ مچ گہری نیند سو رہی تھی آہٹ پہ بھی بے دار نہ ہوئی۔

صبح صبح وہ نہانے کے بعد زمینوں کی طرف نکل گیا تھا واپس آیا تو اماں ناشتا بنا رہی تھیں اور پارو دودھ بلونے میں مصروف تھی انتہائی انہماک سے اپنے کام میں مصروف پارو کو دیکھ کر آژمیر کو حیرت ہوئی وہ پارو کے انداز اطوار دیکھ کر قدم قدم پہ چونک رہا تھا اسے پل پل حیرت کا سامنا تھا پارو اور ایسے کام کرے؟ ناممکن سا مرحلہ تھا لیکن پھر بھی طے ہو رہا تھا پارو ایسے

کام کر رہی تھی۔ مدھانی سے مکھن نکال کر وہ ایک پیالے میں رکھتی جا رہی تھی اور مکھن نکالتے ہوئے اس کی انگلیاں بھی مکھن کی ہم رنگ لگ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد آژمیر کا ناشتا تیار تھا تازہ تازہ پراٹھے اور تازہ نکالا گیا مکھن ٹھنڈی ٹھار دہی کی لسی، وہ اتنا ہیوی ناشتا نہیں کرتا تھا مگر جب اماں اصرار کرتیں تو انکار کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا اسی لئے مجبوراً کھانا پڑتا تھا لسی اور پراٹھے پہ موجود مکھن کھاتے ہوئے بے اختیار آژمیر کی نگاہوں میں تھوڑی دیر پہلے کا منظر گھوم گیا جب پارو اس مکھن کو انگلیوں سے نکال کر جمع کر رہی تھی بے ساختہ ہی آژمیر کے منہ میں مکھن کے ساتھ ایک اور ذائقہ اتر آیا نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مکھن کی جگہ اس کے ہاتھوں کا ذائقہ محسوس ہونے لگا لسی کا گلاس ختم ہو گیا پراٹھا بھی ختم ہو گیا مگر اس مکھن میں رچے ذائقے کا احساس ختم نہ ہوا آخر وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا تب تک ماہین بھی آ چکی تھی۔

''کیسے ہو آژمیر؟'' وہ آژمیر سے ایک سال ہی چھوٹی تھی اس لئے برابری اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی تھی۔

''ٹھیک ہوں آپ سنائیں کہاں ہوتی ہیں؟'' آژمیر ہمیشہ اسے احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

''میں تو یہیں ہوتی ہوں البتہ تم یہاں نہیں ہوتے۔''

ماہین نے ناشتے کے برتن سمیٹتی پارو کو استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔

''بس آج کل کی مصروفیت ہے پھر میں بھی فارغ ہو جاؤں گا اسفر کیسا ہے کوئی پیغام آیا؟'' اسفر، ماہین سے بڑا تھا اور آرمی میں آفیسر تھا آج کل اٹک چھاؤنی میں تعینات تھا اس لئے ویک اینڈ پہ آنا بھی ذرا مشکل ہوتا تھا یوں اسفر اور آژمیر کی ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی کیونکہ آژمیر بھی اکثر شہر میں اپنے بزنس کے چکروں میں الجھا رہتا تھا۔

''ہاں چند دنوں تک آنے کا کہہ رہا تھا اور ہم سوچ رہے ہیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کا گھر بسا دیں۔''

ماہین بات کو طول دے رہی تھی جبکہ آژمیر گھڑی دیکھتا ہوا کہیں جانے کا ارادہ باندھ رہا تھا۔

''اچھا ماہین اللہ حافظ مجھے ساتھ والے گاؤں اپنے دوست سے ملنے جانا ہے۔'' وہ

آخر میں الوداعی الفاظ بولتا آگے بڑھ گیا تھا اور ماہین رسوئی کی چوکھٹ میں کھڑی پارو کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''کیسی ہو پارو؟'' ماہین نے اس کے سراپے پہ ناقدانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں الحمدللہ آپ آج کدھر راستہ بھول گئیں دیوار کی بجائے سیدھے رستے کو زحمت دے ڈالی۔'' پارو...... دل و نگاہ کے معاملے میں خاصی باریک بین تھی۔ ماہین کی چال سے ہی وہ اس کے چلن کا اندازہ بخوبی کر چکی تھی۔

''وہ مجھے لسی لینی تھی ہماری چاٹی (کٹورے) میں بلی منہ مار گئی ہے۔'' اس نے بہانہ کیا۔

''پہلی بار مار کے گئی ہے یا پھر پہلے بھی مارتی تھی......؟ ارے چاٹی میں منہ!'' ماہین کے چونک کر دیکھنے پہ پارو نے لاپروائی سے ہلکی سی وضاحت بھی دی اس کے انداز میں نجانے کیا تھا کہ ماہین جل کے رہ گئی اور پاؤں پٹختی ہوئی لسی لے کر چلی گئی تھی اور وہ اماں کے ساتھ دوپہر کے کھانے کا پوچھنے چل دی۔

اماں صحن کے ایک کونے میں لگے نیم کے درخت کے نیچے چارپائی بچھائے بیٹھی تھیں قریب ہی مرغیاں بطخیں اور بکریاں بھی محفل جمائے ہوئے تھیں۔

❁......❁......❁

آژمیر کو پہلے بھی ایک دو بار احساس ہو چکا تھا کہ پارو اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہے پرسوں تولیہ لینے کی غرض سے وہ صحن میں کھڑی پارو کے قریب آیا تو وہ یکدم بدک کے دور ہوئی تھی حالانکہ وہ رسی پہ لٹکے تولئے کو اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا اسے پارو کی حرکت پہ حیرت تو ہوئی مگر سمجھ نہ آئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل جاتی اس وقت بھی وہ تھک ہار کے بیڈ پہ دراز ہوا تو ایک سائیڈ پہ لیٹی پارو یکدم کھسک کے کچھ دور ہوئی تھی جس پہ بے اختیار آژمیر کا سارا دھیان اس کی طرف مڑ گیا (میں خود تمہارے قریب نہیں آتا ورنہ مجھ سے دور جانے والی تم کون ہوتی ہو؟) اس نے نخوت سے سوچا اور ایک نظر پارو پہ ڈالی اس کی طرف پشت تھی۔ آژمیر نے یکدم اس کی کمر میں بازو ڈال کے جھٹکے سے گھما کر اسے اپنے سامنے اور قریب کر لیا تھا وہ اس اچانک افتاد پہ چکرا گئی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہارے قریب آتا ہوں اور تم دور ہو کر مجھے تڑپا رہی ہو؟''

آژمیر کے لہجے میں طنز، کاٹ اور غصہ بدرجہ اتم موجود تھا پارو اس کے بازو میں اتنی سختی سے

جکڑی تھی کہ تکلیف کا احساس اس احساس پہ حاوی ہو گیا کہ وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ غصے میں بولتے آژمیر کی سانسیں پارو کے رخساروں کو چھو گئیں۔

"ملک صاحب آپ خود تڑپ رہے ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ تڑپ ہی تو ہے جو آپ کو اس وقت بھی تڑپا رہی ہے اس تڑپ کو روکنا آپ کا کام ہے میرا تو نہیں۔" آژمیر نفرت آمیز اظہار پہ اتر آیا تھا۔

"ہونہہ تڑپ! محترم ماہ پیکر تم کبھی مس ورلڈ بن کے بھی آجاؤ تو میرے دل پہ اثر نہیں کر سکتیں مجھے نفرت ہے تمہاری صورت سے اس گھر میں اگر تم دکھائی دے رہی ہو تو صرف میری عنایت سے اماں کی ہزاروں منتوں کے بعد تمہیں یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہے سمجھیں تم؟ کیونکہ تم تمہارا یہ وجود اور تمہاری باتیں میرے لئے رتی برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے......"

"ملک صاحب میں آپ کے کھوکھلے اور مردہ دل پہ اثر کرنا بھی نہیں چاہتی اور جتنی نفرت آپ مجھ سے کرتے ہیں اس سے دس گنا زیادہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں اور ہاں ایک بات یاد رکھئے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب آپ اس گھر میں صرف میری وجہ سے میری عنایت سے نظر آئیں گے تب کھیل میرا ہو گا اور اماں آپ کو لانے کی منتیں بھی نہیں کرے گی کیونکہ آپ، آپ کا یہ وجود اور آپ کی باتیں میرے لئے ہی نہیں کسی کے لئے بھی اہمیت نہیں رکھیں گے سمجھے آپ؟" وہ اس سے زیادہ نخوت سے کہتی جھٹکے سے دور ہو گئی تھی اور آژمیر نے تلملا کر غصے سے اپنا ہی موبائل دیوار پہ دے مارا تھا۔

اس جھڑپ کے بعد پارو کے دل ودماغ میں آژمیر کے خلاف شیطانی ارادے بننے لگے۔

کیونکہ آج تک اس نے آژمیر کو نہ ستایا تھا اور نہ ہی تڑپایا تھا اگر وہ ستانے یا تڑپانے کا ارادہ باندھ لیتی تو یقیناً آژمیر کو ناکوں چنے چبوا سکتی تھی اس میں مقابل کو زچ کرنے کے ایک سو ایک حربے اور صلاحیت موجود تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس صلاحیت کو ایک بار ضرور بروئے کار لا کر دیکھنا چاہئے مگر اتنا کہ کسی اور کو بھی خبر نہ ہو سکے اور ملک آژمیر حیات بے بسی سے الجھ کر رہ جائے اور اس کام کے لئے اب اسے نئے انداز سے سوچنا تھا کیونکہ اب اس نے ملک آژمیر سے بھاگنا نہیں تھا روبرو رہ کر مقابلہ کرنا تھا نفرت میں شانہ بشانہ قدم اٹھانے تھے جس کے لئے اسے کافی سے زیادہ اسٹیمنا جمع کرنے کی ضرورت تھی اور وہ بھی کر رہی تھی اور اس کی شروعات بھی آج ہی ہو گئی تھی۔

خوش قسمتی سے پارو کے گاؤں سے اس کی سہیلی شنو آ گئی اور پارو اچانک شنو کو اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے چیخ اٹھی۔

"شنو تو یہاں۔" دونوں بے تابی سے گلے ملیں اور کمرے سے نکلتے آژمیر نے دو سہیلیوں کی بے تابی اور بے پناہ اپنائیت کا منظر دیکھا۔

"آج ابا اپنے دوست کے گھر آ رہا تھا میں نے سوچا ہماری پارو کا گھر بھی تو اسی گاؤں میں ہے پھر ابے سے تھوڑی اڑی کی اور ابا مان گیا۔" شنو نے اپنے آنے کا قصہ بتایا پھر آژمیر کو دیکھ کر سنبھل گئی۔

"سلام ملک جی۔" اس نے انتہائی تمیز کا مظاہرہ کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں اماں ابا کا قیام ہوتا تھا۔

"پارو خیر تو ہے؟" شنو نے انداز بدل کے خیر پوچھی۔

"شنو خیر تو اب میں کروں گی دیکھنا اس ملک صاحب کا حال کیا ہوتا ہے؟" اس نے مبہم سے انداز میں کہا پھر شنو کو لے کر کمرے میں آ گئی۔

"چاچا نہیں آیا یہاں؟" پارو نے شنو کے ابے کا پوچھا۔

"جلدی میں تھا تیرے دروازے پہ چھوڑ گیا واپسی پہ آئے گا وہ بھی تجھے یاد کر رہا تھا۔"

اماں اور بہنوں کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد ان لوگوں کی باتیں شروع ہو گئیں نسرین کے ہاتھ اماں نے کھانے پینے کی کافی اشیاء بھجوائی تھیں اور کھانے کی تیاری بھی شروع کر دی آخر پارو کی سہیلی آئی تھی اور وہ بھی اس کے گاؤں سے اس لئے خصوصی خاطر تواضع تھی۔

آژمیر کو اماں کا یہ ہر ہر قدم پہ پارو کے لئے بچھ بچھ جانا سخت زہر لگ رہا تھا اور اسی لئے ناگواریت اس کے چہرے کو دیکھتے ہی محسوس ہو رہی تھی اوپر سے کمرہ پارو اور شنو کے قبضے میں تھا جس سے مسلسل کھلکھلاہٹوں کی آواز اور مبہم سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کافی دیر بعد پارو کسی چیز کے لئے باہر نکلی اور آژمیر تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

"اپنی سہیلی کو کسی دوسرے کمرے میں لے جاؤ مجھے آرام کرنا ہے۔"

"دیکھا اماں ملک صاحب کیا کہہ رہے ہیں اپنی سہیلی کو کمرے سے نکال دوں ان کو آرام کرنا ہے۔" پارو نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اماں کو درمیان میں گھسیٹ لیا اور آژمیر سٹپٹا گیا۔

"ہائیں؟ یہ کیا طریقہ ہوا مہمان نوازی کا؟" اماں تو پہلے ہی پارو کے ساتھ ساتھ اس

کے پورے گاؤں پہ فریفتہ تھیں یہ بات سنتے ہی آژمیر کی طرف مڑیں اور آژمیر تازہ تازہ کٹے ہوئے تربوز کی ٹرے اٹھا کر لے جاتی پارو کو دیکھ کر سرتاپا غصے سے جھنجھنا اٹھا تھا کیونکہ اس کے لبوں پہ دھیمی دھیمی مسکان تھی۔

پارو نے پلان تو بہت بنائے تھے مگر ان پر عمل درآمد نہ کر سکی کیونکہ دو روز بعد ہی آژمیر شہر چلا گیا تھا اس کا پارٹنر دبئی جا رہا تھا اس لئے بزنس کا سارا کام کچھ عرصہ اسی نے سنبھالنا تھا اور آژمیر جو گاؤں آ کر ٹینشن کا شکار ہو چکا تھا گاؤں سے نکلتے ہی آزاد اور ہلکا پھلکا ہو گیا اسے اس پارو پہ غضب کا غصہ تھا۔ اختیار میں ہوتا تو وہ پارو کو مار مار کر اس کے چودہ طبق روشن کر دیتا مگر مسئلہ تھا کہ اماں آڑے آ جاتی تھیں۔

''آژمیر کو شہر آ کر بھی پارو کی لگائی آگ چین نہیں لینے دے رہی تھی وہ جو ہر وقت رینا کے خیالوں اور یادوں میں گم رہتے ہوئے زندگی بسر کر رہا تھا اب اس پہ پارو کا بھوت سوار ہو چکا تھا وہ اسے عجیب عجیب رنگ برنگی چوٹیں لگائی تھی اب تو نیا طریقہ اپنا رکھا تھا فٹافٹ اماں ابا کو معاملے میں گھسیٹ لیتی اور آژمیر کو ستا کر خود سکون سے سائیڈ پہ ہو جاتی ایسے میں وہ بس ہاتھ مسل کے رہ جاتا تھا۔

''یار کیا بات ہے کچھ اپ سیٹ کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو کیا بھابی کو چھوڑ کے آنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا؟'' اس کے دوست نے اسے چھیڑا تو آژمیر یکدم سنبھل گیا۔

''یار ایسی کوئی بات نہیں میں کام کے متعلق سوچ رہا تھا۔''

''جھوٹ تو مت بولو بھابی کا نام اب تم نے کام رکھ دیا ہے۔'' اس کا یہ دوست دانش انصاری کافی شرارتی اور قریبی دوست تھا۔ اسی لئے یہ چھیڑ چھاڑ بھی چلتی تھی۔

''بکواس مت کرو یہ بتاؤ تمہاری فلائٹ کب ہے؟'' آژمیر نے سر جھٹک کر تمام توجہ دانش پہ مرکوز کر رکھی تھی اور دانش اپنے جانے کے متعلق معلومات فراہم کرنے لگا۔

جون، جولائی کی دوپہریں اور دن کی دھوپ اور گرمی کے اثرات سے تپتی سلگتی شامیں، چاندنی کی ٹھنڈک اور کبھی کبھی لو دیتی ہوائیں اس نے اس ایک آنگن میں اکیلے بتائیں وہ ایسا گیا کہ ایک بار بھی پلٹنے کا نہیں سوچا تھا کبھی کبھی پارو اپنے مزاج سے ہٹ کر سوچتی تو اسے ہول اٹھنے لگتے تھے جی چاہتا کہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر اجاڑ ویران کر کے یہاں سے چلی جائے مگر

جاتی کہاں؟ جہاں الٹا ناتواں ماں ایک بیٹی کی طلاق کا غم سینے سے لگائے بیٹھی تھی؟ جہاں اس کے جانے سے مزید دکھوں میں اضافہ ہو جاتا؟ اسی لئے وہ اپنے آپ سے اور ملک آژمیر سے مقابلہ کرتی پھر رہی تھی مگر وہ تو مقابلہ کرنے سے پہلے ہی میدان سے جا چکا تھا اس لئے پارو میدان کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی مخالف پارٹی کا انتظار کر رہی تھی اور اس انتظار میں کھیل کے موسم بیتتے جا رہے تھے۔

در و دیوار پہ اترنے والی دھوپ کی چال بدل رہی تھی صحن میں بکھرنے والے سائے رنگ بدل رہے تھے۔ خالہ، خالو کے کندھے شکستہ لگنے لگے تھے ماہین کی باتیں بڑھ چکی تھیں اور پارو سب کو بہلا بہلا کر تھکنے لگی تھی خالہ کو تسلیاں دیتی خالو کو سمجھاتی ماہین کے سامنے ناٹک کرتی اور اپنی ماں بہنوں اور سہیلیوں کے سامنے جھوٹ کہتے سچ مچ تھک چکی تھی اس کا بس چلتا تو وہ ایک بار ملک آژمیر حیات کا گریبان پکڑ کر اتنا ضرور پوچھتی کہ کون سے جنم میں میرے دشمن بنے تھے جس کا بدلہ تم مجھ سے ہی نہیں اپنے ماں باپ سے بھی لے رہے ہو پھر بھی تمہارا دل نہیں بھر رہا۔ لیکن کاش وہ ایسا کر سکتی وہ ایک بار سامنے تو آتا۔ نجانے نہ آنے کی قسم کھا کر گیا تھا پھر کوئی قسم اسے کھا گئی تھی۔ کچھ خبر نہیں ہو رہی تھی۔

''ملک جی اپنے بیٹے سے کہہ دینا اس معصوم بچی کو برباد کرنے کی بجائے آزاد کر دے۔'' ملک قریبی پی سی او سے آژمیر کو فون کرنے جا رہے تھے جب دل پہ ہزاروں من کا پتھر رکھتے ہوئے اماں نے یہ جملہ کہا تھا اور ضمیر حیات نے بھی یہی جملہ من و عن فون پہ آژمیر سے کہہ دیا اس کے جواب میں آژمیر نے کیا کہا اماں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ دن بھر اداس اور ملول رہی تھیں پارو نے بارہا اس اداسی میں مداخلت کی مگر اماں یونہی چپ چاپ منہ سر لپیٹے پڑی رہی اماں کی کسلمندی دیکھ کر ابا نے بھی کوئی بات نہ چھیڑی۔

شام کو موسم ابر آلود ہو گئے۔

نومبر کی دم توڑتی نبضیں ماحول کو یخ بستہ کر رہی تھیں وہ چائے بنا کر ان کے پاس ہی آ بیٹھی ابا آگ دہکائے بیٹھے تھے اور اماں لحاف میں دبکی ہوئی تھیں۔

''اماں سر دبا دوں؟''

''ارے پتر ہٹی کٹی ہوں دن رات ویلی (فارغ) رہتی ہوں بیمار بھی نہیں ہوتی سر کیوں دبائے گی بھلا؟'' آژمیر کی وجہ سے ہونے والی خفگی کسی طور تو نکلنا ہی تھی۔ پارو نے

بے بسی سے ابا کو دیکھا وہ بھی کچھ نہ بولے۔

''دیکھ پتر دن بھر اتنا کام کرتی ہے اس وقت بھی پاؤں یا سر دبا کے سوتی ہے یہ سب کر کے تجھے بھی تو تھکن ہوتی ہوگی شاباش جا کر خود آرام کرو سو جاؤ ہم ٹھیک ہیں۔''

''پر ابا اماں مجھ سے کیوں ناراض ہوتی ہے؟'' پارو روہانسی ہوگئی۔

''اس لئے کہ تجھ سے اتنا پیار جو کرتی ہے۔''

انہوں نے مسکرا کر اس کا سر تھپکا اور اسے سونے کے لئے بھیج دیا مگر کافی دیر پارو ستون کے پاس کھڑی رہی، بارش کی بوندیں کچے صحن میں جذب ہوئیں تو مٹی کی خوشبو رگ رگ میں اتر کر مسحور کرنے لگی۔ پارو اس کچی مٹی کی مہک دل میں چھپائے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

◈......◈......◈

رات کا نجانے کونسا پہر تھا جب گہری نیند سوئے دماغ پہ ٹھک ٹھک کر آواز ایک بوجھ سا ڈالنے لگی تھی اور غنودگی میں حسیات بمشکل رفتہ رفتہ بے دار ہوئیں اور پارو یکدم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی کوئی دستک کے ساتھ ساتھ اسے پکار بھی رہا تھا۔

''پارو پتر اٹھ باہر کوئی دروازہ بجا رہا ہے۔'' یہ آواز یقیناً اماں کی تھی پارو فوراً لپکی اور دروازہ کھول دیا اماں باہر برآمدے میں کھڑی تھی پارو نے متفکر نظروں سے دیکھا باہر طوفانی بارش نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی بجلی بھی کڑک رہی تھی اور بادلوں کی گرج بھی سونے پہ سہاگہ تھی وہ پلٹ کر اندر آئی جوتے پہنے دوپٹہ اوڑھا اور دوبارہ باہر آ گئی سرد ہوا چل رہی تھی۔ بجلی اور بادلوں کی گرج نے الگ ماحول میں خوف بھر دیا تھا بمشکل پارو ڈیوڑھی کے لکڑی کے گیٹ تک پہنچی۔

''کون ہے؟'' اس نے کپکپاتے ہوئے پوچھا اس کی دھیمی آواز اس شور ہنگامے میں اپنا وجود نہ منوا سکی۔

''کون ہے؟'' اب کی بار دروازے کے بے حد قریب آ کے بلند آواز سے تقریباً چیخ کر پوچھا گیا۔

''دروازہ کھولو میں ہوں۔'' پارو حیرت سے کھڑی رہ گئی۔ آژمیر حیات اور اس وقت اس موسم میں اور اتنی رات گئے؟ حیرت تو فطری عمل تھا مگر یہ عمل کچھ زیادہ طویل ہو گیا تھا جب ہی آژمیر نے تلملا کر دروازہ پیٹ ڈالا اور پارو نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

''مر گئے تھے سب کے سب؟'' وہ اندر قدم رکھتے ہوئے دھاڑا وہ بے ساختہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہو گئی وہ سر تا پا بارش میں بھیگا ہوا تھا اور نجانے کب سے دروازہ بجا رہا تھا جس کی وجہ سے اب پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا وہ اس پہ ایک نگاہ غلط بھی ڈالے بنا آگے بڑھ گیا تھا اور پارو جوں کی توں کھڑی لمبے لمبے ڈگ بھر کے صحن عبور کرتے آژمیر کی پشت دیکھ کے رہ گئی۔

برآمدے میں کھڑی اماں آژمیر کو اتنے مہینوں بعد غیر متوقع طور پہ اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے چہک اٹھیں ابا بھی بے دار ہو چکے تھے وہ بے دلی سے گیٹ بند کرنے لگی اور سست قدموں سے چلتی واپس آ گئی۔ مگر بارش نے صحن کراس کرتے ہوئے دوبارہ اسے بھگونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی پارو سیدھی اپنے کمرے میں آئی تھی وہ بھی پوری بھیگی ہوئی تھی اس لئے اب کپڑے بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس نے بھیگا ہوا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پہ رکھا اور چہرے سے پانی صاف کرتے ہوئے الماری کھولنے لگی ابھی وہ اپنے لئے کپڑے نکال ہی رہی تھی، جب آژمیر بھی کچھ اسی حالت میں اندر داخل ہوا اور آگے پیچھے دیکھے بنا سیدھا الماری کی سمت آیا اور الماری کا پٹ بند کر کے مڑتی پارو چونک گئی البتہ آژمیر کے قدم اپنی جگہ پہ جم سے گئے تھے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ایسا نازک اور دھڑکتا منظر پہلی باریوں روبرو سامنے آیا تھا کہ آژمیر بھی نگاہیں ہٹانا بھول گیا تھا اور پارو اپنے سامنے اور اتنے قریب کھڑے آژمیر کے سامنے سے ہٹنے کے لئے راستہ تلاشتی رہ گئی بوکھلاہٹ میں اپنا آپ چھپائے نہیں چھپ رہا تھا اور اسی بوکھلاہٹ میں ہی وہ آژمیر کا کندھا دھکیل کے سائیڈ سے گزر گئی لیکن ہوش ربا احساس پورے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے لئے چائے لے کر آئی تو کپڑے تبدیل کر کے دوپٹہ بھی ٹھیک کر کے اوڑھ چکی تھی وہ بھی چینج چکا تھا رسوئی بند کر کے جب تک وہ اپنے کمرے میں آئی بجلی اچانک روٹھ گئی بیڈ پہ لیٹے آژمیر نے لائٹر جلایا اور پارو نے چینخیں چڑھا دی اتنے میں وہ بھی لائٹر بجھا چکا تھا اور اتنے گھور اندھیرے میں اندازے سے چلتی وہ بمشکل بیڈ کو ٹٹول پائی اس کا ہاتھ سیدھا آژمیر پہ جا پڑا۔

اور دوسرے پل آژمیر کا ایک جھٹکا اس کے سارے توازن درہم برہم کر گیا تھا چند سیکنڈ بعد وہ سنبھلی مگر تب تک آژمیر حصار مضبوط کر چکا تھا اور وہ جو پارو سے عمر بھر دور رہنے کی قسمیں کھائے بیٹھا تھا اتنے بڑے بڑے عہد باندھ رکھے تھے سب کے سب توڑتا چلا گیا اس

وقت وہ اس کی بیوی اور اس کی ملکیت تھی جس پہ اس کی مکمل دسترس تھی اور یہی احساس سرشاری اور مدہوشی کو مزید ہوا دے رہا تھا پارو آج اس کے حصار میں تھی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

"پتر اتنی دیر سے کیوں آیا تھا؟" اماں چائے پیتے آژمیر کے قریب آ بیٹھیں وہ ناشتا کر کے اب چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رات کی طوفانی بارش نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا مگر اس وقت بادلوں سے الجھ کر منظر عام پہ آنے والے سورج کی کرنیں جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھیں جانوروں سے لے کر پودوں تک ہر چیز بھیگی بھیگی اور ٹھٹھری ٹھٹھری لگ رہی تھی لیکن اس کے برعکس ملک آژمیر حیات کی بشاش طبیعت سے اس کے سکون کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"ساتھ والے گاؤں میں میرے ایک دوست کی شادی تھی شہر واپس جانے کے لئے دیر ہو گئی موسم بھی خراب تھا اس لئے ادھر چلا آیا لیکن گاؤں کے چوک میں ہی گاڑی کا ٹائر گڑھے میں پھنس گیا اس لئے گھر تک پیدل آنا پڑا۔" وہ چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے انہیں جواب دیتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کچھ دن رہے گا نا اِدھر؟" انہوں نے کافی آس بھری نظروں سے دیکھا۔

"کہہ نہیں سکتا کیونکہ آفس سنبھالنے والا کوئی نہیں ایک اعتبار کا منیجر ہے مگر وہ بھی کب تک کام کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔" آژمیر کا سرسری سا انداز انہیں مایوس کرنے لگا۔

"تو پھر ایک کام کر پارو کو ساتھ لے کر اپنی خالہ (پارو کی اماں) کے گھر ہو آ وہ اتنی بار تیرا پوچھ چکی ہے اور پارو بھی اتنے دنوں سے نہیں گئی۔" انہوں نے نیا آئیڈیا سوچا، دونوں کو تنہائی بخشنے کا۔

"معافی چاہتا ہوں اماں میں آج فارغ نہیں ہوں۔"

صاف کورا جواب دیتا وہ برآمدے سے نکل گیا اور رسوئی میں بیٹھی پارو سر تا پا سلگ اٹھی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ جاتی کب ہوں ملک صاحب۔"

انتہائی نخوت سے بڑبڑاتی وہ چولہے کے سامنے بیٹھی جلتی لکڑیوں سے اُلجھنے لگی گزشتہ شب اپنا ہر احتجاج بے سود ہوتا دیکھ کر اس کے دل میں اس وقت انگارے دہک رہے تھے۔

لیکن آژمیر کے خلاف جو غیض و غضب اس کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا وہ اتنی

آسانی اور جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا دل ہی دل میں وہ بپھر رہی تھی کہیں غبار جو نہیں نکل رہا تھا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

شام کو آژمیر گاڑی لے کر گھر آیا تھا لیکن والدین کی موجودگی کے باوجود گھر خالی خالی لگ رہا تھا اسے سمجھ نہ آیا کہ ایسا کیوں ہے مگر کچھ دیر بعد یہ احساس بھی کھل گیا کہ ایسا کیوں ہے۔

"وہ چلی گئی ہے تو آپ لوگ اتنے چپ کیوں بیٹھے ہیں؟" اسے خفگی ہوئی تھی۔

"ہائے کیوں نہ چپ ہوں پہلے اتنے مہینے تم گھر ہی نہ آئے اب آئے ہو تو وہ چلی گئی ہے ہمارا کیا ہے جو چاہے کرتے پھرو......" آہ بھر کر رہ گئیں اور وہ اماں کو دیکھنے لگا۔

گاؤں کے بڑے ملک کی بیوی تھیں زندگی میں سکھ و آرام بھی تھا اولاد بھی تھی کوئی دکھ تکلیف یا بیماری بھی نہ تھی پھر بھی وہ اتنی بوڑھی اور کمزور لگتی تھیں اور اس بڑھاپے کے اثرات آج کل کچھ زیادہ دکھائی دینے لگے تھے اور اس کا ذمہ دار کسی نہ کسی حد تک وہ خود تھا کیونکہ ان کی ہر خوشی غم اس کی ذات سے وابستہ تھے ان کی زندگی کا مرکز وہی تھا اور وہی ان کو پریشانیاں دیتا آ رہا تھا یہی سوچتے سوچتے اپنا آپ غلط لگنے لگا تھا پھر رینا سے کیا گیا وعدہ بھی دماغ میں تازہ ہونے لگا اس لئے ندامت بھی ہوئی مگر وقتی طور پہ کیونکہ جہاں پارو کا خیال آ جاتا تھا وہاں وہ ہر ندامت بھول کر کینہ پرور ہو جاتا تھا اسے پارو کا گھمنڈی انداز طیش دلا دیتا تھا وہ اس کے نازک سراپے میں اکڑ کا اثر دیکھتا تو غصے میں آ جاتا تھا لیکن اس وقت سچ مچ چاہے وقتی ہی سہی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"میں صبح اسے جا کر لے آؤں گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور اماں کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔

"تو جائے گا لینے کے لئے؟" دوبارہ پوچھا گیا تا کہ یقین ہو سکے۔

"جی میں ہی جاؤں گا۔" اس نے یقین کی مہر لگاتے ہوئے باہر کی سمت قدم بڑھا دیئے اور اگلی صبح ان دونوں کی خوشیوں کا دن تھا انہوں نے فروٹ اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں منگوا رکھی تھیں۔ وہ پہلی بار سسرال جا رہا تھا اس لئے خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا تھا خود اسے ان باتوں کا بھلا کیا خیال تھا جو کچھ کرنا تھا انہوں نے ہی کرنا تھا اور اتنی چہل پہل کے باوجود آج بھی خاصی ادھوری لگ رہی تھی پارو کا وجود اس گھر کے لئے بے حد ضروری اور اہم ہو چکا تھا اس کے بغیر اب سب کچھ نامکمل تھا بارش کی وجہ سے کچی پکی سڑکوں پہ کیچڑ اور مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے

تھے جن کی وجہ سے بلیک چمکتی دمکتی لینڈ کروزر مٹی مٹی ہو رہی تھی اور ڈرائیونگ بھی کافی احتیاط سے کرنا پڑ رہی تھی آدھے پون گھنٹے کی مسافت پورے ایک گھنٹے میں طے ہوئی اور وہ پارو کے گاؤں پہنچا تھا۔

''دیکھ پارو کسی کو بھی اتنی امید نہیں تھی کہ تو کسی کے ساتھ نبھاہ کرے گی پر تجھے اتنے مہینوں سے اپنے گھر میں خوش اور نباہ کرتے دیکھ کر سب ہی کو بڑی حیرانی ہوتی ہے تو یقین کر پارو تیری اماں تیرے لئے اتنی دعائیں کرتی ہے کہ میں حیران ہوتی ہوں پہلے وہ تجھے کتنا کوستی تھی۔'' شنو چارپائی پہ لیٹی پارو کا سر دباتی ہوئی باتیں بھی کر رہی تھی۔

''چل ہٹ میری اماں مجھے کب کوسنے دیتی تھی بس میں اسے تنگ کرتی تھی اسی لئے تھوڑا گرمی کھا جاتی تھی......'' پارو نے شنو کا ہاتھ اپنے ماتھے سے جھٹک دیا۔

''اچھا اب کسے تنگ کرتی ہے اپنے ملک صاحب کو۔''

''ارے نام مت لے اس ملک کے بچے کا، جی چاہتا ہے گولی ماردوں مر جانے کو......'' پارو یکدم غرائی لیکن دوسرے پل خود پہ پڑنے والے سائے سے چونک گئی پارو سردی کی وجہ سے دھوپ میں چارپائی ڈالے لیٹی ہوئی تھی اور سرہانے شنو بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی ایسے میں ان کی گفتگو بھی کراری تھی جو آژمیر نے حرف بہ حرف سنی تھی اسی لئے مزید قریب آتے ہوئے گلا کھنکار کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی پارو اور شنو دونوں کے بیک وقت رنگ اور حواس اڑ گئے تھے۔

''مم ملک جی آپ! السلام علیکم آج آپ کیسے؟'' شنو نے بے ربط سا سلام کیا اور بولنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی سر ڈھانپنے کی کوشش بھی جاری تھی البتہ پارو صرف اٹھ کر بیٹھی تھی کہا کچھ نہیں تھا۔

''وعلیکم السلام بیٹھو تم لوگ۔'' اس نے پارو پہ ایک سخت سی نگاہ ڈالی وہ چارپائی کے اوپر ہی دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی رہی سر جھکا ہوا اور دوپٹہ کندھے سے ڈھلک رہا تھا۔

''باقی سب کہاں ہیں؟'' شنو نے دوسری چارپائی قریب کھینچ کر اسے پیش کی تو آژمیر نے شنو سے ہی دریافت کر لیا۔

''ماسی پارو کے لئے دوائی لینے گئی ہے...... اسے کل سے بخار ہے......'' شنو نے بمشکل بات مکمل کی اور پھر چائے کا کہہ کر رسوئی کی سمت چلی گئی۔

اتنے بڑے صحن میں تنہائی اور سناٹا تھا اور ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا، آژمیر نے گردن موڑ کر دوبارہ پارو کو دیکھا جو ہنوز اسی طرح بیٹھی تھی۔

''میں نے تو سنا تھا تم بارش میں بھیگنا اپنا فرض سمجھتی ہو لیکن ذرا سی بارش سے تم اس حال تک پہنچ جاؤ گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔'' اس کی بات پہ پارو نے سلگ کر اسے دیکھا۔

''میں بارش کی وجہ سے بیمار نہیں ہوئی۔''

''تو پھر کس وجہ سے بیمار ہوئی ہو؟'' برجستہ جواب کا برجستہ سوال اٹھا تھا پارو سٹپٹا گئی وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا

''مجھے کوئی نیند سے جگا دے، میری آنکھیں دکھنے لگتی ہیں اس لئے مجھے بخار ہو جاتا ہے اس دن اماں نے دروازہ کھولنے کے لئے مجھے جگا دیا تھا اور......''

''اماں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ دروازہ کھولنے کے بعد دوبارہ سونا مت......'' آژمیر نے اس کی بات کاٹ کے جن نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اس پہ پارو کا جسم آگ کی طرح تپنے لگا تھا بخار کی حد کراس ہو چکی تھی اس کی خوبصورت موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی تھی اس نے ضبط کرتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں۔ تب تک قمر النساء بھی گھر میں داخل ہو چکی تھیں اور شنو بھی چائے لے کر آ گئی۔ آژمیر کو دیکھ کر اماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور اس خوشی میں اچانک ربیعہ اور اس کا شوہر بھی شریک ہو گیا تھا صفیہ، ربیعہ، اماں اور ربیعہ کا شوہر حماد بھی آژمیر کو شادی کے بعد پہلی بار دیکھ کر کافی خوش ہوا تھا اماں نے کھانے کی تیاری کرنا چاہی تو اس نے روک دیا۔

''نہیں خالہ میں اسے لینے آیا ہوں کھانا ہم گھر جا کے کھائیں گے ویسے بھی ابھی بھوک نہیں ہے۔'' پارو نے اس کی آمد کا مقصد سنا تو تلملا اٹھی (میں جانتی ہوں کس دل سے لینے آئے ہو یقیناً اماں نے منتیں کر کے بھیجا ہو گا اتنے نیک تم خود کبھی ہو ہی نہیں سکتے) اسے غصہ آ رہا تھا پھر بھی مجبوراً چپ ہی رہی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے تم کھانا کھائے بغیر چلے جاؤ بلکہ میں تو کہتی ہوں آج رات ہمارے پاس ہی رکو میرا دل بھی ٹھنڈا ہو گا کہ میرا بھانجا میرا پتر آیا ہے۔'' انہوں نے آژمیر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ اتنے اصرار پہ انکار نہیں کر سکا تھا اس لئے کھانے کی ہامی بھر لی البتہ رات وہ گھر ہی جانا چاہتا تھا اس عرصے میں پارو چپ چاپ بیٹھی رہی مگر ایک بات پہ بُری طرح

چونک گئی تھی ربیعہ کا ڈیڑھ دو سالہ بیٹا کھیلتے کھیلتے آژمیر کے قدموں کے پاس آ گیا تھا بجائے اس کے کہ وہ اسے پیار کرتا بہلاتا اس نے ناگواری سے یکدم اپنے قدم پیچھے کر لئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی ٹانگوں کو تھام کے سہارا لیتا کھڑا ہو گیا تھا......

''ما...... ماں...... ماموں......'' وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آژمیر کی گھٹنے پہ ہاتھ مار رہا تھا اور آژمیر کی رنگت بدلتی جا رہی تھی ماتھے پر شکنوں کا جال اور چہرے پہ اذیّت کا احساس تھا۔

''پلیز اسے ربیعہ کے پاس لے جاؤ۔'' اس نے بے اختیار حماد سے کہہ دیا اور پارو ٹھٹک گئی۔ کیونکہ آژمیر کے انداز میں ایک غیر معمولی احساس تھا ایسا احساس جس سے نفرت اور اذیّت کا عکس دکھائی دے رہا تھا حماد سمجھا آژمیر کپڑے خراب ہونے کے خیال سے کہہ رہا ہے اس لئے بچے کو اپنی سمت کھینچ لیا مگر بچے کا ذہن معصوم اور ضدی تھا اس لئے دوبارہ لپک کے اپنے ''اجنبی ماموں'' کے قریب آیا لیکن اب کی بار وہ مضطرب سا ہو کے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

''حماد گاڑی میں کچھ سامان رکھا ہے وہ اتروانا ہے کسی کو بلا دو۔'' آژمیر نے وہاں سے ہٹنے کا بہانہ کیا مگر پارو دم بخود بیٹھی یہ سچویشن سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پھر بھی سمجھ نہ پائی کہ آژمیر حیات نے ایک بچے کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ حالانکہ حمزہ کافی گول مٹول اور پیارا بچہ تھا پارو اکثر ملنے پہ اس کے ساتھ لگی رہتی تھی مگر آژمیر نے تو حد کر دی تھی۔

واپسی پہ گاڑی میں دونوں طرف خاموشی ہی چھائی رہی آژمیر آنے سے قبل ربیعہ اور صفیہ کو بطور کزن شاپنگ کے لئے کچھ رقم دے کر آیا تھا وہ دونوں تو انکار کر رہی تھیں قمر النساء نے ہی رکھ لینے کا اشارہ کیا تھا مگر گاڑی کا لاک کھولتے کھولتے وہ پلٹ کر دوبارہ ربیعہ کے پاس گیا تھا۔

''یہ اپنے بچے کو شاپنگ کروا دینا اس نے مجھے ماموں کہا ہے......'' وہ کہہ کر رکا نہیں اور ربیعہ ہاتھ میں پکڑے نوٹ دیکھتی رہ گئی یہ آژمیر بھی بڑا عجیب ہے اتنا بے مروّت ہو کر بھی بے مروّت نہیں لگتا نہ جانے کیوں دور دور رہتا ہے؟'' وہ اس کی گاڑی کے اوجھل ہوتے ہی حیرت کا اظہار کر رہی تھیں اور پارو گاڑی میں بیٹھی بھی اسی کے رویے کو سوچ رہی تھی جس نے حمزہ کو ہاتھ لگانا اور پیار کرنا گوارا نہیں کیا تھا......

❁......❁......❁

اس دفعہ آژمیر کافی دن رہ کر واپس شہر گیا تھا اماں بھی اس دفعہ خوش تھیں البتہ پارو کا

مزاج آژمیر سے اکھڑا اکھڑا تھا شاید دسمبر کی سردی کا اثر تھا ہر چیز ہی بوجھل بوجھل سی تھی اماں گندم اور دالیں پیس کر نشاستہ بنانے میں مصروف تھیں اور پارو دن بھر کام نپٹانے کے بعد خاموشی سے لیٹی رہتی تھی اور ایسے میں ایک ہفتے بعد ہی دوبارہ آژمیر گاؤں آیا تو سب کو حیرت ہوئی مگر اس دفعہ اس کے ساتھ ساجدہ آپا اور ان کے بچے بھی تھے ساجدہ آپا ملتان بیاہی گئی تھیں بچوں کی دسمبر کی چھٹیاں ہوئیں تو لاہور گھومنے چلے گئے مگر لاہور سے آژمیر ان کو گاؤں لے آیا تھا کچھ دیر میں ہی پورے گھر میں رونق لگ گئی۔

''بچوں سے گھر بھرا پڑا لگتا ہے۔ اللہ میری پارو کی گود ہری کرے۔'' اماں نے صدق دل سے دعا کی لیکن آژمیر پہلو بدل کے رہ گیا تھا اور پارو اس دعا پہ جھجک سی گئی مگر آژمیر پہ نظر پڑتے ہی چند روز پہلے والی حیرت دوبارہ عود کے آئی تھی نہ جانے کیوں بچوں کو دیکھ کر اور ان کا ذکر سن کے اس کے چہرے کے زاویے بگڑ جاتے تھے ایک بے حد سرد و سپاٹ کیفیت پھیل جاتی تھی اور اس کی یہ کیفیت تین ماہ بعد اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔

''پارو......'' وہ یکدم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دھاڑا۔ وہ گھبرا کر پلٹی ملک آژمیر حیات دہکتی سرخ آنکھوں سے اسے ہی بھسم کر رہا تھا یقیناً وہ ابھی ابھی شہر سے آیا تھا اسے شہر گئے ہوئے بیس دن ہو چکے تھے اور یوں اچانک اس طرح غصے میں دیکھ کر وہ سچ مچ بوکھلا گئی تھی آخر پہلی بار وہ اسے اس طرح مخاطب کر رہا تھا۔

''کیا ہوا خیر تو ہے؟'' پارو نے تہ کئے ہوئے کپڑے بیڈ پہ رکھ دیئے۔

''میں اماں سے کچھ سن کے آ رہا ہوں کیا یہ سچ ہے؟''

وہ قریب آ کے پارو کے گداز بازو دبوچ چکا تھا۔ وہ اس کی اتنی سخت گرفت اور جارحانہ تیوروں سے الجھ گئی۔

''کیا سن کے آ رہے ہیں؟''

''کہ تم پریگنینٹ ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا اور جواباً ایک سیکنڈ میں پارو کی پلکیں جھک گئیں کیونکہ یہی سچ تھا اور یہ سچ آژمیر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟'' اس نے پارو کو یکدم جھنجھوڑ کے کہا اور وہ اس کے اس قدر وحشی پن سے تڑپ اٹھی تھی۔

''کیا پوچھ رہے ہیں؟''

"جو کچھ تم سن چکی ہو۔"

"اور جو کچھ آپ بھی سن چکے ہیں وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔"

"یعنی اماں کی بات سچ ہے۔" وہ سختی سے بولا۔

"اماں جھوٹ کیوں بولیں گی؟"

"مگر مجھے یہ سچ گوارا نہیں۔" آژمیر کا سخت لہجہ انتہائی پتھریلا لگ رہا تھا۔

"کیوں؟" بے ساختہ پارو نے کیوں کا لفظ اٹھا دیا۔

"کیونکہ مجھے بچوں سے نفرت ہو چکی ہے میں بچوں کا وجود تو کیا ان کا نام بھی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ بچوں کی وجہ سے رینا مجھ سے چھن گئی ان ہی بچوں کی خواہش نے میری ہم سفر میری ساتھی کو مجھ سے دور کر دیا اس بچے کے لئے اس نے اتنا صبر اور انتظار کیا تکلیف دیکھی اور یہی بچہ اس کی جان لے گیا موت کے منہ میں دھکیل دیا؟ پارو ایسا نہیں ہو سکتا اگر رینا نہیں مل سکتی تو یہ بچے بھی مجھے منظور نہیں...... تمہیں چھٹکارا پانا ہوگا اس چکر سے۔" ملک آژمیر حیات نے پارو کے سر پہ بم پھوڑ ڈالے تھے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

(رینا کے لئے بچوں سے نفرت؟) اس کے لئے حیرت پہ قابو پانا مشکل ہو چکا تھا دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے اس وقت تو وہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی مگر جب رات کو دوبارہ آژمیر نے وہی قصہ دوبارہ چھیڑا تو وہ چپ نہ رہ سکی۔

"وہ مر گئی ہے تو اس کے لئے آپ خود کیوں نہیں مر جاتے کسی اور کا قتل کیوں کروا رہے ہیں؟"

"میں کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا تمہیں ہر قیمت پر میری بات ماننی ہوگی اس لئے صبح تمہیں میرے ساتھ شہر جانا ہوگا۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ڈبیا اور لائٹر سائیڈ ٹیبل پہ پٹخ دیئے۔

"آپ کے ساتھ جاتی ہے میری......" اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ سو رہا تھا جب پارو نے رو رو کر اپنی داستان اماں کے گوش گزار کر ڈالی تھی اور اماں نے دو تھپڑ مارتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ ڈالا تھا۔

"ہائے میں مر جاواں اپنی نسل ختم کرنا چاہتا ہے ہمارا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے ہائے ملک جی کدھر گئے؟"

وہ واویلا کر رہی تھیں وہ سو کر اٹھا تو گھر میں جیسے ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ سکا اور جب سمجھ آیا تو اس کا بھی دماغ گھوم گیا تھا۔

"بس اماں بہت ہو گیا میں شروع دن سے آپ کی یہ زیادتیاں سہتا آیا ہوں آپ نے ہمیشہ اپنی بہن اور بھانجی کی فکر کی، کبھی میرا احساس نہیں کیا ہمیشہ آپ کو اپنی اس جاہل گنوار اور بدتمیز بھانجی کی پروا ہوتی تھی آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں میرا بھی دل ارمان رکھتا ہے، میرا بھی دل چاہتا تھا مجھے پڑھی لکھی باادب اور تمیزدار بیوی ملے لیکن آپ نے زبردستی منگنی کر کے دم لیا میں خاموش رہا لیکن جب رینا کو لے کر آیا تو کیا تماشا لگوایا تھا، آپ نے مجھے بیوی سمیت گھر سے نکال دیا۔ بے شک میں نے یہ قدم آپ کے خلاف اٹھایا تھا لیکن لوگ اولاد کو معاف بھی تو کر دیتے ہیں مگر آپ پہ بہن کی بیٹی کا بھوت سوار تھا اور آپ کا یہی بھوت اور آپ سب کی آہیں اسے موت کے گھاٹ اتار گئیں، وہ تو وہ میرے پاس اس کی اولاد بھی نہ رہی اس کی جیتی جاگتی نشانی بھی مٹ گئی میرے ارمان جلا کر آپ اپنے ارمان پورے کرنا چاہتی ہیں ہونہہ ایسا کبھی نہیں ہوگا بلکہ ہو ہی نہیں سکتا اسے اگر میری بیوی بن کے اس گھر میں رہنا ہے تو میری بات ماننی ہوگی ورنہ طلاق دینا میرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔"

وہ قہر آلود لہجے میں کہتا پلٹ کر اندر چلا گیا وہ دونوں دم بخود بیٹھی تھیں۔

بات ملک ضمیر حیات تک جا پہنچی تھی انہوں نے آژمیر کو بلایا دونوں باپ بیٹا نجانے کتنی دیر بحث و تکرار میں لگے رہے دونوں آگ بگولا ہو رہے تھے لیکن جب دونوں بیٹھک سے باہر نکلے دونوں ہی چپ تھے۔ چپ خاصی گہری اور پرسوچ تھی اس لئے کسی نے بھی مداخلت نہیں کی مگر تنہائی میں اس نے پارو کو ایک بار متوجہ ضرور کیا تھا۔

"تم نے جو کرنا تھا کر لیا تمہیں اماں ابا کی شہ حاصل ہے لیکن ماہ پیکر بیگم اتنا یاد رکھنا آج کے بعد تمہیں میری بیوی نہیں اس بچے کی ماں بن کے رہنا ہے، میرا اور تمہارا تعلق صرف لوگوں کی نظروں تک ہے اور کہیں نہیں اور ہاں اپنے بچے کی ولدیت کے خانے میں تو تم میرا نام لکھ دو گی مگر میرے دل میں اپنے بچے کا نام کبھی نہیں لکھ سکو گی بلکہ اس کوشش میں تم اپنا آپ مٹا چکی ہو۔"

شہر جانے سے پہلے جو کچھ اس نے کہا تھا پارو کو اچھی طرح یاد تھا اور سچ مچ آژمیر پہلے سے زیادہ دور اور اجنبی ہوتا گیا تھا گزرنے والا وقت اس کی اجنبیت اور بیگانگی میں اضافہ کر رہا تھا۔

پارو کے ہاں دو جڑواں بیٹے ہوئے تھے جن کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی جارہی تھی، بچوں کا اور پارو کا صدقہ بھی دیا تھا، آج قمر النساء اور فخر النساء دونوں بہنوں کے پاؤں زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے خاندان بھر سے مبارک دینے کے لئے عورتیں آرہی تھیں۔ گھر میں گہما گہمی تھی لیکن اس سارے ہنگامے میں صرف آژمیر حیات کی کمی تھی جس کو جڑواں بیٹوں کی اطلاع ملی مگر پھر بھی دل میں نرم نرم پیار یا احساس نے کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی اور انتہائی سنجیدگی اور لاپروائی سے اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا دیا تھا۔

''اماں! آژمیر نہیں آیا؟'' ساجدہ آپا نے چپکے سے استفسار کیا۔

''نہیں۔'' انہوں نے لاپروائی سے کہتے ہوئے مٹھائی ٹرے میں رکھ کے اوپر جالی دار کپڑا اوڑھا دیا۔

''آپ نے بتایا تھا اسے؟''

''دیکھ ساجدہ مجھ سے باتیں نہ کر۔ ہم نے بتانا تھا بتا دیا اب وہ نہیں آنا چاہتا تو نہ آئے میں اپنے پوتوں کی خوشی اس کی فکروں میں لگ کے خراب نہیں کرنا چاہتی......''

''ہائیں؟'' ساجدہ کو حیرت ہوئی اماں کے انداز ہی بدل گئے تھے۔

''اماں یہ آپ کے پوتے بھی تو اسی کے بیٹے ہیں۔''

''بس بس مجھے سبق نہ پڑھا جانتی ہوں اسی بے غیرت کے بیٹے ہیں پر اس جیسے نہیں ہیں سمجھی؟'' اماں ٹرے لے کر باہر چلی گئیں۔

اماں تو بیٹے کی طرف سے بے فکری ہو گئی تھیں لیکن ساجدہ آپا سے ایسا نہیں ہو رہا تھا انہوں نے اپنے شوہر کو بلوایا اور آژمیر کو فون کر کے آنے کا اصرار کیا تھا یہ بہنوئی کا لحاظ اور مروت ہی تھا کہ اس نے آنے کی حامی بھر لی اور شام ڈھلے وہ گھر آ گیا تھا۔ ماہین جو آژمیر کی اتنے اہم موقع پہ غیر موجودگی سے بے پناہ خوش تھی یکدم بجھ سی گئی۔ پارو نے دونوں بچوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر جیسے ان سے عزم لیا تھا پھر چہرے پہ کلائی رکھ کے لیٹ گئی۔

''ملک صاحب آپ کی چائے۔'' پارو کی کھنکتی آواز پہ وہ بُری طرح چونکا اور پلٹ کر دیکھا وہ کپ اس کی سمت بڑھا رہی تھی۔ چہرے پہ دلکشی بکھری تھی جلد کی چمک دمک میں اضافہ ہو چکا تھا ماتھے پہ تیوری کے بجائے ہونٹوں کی سرخیوں میں مسکراہٹ رچی ہوئی تھی۔ وہ بچوں کی پیدائش کے بعد پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا اسے پانچ چھ دن ہو چکے تھے آئے ہوئے لیکن ایک بار

بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا تھا، آج اس نے نسرین سے چائے بنانے کا کہا اور خود چھت پہ آ گیا تھا مگر چائے پارو لے کر آئے گی وہ بھی اتنے فریش اور دل جلا دینے والے انداز میں اسے امید نہ تھی۔

''ملک صاحب یہ چھت ہے کج (کچھ) شرم کرو۔'' اس نے جان بوجھ کے اسے چھیڑا اور آژمیر کے چہرے پہ غصے کی لالی اترنے لگی۔

''جانتا ہوں یہ چھت ہے لیکن تم شاید بھول رہی ہو کہ یہ چھت ہے اپنا حلیہ دیکھا ہے۔'' وہ برہم ہوا پارو کا دوپٹہ سرکا ہوا تھا اور موٹی چوٹی آگے جھول رہی تھی۔

''میرا حلیہ تو صرف آپ کے سامنے ہے ملک صاحب اور میں شادی شدہ بال بچے دار بھی ہوں پر آپ کی چچیری بہن تو کنواری ہے اس کے حلیے دیکھے ہیں کبھی؟...... چلتی ہوں اب۔'' وہ ابروؤں سے اشارہ دے کر پلٹی اور چوٹی کو گھما کے پیچھے اچھالا جو سیدھی آژمیر کے چہرے پر پڑی اور اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ بھی ہل کے رہ گیا تھا وہ اس حملے سے سنبھلا تو نظر سیدھی ماہین پہ گئی جو کن اکھیوں سے ادھر ہی متوجہ تھی۔ آژمیر پارو کی حرکت پہ تلملا اٹھا تھا لیکن وہ نیچے جا چکی تھی۔

''اس وقت چائے کیوں پی رہے ہیں؟'' ماہین قریب آ گئی دونوں گھروں کی چھتیں جڑی ہوئی تھیں البتہ درمیان میں چھوٹی سی دیوار تھی ماہین اسی دیوار کے پاس آ رکی تھی۔

''دن میں سویا نہیں سر درد کر رہا ہے۔''

''تو پارو سے کہتے نا۔ وہ سر دبا دیتی۔'' ماہین نے تیل چھڑکا۔

''ہونہہ پارو۔'' وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔

''ویسے بڑا پیار ہے پارو سے جب بھی یاد کرتی ہے آ جاتے ہو۔'' ماہین نے ایک اور تیر پھینکا۔ آژمیر نے الجھن بھری نظروں سے ماہین کو دیکھا۔

''بھئی میرے سامنے تو ہمیشہ یہی ہوا ہے جب بھی پارو سے پوچھا آژمیر کب آئے گا جواباً وہ کہتی ہے آج کل میں آ جائے گا اور سچ مچ تم آ جاتے ہو کہیں فون وغیرہ پہ پہلے سے طے تو نہیں کر لیتے؟'' ماہین کا انداز دلچسپی اور کچھ استہزاء لئے ہوئے تھا۔ آژمیر کو ناگوار گزرا تھا۔

''ہو بھی سکتا ہے ویسے آپ اس وقت چھت پہ کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے تیکھے پن سے دریافت کیا تو ماہین ہلکے سے مسکرا دی۔

"تمہیں دیکھ کر آئی تھی، سوچا تھوڑی دیر تم سے باتیں ہی کر لوں نیچے تو ہر وقت پارو اور تائی کی گھوریاں ہی ختم نہیں ہوتیں......"

ماہین کے بدلے بدلے تیور اور لب ولہجہ آژمیر کو اچھا نہیں لگ رہا تھا اسی لئے بہت جلد خالی کپ ہاتھ میں لئے نیچے اتر گیا تھا جو بات ابھی تک آژمیر نہیں سمجھ سکا تھا وہ بات پہلے روز ہی پارو نے چند سیکنڈز میں محسوس کر لی تھی۔ وہ خالی کپ برآمدے میں رکھی میز پہ رکھ کے اندر آیا تو پارو کو اپنے بچوں کے ساتھ مصروف دیکھ کر دوبارہ کمرے سے نکل گیا اسے اس سارے ماحول سے ہی چڑ ہونے لگی تھی۔ کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جس سے تھوڑی دیر کے لئے دل کو سکون مل سکتا یا پھر دل بہلانے کا سامان ہو سکتا اسی لئے وہ واپس جانے کا سوچ رہا تھا۔

آج ابا پٹواری سے کچھ کاغذات لے کر آئے تھے شاید کسی زمین یا پھر مکان کے پیپر تھے جو آکر پارو کو دیئے۔ لیکن وہ کپڑے دھو رہی تھی اس لئے کہہ دیا کہ رکھ دیں بعد میں سنبھال کے رکھ دوں گی مگر ابا کچھ کام کرنے کے عادی نہیں تھے اس لئے تمام کاغذات آژمیر کو تھما دیئے۔

"جاؤ تم ہی الماری میں رکھ آؤ اب میں کہاں ہاتھ میں پکڑ کے بیٹھا رہوں۔"

مجبوراً آژمیر کو اٹھنا پڑا اور اندر آکر اپنی اور پارو کی مشترکہ الماری کھولی کاغذات رکھنے کے لئے اس نے مختلف خانے کھولے اور ایک میں اور بھی کاغذات دیکھ کر رک گیا تھا لیکن جو پیپر آژمیر کے ہاتھ لگے وہ اس کے لئے حیرت انگیز انکشاف سے کم نہیں تھے اس کی آنکھیں بے یقین تھیں۔

"پارو اور بی اے کی ڈگری؟ یہ مر کے بھی نہیں ہو سکتا۔" اس نے اپنی بصارت کو دھوکہ سمجھنا چاہا مگر ان پہ دستخط اور کالج کی مہریں اس سچائی کا ثبوت پیش کر رہی تھیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سچ کو ماننے پہ مجبور ہو رہا تھا۔

"اوہ میرے خدایا یعنی وہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ایسی اجڈ گنوار بنی ہوئی ہے اس نے کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ بھی کچھ سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔"

آژمیر الماری بند کرتے ہوئے حیرت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیوانہ ہو رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا تو پارو کو صحن کے ایک کونے میں بندھی بکریوں کا دودھ نکالتے ہوئے دیکھا۔

آژمیر کو یکدم دماغ چکراتا ہوا لگا وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا صحن میں بچھی چارپائی پہ آ بیٹھا۔ پارو دودھ نکالنے کے بعد کچی مٹی کا برتن لے کر تین چار بلیوں کے آگے دودھ ڈال رہی تھی اور یہ یقیناً اس کا معمول تھا کیونکہ بلیوں کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس خوراک کی عادی ہیں ایک بلی کے ساتھ اس کے بچے بھی تھے دودھ پیتے ہوئے کافی خوش ہو رہے تھے اور پارو ان کو دیکھ کر خوش ہوتی رسوئی میں چلی گئی۔

"اماں دال کے ساتھ چاول بنا لوں یا روٹیاں ہی ٹھیک ہیں؟" اس نے اونچی آواز سے پوچھا اماں وضو کر کے نکلی تھیں۔

"پتر چاول تو ابھی کل کھائے تھے روٹیاں ہی بنا لے۔" اماں کی تھکی تھکی آواز آئی۔

آج وہ دوسرے گاؤں کسی فوتگی پہ اظہار تعزیت کے لئے گئی تھیں اس لئے مزاج دھیما ہی تھا۔ پارو نے رسوئی کے باہر برآمدے کے ستون کے قریب آٹا رکھا چنگیر اور آٹے کی پرات رکھی دوپٹہ عام دیہاتی عورتوں کی طرح سر پہ باندھا اور آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ صحن میں ایک دم خاموشی چھا گئی، صرف پرندوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آژمیر نے بے ارادہ ہی پارو کی سمت دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

چاندی کے گول گول جھمکے بار بار اس کے اناری رخساروں کو چھو کر سرشار ہو رہے تھے۔ آژمیر سچ مچ محو سا ہو گیا تھا اس نے پارو کو ہر زاویے سے دیکھ ڈالا لیکن وہ لاپروائی سے کام کرتی رہی۔

اماں گھر پہ نہیں تھیں ابا اپنے کمرے میں لیٹے تھے پارو دونوں بچوں کو سلا کر خود نہانے چلی گئی ابھی اسے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ چھوٹے صاحبزادے نے رونا شروع کر دیا اور اتفاقاً آژمیر اسی وقت کمرے میں داخل ہوا تھا بچے کے رونے کی آواز پہ بے ساختہ گردن موڑ کے دیکھا، دونوں جھولے میں سو رہے تھے لیکن جھولا رکا ہوا تھا اور ایک بچہ رو رہا تھا اس نے کچھ دیر رک کر دیکھا اور سوچا کیا کیا جائے وہ آگے بڑھ کر اسے اٹھا لے یا پھر یونہی چھوڑ کر چلا جائے مگر فیصلہ ذرا سا مشکل تھا پھر بھی اس نے مشکل فیصلہ ہی کیا اور کمرے سے نکل جانا بہتر لگا جیسے ہی قدم واپسی کے لئے موڑے بے اختیار اپنی جگہ پر جم سے گئے اس کے رونے میں اضافہ ہو چکا تھا اور نجانے کیوں اس کے قدم جھولے کی سمت اٹھتے گئے قریب آ کر اس نے بچے کو اٹھا لیا اور پھر اپنے آپ کو اسے پیار کرنے سے نہ روک سکا تھا اسے گالوں پہ ہونٹوں پہ آنکھوں پہ

پیشانی اور بالوں پہ والہانہ بوسے دیتا آژمیر اگلے پچھلے پیار کی شدت پوری کر رہا تھا اور بچہ روتے روتے اس قدر پیار اور شدت پہ سہم گیا تھا تب تک دوسرا بھی اپنے بھائی کی تقلید کر چکا تھا اور آژمیر دونوں کو بیک وقت بازوؤں میں لے کر بیڈ پہ آ گیا دونوں بچے اس کے نین نقوش چرا کے لائے تھے۔مکمل آژمیر کی تصویر تھے وہ ان کو دیکھتے ہوئے دل کھول کر مسکرایا اپنی شکل و صورت کی جھلک اتنی مشابہت اپنے بچوں میں دیکھنا سرشاری اور فخر سے کم نہیں تھا، وہ بے اختیار انہیں سامنے لٹائے پیار کیے جا رہا تھا اور اندر داخل ہوتی پارو یہ منظر دیکھ کے ٹھٹک گئی تھی۔اس نے مسکراہٹ روکی اور دبے قدموں سے واپس ہی پلٹ گئی۔

''اماں ادھر آ......'' پارو ڈیوڑھی میں داخل ہوتی اماں کو دیکھ کر بھاگ کر قریب آئی۔

''اللہ خیر کرے کیا ہوا؟''

''اماں! آ کے اندر دیکھ کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے دبے قدموں اماں کو دروازے سے جھانکنے کا کہا۔آژمیر اپنے بیٹے کے چھوٹے چھوٹے سرخ سفید ہاتھ چوم رہا تھا۔

''ہائیں؟'' وہ اُچھل پڑیں۔

''چپ اماں چپ۔'' پارو ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ابا بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔

''ابا ادھر آؤ۔'' پارو انہیں بھی کھینچ لائی ابا کی بھی آنکھیں کھل گئیں، آژمیر نے دو ماہ بعد اپنے بیٹوں کو دیکھا تھا اس لئے پیار بھی دو ماہ کے حساب سے ہو رہا تھا۔

یونہی ان کے ساتھ کھیلتے کھیلتے آژمیر خود بھی سو گیا تھا اور شام تک وہ تینوں کافی سکون بھری نیند سوئے رہے۔آژمیر کی آنکھ کھلی تو پارو کو صوفے پہ سوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور ساتھ ہی کچھ خجل بھی ہوا دونوں بچے اس کے دائیں بائیں جو سو رہے تھے نفرت اور کوفت کا دور دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا مگر پھر بھی اپنی بات پہ قائم رہنے کا دکھاوا ضروری تھا اسی لئے پارو بے دار ہوئی تو اسے جھڑک دیا۔

''اس کمرے میں رہنا چاہتی ہو تو اپنے بچوں کو سنبھال کے رکھو، مجھے ہر وقت بچوں کا رونا دھونا پسند نہیں ورنہ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لو۔'' خفگی کا بھرپور اظہار کیا جا رہا تھا۔

''میں تو ٹھکانہ کر ہی لوں مگر میرے شیر جوان کہتے ہیں اماں کبھی اپنی جگہ مت چھوڑنا لوگ قبضہ کر لیتے ہیں۔'' پارو غسل کر کے آئی تھی اس لئے ابھی تک بال کھلے تھے، گھنے سیاہ

چمکدار بال چوٹی سے آزاد ہو کے اور زیادہ حسین لگ رہے تھے وہ اپنے بالوں کو سلجھاتی ہوئی ذرا اترا کے بولی تھی، آژمیر اس کے قریب آ گیا اس نے پارو کو اپنے قریب کرنا چاہا مگر وہ چار قدم دور ہٹ گئی تھی۔

''نہیں ملک صاحب! آپ نے خود ہی کہا تھا میں آپ کی بیوی نہیں اب اپنے بچوں کی ماں بن کے رہوں گی میرا اور آپ کا تعلق صرف لوگوں کی نظروں تک ہے۔''

پارو کا یہ وار بھی بڑا کاری تھا۔'' وہ تلملا کے رہ گیا تھا۔

''مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارے قریب آنے کا۔''

''شوق تو بہت ہیں ملک صاحب۔'' اس نے مزید ہوا دی، آژمیر نے غصے میں اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔

''تم آخر چاہتی کیا ہو؟'' اس نے غرا کے پوچھا جواباً پارو کلائی کی تکلیف کے باوجود کھلکھلا اٹھی تھی اس کا دلکش قہقہہ آژمیر کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش اور بڑھا گیا تھا۔

''آپ کو تڑپانا چاہتی ہوں ملک صاحب کیونکہ آپ کی تڑپ بڑی اچھی لگتی ہے مجھے، آپ تڑپتے ہوئے بہت پیارے لگتے......'' پارو آج سچ مچ اسے تپا رہی تھی۔آژمیر اس کی باتوں اور حرکتوں کے شکنجے میں آتا جا رہا تھا وہ جو پارو سے عمر بھر جنگ کرنا چاہتا تھا ہمیشہ دنگا فساد چاہتا تھا وہ ابھی سے اپنے ہتھیار ڈالنے لگا تھا اسے احساس ہو چکا تھا کہ جھگڑوں، نفرتوں اور کدورتوں میں کچھ نہیں رکھا زندگی، زندگی کا احساس اور زندگی کے سب رنگ صرف اور صرف محبتوں میں ہیں یہ محبتیں ہی ہیں جو انسان کو قدم قدم پہ روک کے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے سوچنے سمجھنے اور ساتھ چلنے والوں کی قدر کرنا سکھاتی ہیں...... پارو کو بغور دیکھتے ہوئے غصے اور خفگی کے باوجود آژمیر نے اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔

اور پہلی بار آژمیر کے لمس میں محبت کی نرمیاں اور مہک محسوس کر کے بے اختیار پارو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ نوجوانی میں قدم رکھتے ہی اس کی محبت گلے لگا بیٹھی تھی اور اس محبت کو دل میں دبائے ہوئے اس نے نجانے کون کون سے نشتر کھائے تھے، پہلے ٹھکرائے جانا پھر اس کی بے رخی ناقدری پھر غصہ اور نفرت بھی دیکھنا پڑے تھے اور اس سب کے ساتھ اپنے آس پاس کے لوگوں کو مطمئن بھی رکھنا کہ میں بہت خوش ہوں کافی حوصلہ طلب کام تھے پھر بھی وہ کرتی آئی تھی، اس پہ یہ احساس بھی کہ وہ اسے نہیں رینا کو چاہتا ہے اور رینا کی چاہت میں

اسے اپنے بچوں کی بھی پرواہ نہیں تھی، وہ اولاد جیسی نعمت سے بھی منہ موڑنے کو تیار تھا لیکن پارو کے لئے یہ نعمت محبت کا سب سے پہلا اور انمول تحفہ تھی اس لئے وہ آژمیر سے ٹکر لینے پہ تیار ہو گئی تھی اور آج جب اسی نعمت اسی تحفے کو آژمیر نے گلے لگایا تھا وہ روح تک شانت ہو گئی تھی اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی محبت اور اس کی ممتا جیت گئی ہے اسی لئے ہزاروں شکوے ہونے کے باوجود بھی وہ مطمئن اور پرسکون تھی لیکن پھر بھی چند موتی ایسے بے تاب تھے جو آژمیر کے سینے کو بھگو گئے تھے۔

''پارو تم بہت اچھی ہو۔'' وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھنسا کر اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ وہ بہت مدہم آواز سے رو رہی تھی۔

''میں بہت پہلے سے تمہارا دیوانہ تھا شاید تب سے جب تمہیں پہلی بار پارو کہا تھا یا پھر تب سے جب جب تمہیں میرے پاس آنا اور میرے ساتھ کھیلنا بھی پسند نہیں تھا جب تمہیں بولنا بھی نہیں آتا تھا میں ہمیشہ تمہاری طرف لپکتا تھا اور تم ہمیشہ مجھ سے دور بھاگتی تھیں تمہارا رویہ ایسا ہی رہا تو میں اپنے آپ کو روکنے لگا میرا تمہاری طرف لپکنا کم ہونے لگا اور ربیعہ کی شادی پہ تو میں سچ مچ تمہیں دل سے نکال بیٹھا تھا۔

تم نے اپنی سہیلیوں کے سامنے مجھے بے قدر اور غیر اہم کر دیا تھا بلکہ میری توہین میں ذرا کسر نہیں چھوڑی تھی تب میرا دل تمہارے خلاف ہونے لگا میں نے منگنی سے انکار کر دیا لیکن اماں باز نہیں آئیں اور میں انگلینڈ جانے کے بعد بھی تمہارا توہین آمیز انداز نہیں بھول پایا تھا اس لئے رینا کی ذرا سی توجہ بھی محبت لگنے لگی اور اپنے احساسات کو بھی محبت کا پہناوا پہنا دیا لیکن درحقیقت میں تم سے بدلہ لے رہا تھا اسی لئے تو اچانک ہی رینا کو ساتھ لے آیا تھا تاکہ تمہیں پتہ چلے کہ میرے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے تم اکڑ دکھاؤ گی تو میرے لئے ہزاروں تیار ہوں گی، لیکن ان ہزاروں میں تم نہیں ہو گی میں یہ بھی جانتا تھا اور پھر رفتہ رفتہ مجھے رینا سے اپنائیت اور انسیت ہونے لگی وہ میرے لئے اتنی خوبصورت جگہ اتنے اچھے دوست اتنی پرکشش جاب اور اپنا فیوچر چھوڑ آئی تھی اس کی کیئر کرنا اس کے ساتھ نباہ کرنا میرا فرض تھا جو میں پورا کرتا رہا کبھی کبھی رینا کو تمہاری بہت فکر ہوتی تھی وہ تمہارا سوچ کر شرمندہ بھی ہوتی تھی لیکن میں نے کبھی اسے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔

ان ہی دنوں ہمیں اس کی پریگنینسی کا پتہ چلا ہم حقیقتاً بہت خوش تھے مگر جب جب

اماں ابا اور تمہارا خیال آتا میں بہت بوجھل ہو جاتا تھا اور وہ اپنی جگہ پہ مجرم بن جاتی تھی شاید اسی لئے بہت جلد سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔

پارو تمہارا مقام اپنی جگہ مگر رینا بھی میرے لئے بہت محترم ہے میں اس کا احسان مند ہوں اس نے میرا قدم قدم پہ خیال رکھا میرا احساس کیا ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب اماں نے دوبارہ شادی کا ذکر چھیڑ دیا جو مجھے اچھا نہ لگا اور پھر اماں کا تمہارے لئے اتنا پیار مجھے چڑ چڑا کرنے لگا تھا میری کیفیات اتنی عجیب تھیں کہ مجھے ہر چیز سے بے زاری ہونے لگی تھی۔

میں سمجھتا تھا اماں خوامخواہ تم سے اتنی محبت کرتی ہیں حالانکہ تمہیں کسی کی محبت کی کوئی پرواہ نہیں ہاں اگر تھوڑی سی بھی محبت اماں ابا نے رینا کو دی ہوتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی پہلے روز ہی اسے گھر سے نکال دینا مجھے بُرا لگا تھا اسی لیے مجھے تم سے بیر ہو گیا لیکن یہ بیر کب تک چل سکتا تھا شادی کے بعد تمہیں جتنا اپنے پاس دیکھتا میری سالوں سے پرورش پاتی محبت اتنی ہی جاگتی تھی اسی لئے زیادہ تر شہر میں ہی رہتا تھا تاکہ تمہیں بھی کچھ سبق چکھا سکوں مگر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا تم نے میری توجہ کی لگامیں کھینچنا شروع کر دی تھیں، میں قدم قدم پہ ڈگمگایا اور پھر ایک روز سچ مچ ہی ڈگمگا گیا......

پارو تم یقین کرو ہمیشہ تمہارے پاس آ کر میں نے اپنے آپ سے جنگ کی ہے، بہت مارا تمہاری محبت کو لیکن سچ کہتے ہیں محبت مر نہیں سکتی یہ صرف مارنے کے فن جانتی ہے، مرنا اس کی تقدیر نہیں کیونکہ محبت ایک بے وجود چیز ہے اور ہمیشہ وہی چیز مرتی ہے جس کا کوئی وجود ہوتا ہے محبت کا وجود نہیں اس لئے وہ مر نہیں سکتی وہ صرف روح ہے نظر نہ آ کر بھی اپنا آپ منوانے والی اور ہمیشہ وہی چیز فتح حاصل کرتی ہے جو نہ ہو کر بھی سب کچھ ہوتی ہے اور تمہاری محبت بھی میرے لئے سب کچھ تھی۔

اسی لئے آج فتح پا چکی ہے مجھے سچ مچ بچوں سے چڑ ہو چکی تھی ایک بچے کو تخلیق کرنے کی خاطر رینا جان سے گزر گئی۔ اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی اس تکلیف سے گزرو شاید میں اندر سے خوف زدہ ہو چکا تھا لیکن ان بچوں کو دیکھ کر میرے سارے خوف مٹ گئے ہیں بلکہ میرے کئی اور خدشات بھی ختم ہو گئے ہیں۔

میرے سینے میں سوئے ہوئے جذبات ان کی معصوم محبت نے جھنجھوڑ کے رکھ دیئے ہیں۔ میں نے آج ان کے سامنے اپنے سارے ہتھیار پھینک دیئے ہیں اور آج میں تم سے

معافی کا خواستگار ہوں پلیز مجھے معاف کر دو، میں نے ہمیشہ تمہیں ستانے کے لئے تمہیں اگنور کیا تمہاری محبت دل میں دبائے رکھی۔" آج اس نے حال دل صاف کہہ سنایا تھا اور پارو روتے روتے بے اختیار مسکرا دی۔ آژمیر نے اپنے سینے پہ سر رکھے مسکراتی ہوئی پارو کو حیرت سے دیکھا جو ابھی بھی آنسو بہا رہی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے وجہ پوچھی۔

"ملک صاحب اگر آپ نے میری محبت اپنے دل میں دبا کے رکھی تھی تو کونسا میں نے آپ کی محبت ختم کر دی تھی میں نے تو اس سے بھی زیادہ دبائی ہوئی تھی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ حیران ہوا......

"سچ پوچھو ملک صاحب! تم ربیعہ باجی کی شادی کے موقع پر بہت اچھے لگے تھے اور بقول شنو مجھے تم سے بہت پیار ہو گیا ہے۔ اسی لئے تو میں نے بھی ڈگری لی ہے آخر تم جو پڑھے لکھے تھے۔"

"کیا؟" آژمیر بدک گیا تھا۔

"پارو اور پیار؟ نہیں نہیں یہ سراسر جھوٹ ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا اور پارو اظہار کرنے کے بعد مطمئن کھڑی تھی۔

"جھوٹ بول رہی ہو نا؟"

"اللہ سوہنے دی قسم ملک صاحب آنکھوں سے دل تک اور دل سے زبان تک سچ ہے۔"

"لیکن میں نہیں مان سکتا۔"

"مان لو فائدے میں رہو گے۔" وہ اسے چھیڑنے لگی۔ آژمیر بے یقین تھا۔

"اچھا ادھر آؤ......" اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا پارو ذرا جھجکی پھر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ اس نے پارو کو قریب کر لیا۔ وہ الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگی، کچھ بول ہی نہ پائی۔

"اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تم میری ہی پارو۔" وہ مزید پھیلنے لگا تو پارو نے بھاگنے کا سوچا لیکن اب بھاگنا اتنا آسان بھی نہیں تھا ساری دوڑیں تو وہ اسے خود تھما چکی تھی۔

......❀......

ذاتِ بے ثبات

دل کی ویرانی کا یہ عالم تھا کہ پورا عالم ہی ویران اور اجاڑ نظر آ رہا تھا جدھر بھی نظر دوڑاتی کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور دکھائی دیتا بھی کیوں اس دنیا کو برباد تو اس نے خود کیا تھا۔

ایک جیتے جاگتے دل کو اجاڑا تھا، تباہ کیا تھا اور وہ تباہ ہو گیا تھا اجڑ گیا تھا اب اس ویرانی پر ملال کیسا؟ اب پچھتانے سے کیا حاصل؟ اب تو سب کچھ راکھ ہو چکا تھا لیکن شاید وہ پچھتا بھی نہیں رہی تھی اور اسے ملال بھی نہیں تھا وہ تو بس بے حس بنی بیٹھی تھی اس کا وجود مردہ ہو چکا تھا بالکل سرد پانی جیسا ہر چیز سے عاری بالکل سپاٹ۔

گھر میں چند افراد کو اس کی اس کیفیت پر حیرانی ہوئی تھی لیکن ظاہر نہیں کیا تھا البتہ ایک بھرجائی تھیں جنہیں کوئی حیرانگی نہیں تھی بلکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ کیوں ساکت جھیل کی مانند ہو چکی ہے وہ کیوں برف بن گئی ہے اور کیوں دنیا سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی کٹ گئی ہے انہیں معلوم تھا اس منجمد جھیل کے ٹھہرے پانیوں میں کوئی کنکر گرے گا تو ہی وہ منتشر ہو گی تب ہی اس کی ذات میں اضطراب اترے گا یہ برف تب ہی پگھلے گی جب اس پہ درد کا سورج دہکے گا اور آج ایسا ہو گیا تھا۔

بہت دنوں سے ایک ہی کیفیت ایک ہی حالت میں بیٹھے بیٹھے وہ پتھر کی ہو چکی تھی جب بھرجائی اسے زبردستی سہارا دے کر نیچے لے آئیں، سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑائے۔ بھرجائی نے اسے مزید مضبوطی سے تھام کر گرنے سے بچا لیا مگر ڈرائنگ روم تک آتے آتے اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی وہ اُن سے بازو چھڑا کر باتھ روم کی سمت لپکی اس کی ابکائیوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی گل جانی نے بھرجائی کو اور بھرجائی نے گل جانی کو جن نظروں

سے دیکھا ان کا مفہوم بہت خوش آئند تھا تھوڑی دیر بعد وہ بمشکل ڈرائنگ روم تک آئی اور صوفہ کم بیڈ پہ نڈھال ہو کے گر گئی اس کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''ارے بچہ ٹھیک تو ہے؟'' گل جانی تسبیح کو بوسہ دے کر اٹھیں اور اس کے قریب آ گئیں لیکن وہ کچھ بھی دیکھنے اور سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور ہاتھوں کی لرزش بھی واضح محسوس ہو رہی تھی۔

''ارے دیکھو یہ تو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' گل جانی نے اسے ہاتھ لگایا۔ تب تک وہ ہوش سے بیگانہ ہو چکی تھی ان سب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے گھبرا کر مردان خانے میں فون کھڑکا دیا تھوڑی دیر بعد زریاب آفریدی ڈاکٹر کو بلا چکے تھے اور جو خوشخبری سننے کو ملی اس سے پوری حویلی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن اس جھیل کے ٹھہرے پانیوں میں اضطراب کا پتھر پڑ گیا تھا اس کی لہریں منتشر ہو گئی تھیں وہ اس خوشخبری پر کسی لاوے کی طرح پھٹ پڑی تھی اس کا جمود ٹوٹ گیا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے...... اب، اب اِس کی کس کو ضرورت ہے؟ اب کیا بچا ہے اس کے لئے؟ میں نے کیا چھوڑا ہے اس کے لئے، باپ تو پہلے ہی چھین چکی ہوں اور کیا دوں گی اس کو؟ کیا رہ گیا ہے اس کے لئے ایک قاتل ماں؟'' وہ یکدم چلا اٹھی تھی سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''دیکھو بیٹا اس میں تمہارا قصور......''

''بھرجائی میرا ہی تو قصور ہے میں ہی تو قاتل ہوں، میں نے ہی تو قتل کیا ہے۔ میں نے مارا ہے اسے، میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا بھرجائی میں نے خود مار دیا اسے قتل کر ڈالا اسے۔'' وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی وہ تڑپ رہی تھی اتنے عرصے بعد برف پگھلی تو غم کی آگ دہک اٹھی تھی اور اسے قابو کرنا اختیار سے باہر لگ رہا تھا۔

''پتر اسے کمرے میں لے جا اور کچھ کھلا دے ڈاکٹر کہہ رہی تھی اس کی یہ حالت بھوک کی وجہ سے ہوئی ہے۔'' گل جانی کافی متفکر تھیں، بھرجائی کو ہدایت دینے لگیں جبکہ وہ ان کے بہلاوے اور باتوں میں آنے والی نہیں تھی، تڑپ تڑپ کے روتے ہوئے وہ نڈھال ہو گئی تھی لیکن بھرجائی اسے سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھیں۔ انہیں تو بہت دنوں سے ہی اندازہ تھا کہ جب یہ آتش فشاں پھٹے گا تو بہت تباہی ہو گی وہ پاگلوں کی طرح ان کے ہاتھوں

سے نکلی جا رہی تھی بھرجائی اسے سنبھالتے ہوئے ہانپنے لگیں۔ ان کا سانس پھول گیا تھا۔ گھر کے باقی افراد بھی چپ ہو کے رہ گئے تھے۔ اس کی حالت حقیقتاً اختیار سے باہر تھی۔

''رجب آفریدی آج کل حبہ الٰہی میں انٹرسٹڈ ہے۔'' یہ وہ جملہ تھا جس نے آفاق بدر کو چونکا کے رکھ دیا تھا اور وہ حیران پریشان اس جملے کی تصدیق کے لئے سیدھا رجب آفریدی کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے روبرو آ کر پوچھا تو رجب نے اسے سر تا پا دیکھا اور اس کے تاثرات نوٹ کئے۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' رجب کے ماتھے پہ خفگی بھری سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

''جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ کیا تم سچ مچ حبہ الٰہی میں دلچسپی لے رہے ہو؟'' آفاق حتمی لہجے میں بولا۔

میں سچ مچ اسے پسند کرنے لگا ہوں میں محض دل لگی کے لئے اسے پسند نہیں کر رہا مجھے لگتا ہے اس پسند کے پیچھے کوئی اور جذبہ پرورش پا رہا ہے۔'' رجب اپنی تمام خفگی جھٹک کے انتہائی سنجیدگی اختیار کر چکا تھا۔

''رجب پلیز یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' آفاق جھنجھلا گیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رجب سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

''میرا مطلب واضح ہے کہ تم غلط کر رہے ہو اور غلطی کے بعد معافی کسی کسی کا مقدر بنتی ہے۔'' آفاق کی الٹی سیدھی باتوں سے رجب الجھ رہا تھا۔ اس نے استفہامیہ نظریں اس پہ مرکوز کر دیں۔

''دیکھو رجب آج تک تم نے ہزاروں لڑکیوں سے دوستی کی، دل بہلایا اور چھوڑ دیا اگرچہ مجھے یہ سب کبھی بھی پسند نہیں تھا لیکن میں نے کبھی بھی مداخلت نہیں کی تمہیں روکنے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس دفعہ تم نے غیر موزوں لڑکی کا انتخاب کیا ہے......''

''وہ کیسے؟'' رجب نے مختصراً پوچھا۔

''وہ ایسے کہ تم اپنے خاندان کے لاڈلے چشم و چراغ ہو اور جاگیردار اور اپر کلاس سے تعلق رکھتے ہو جو چاہو کر سکتے ہو تم مرد ہو۔ لیکن اس کے برعکس وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے

والی شریف خاندان کی ایک سادہ سی لڑکی ہے مجبوریوں اور عزت کی چادر میں لپٹی ہوئی اور سب سے بڑی بات کہ وہ عورت ذات ہے وہ اسکینڈلائز ہو جائے گی۔ اور وہ یہ سب افورڈ نہیں کر پائے گی لوگوں کی انگلیاں تمہارا تو کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی لیکن اس پہ بہت اثر ہوگا اس لئے میں چاہتا ہوں تم اپنی پسند کو لگام دو، یوں سرعام تشہیر مت کرو۔"

آفاق حبہ الٰہی سے کوئی تعلق کوئی بات چیت نہ ہونے کے باوجود بھی اس کو تھوڑا بہت سمجھتا تھا کیونکہ پوری یونیورسٹی میں واحد لڑکی تھی جو دو سال گزر جانے کے بعد بھی پہلے روز جیسی سادہ، لئے دیے انداز میں رہنے والی تھی، جہاں بھی کسی نے اس کی طرف پیش قدمی کی اُس نے بُری طرح جھٹک دیا تھا بلکہ اپنے تیکھے لب و لہجے سے سامنے والے کو گھبرانے پہ مجبور کر دیتی تھی اس کے محتاط رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے آفاق کو رجب آفریدی کی پسندیدگی فضول اور کسی حد تک نقصان دہ لگی تھی۔ وہ اسے سمجھا بجھا کر اس حرکت سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

"یار میں کب تشہیر کر رہا ہوں، خود مجھے بھی اپنی فیلنگز کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو پا رہا تم خواہ مخواہ فکرمند ہو رہے ہو۔"

"میں خواہ مخواہ فکر نہیں کر رہا تم خود سوچو، اگر میں یہ سوال لے کر تمہارے سامنے آیا ہوں تو مجھے بھی تو کسی سے ہی معلوم ہوا ہے گویا اس بات کو کافی لوگ جانتے ہیں کہ رجب آفریدی آج کل حبہ الٰہی میں انٹرسٹڈ ہے۔"

آفاق کی بات سچ تھی رجب کو خاموش ہونا پڑا پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" میں کنٹرول کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے کرسی کی بیک پہ ہتھیلیاں جماتے ہوئے کہا۔

"تھینکس یار! اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور حبہ الٰہی کا بھی، جو شاید گھر سے صرف اور صرف پڑھنے کا عہد کر کے نکلی ہے۔" آفاق بھی کھڑا ہو گیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

نجانے کیا بات تھی کہ وہ آفاق کی باتوں پہ اس کی ہدایتوں پہ صرف دو دن عمل کر سکا تھا اس سے زیادہ کنٹرول کی گنجائش ہی نہیں تھی اس کی نگاہیں بے تابانہ اسے دیکھتی تھیں اور اس دیکھنے میں اتنے پراثر جذبات ہوتے کہ آس پاس کے لوگ بھی محسوس کئے بنا نہیں رہتے تھے اس

وقت بھی وہ اکیلی سیڑھیوں پہ بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی اور وہ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا ہر احساس سے بیگانہ اسے دیکھنے میں محو تھا۔

"کیوں جناب آج کل ادھر نظر کرم ہے؟" پاس سے گزرتی عروج اسے دیکھ کر تھم گئی اور اس کی نگاہوں کے مرکز کو دیکھ کر معنی خیزی کا اظہار کیا۔

"میں تو بس......"

"جناب پوری یونیورسٹی کی لڑکیاں آپ کی آنکھوں پہ فدا ہوتی ہیں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ حبہ الٰہی کو دیکھیں اور داستان رقم نہ ہو اور ہاں جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ کی آنکھیں داستان بیان کر رہی ہیں، بے شک آئینہ دیکھ لیں۔"

وہ شرارت سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور رجب اپنے آپ کو سرزنش کرتا وہاں سے ہٹ گیا۔ عروج اس کے دوست فرہاد کاشمیری کی منگیتر تھی اس لئے کبھی کبھار ہیلو ہائے کی وجہ سے ان میں تھوڑی بہت بے تکلفی بھی تھی۔

"مل گئی تسکین؟" وہ کینٹین کی طرف آیا جہاں آفاق اکیلا بیٹھا کولڈ ڈرنک سامنے رکھے غصے کا شکار لگ رہا تھا۔

"کیسی تسکین؟" وہ کرسی گھسیٹ کر آفاق کے مقابل بیٹھ گیا اور ٹیبل بجا کر لڑکے کو کولڈ ڈرنک لانے کا اشارہ دیا۔

"جو حبہ الٰہی کی دید سے حاصل ہوئی ہے۔" اس کا طنزیہ لہجہ رجب کو فوراً محسوس ہو گیا۔

"ان فیکٹ آفاق......"

"پلیز رجب کوئی بھی بہانہ مت بناؤ خود کو لگام ڈالو، کیونکہ ہمیشہ بے لگام چیز ٹھوکر کھا کے گرتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں میں ایسا جان بوجھ کے نہیں کر رہا میں وہاں سے گزر رہا تھا اسے دیکھ کر آگے نہیں بڑھ سکا، میں نے اسے دو روز بعد دیکھا تھا اس لئے شاید......" بے بسی سے کہتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا۔ کینٹین بوائے کولڈ ڈرنک رکھ کے جا چکا تھا۔

"ایک بات سن لو رجب آفریدی، میں تمہارا تاحشر دوست رہوں گا ضرورت پڑی تو تمہارے لئے جان بھی دینے سے گریز نہیں کروں گا، لیکن فقط اس معاملے میں، میں کبھی بھی تمہارا ساتھی نہیں بن سکتا۔"

آفاق نے دوٹوک کہہ دیا اور اٹھ کر چلا گیا تھا جب کہ رجب عجیب سی کشمکش کا شکار ہوتا جا رہا تھا

"امی بابا کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ یونیورسٹی کے لئے تیار ہو رہی تھی جب امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ڈاکٹر نے میڈیسن لکھ کے دی ہیں کہتے ہیں۔ بخار کے بعد کمزوری اور نقاہت ہو گئی ہے اچھی غذا، فروٹ اور میڈیسن لیں گے تو بہتر ہو جائیں گے۔"

"لائیں واپسی پہ میں میڈیسن لے آؤں گی۔" اس نے سکارف کو گرہ لگا کر فوراً دوائیوں کا نسخہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"لیکن بیٹا تمہیں دیر ہو جائے گی اور تم جانتی ہو تمہارے بابا کا مزاج کیسا ہو چکا ہے ذرا سی دیر سویر بھی برداشت نہیں کرتے۔" ان کے انداز میں تامل دیکھ کر حبہ رک گئی تھی، پھر کچھ سوچ کر خود ہی نسخہ تھام لیا۔

"میں یونیورسٹی سے چند منٹ پہلے نکل آؤں گی اور سٹور سے میڈیسن لے کر گھر آ جاؤں گی آپ فکر مت کریں۔" نسخہ بیگ میں رکھ کر زپ بند کی دوپٹے کو سیفٹی پن سے جکڑا اور باہر نکل آئی۔

"چلیں آپی؟" رابعہ اور ہانیہ بھی کچن سے نمودار ہو چکی تھیں پھر آگے پیچھے دہلیز عبور کرتے ہوئے ماں کو اللہ حافظ کہا تھا۔

"فی امان اللہ!" انہوں نے بھی آہستگی سے کہہ کے دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ تینوں بہنیں روزانہ صبح اکٹھی ہی گھر سے نکلتی تھیں۔ البتہ بس سٹاپ تک آ کر ان کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ وہ دونوں میٹرک کی سٹوڈنٹ تھیں اور سکول جاتی تھیں ان کا سکول بس سٹاپ سے محض چند قدم دور تھا اور حبہ یونیورسٹی جاتی تھی اس لئے اسے وین کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

"او کے آپی، اللہ حافظ!" دونوں ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئیں اور وہ وین کا انتظار کرنے لگی۔ دس منٹ بعد اس کی مطلوبہ وین بھی آ چکی تھی۔ وہ جلدی سے سوار ہو گئی۔

"ہیلو کون ہو تم، اور یہاں کیوں کھڑی ہو؟" گاڑی کا لاک کھولتے کھولتے اس کا

ہاتھ رک گیا۔ وہ اپنی گاڑی کی اوٹ میں کھڑی اس مشکوک سی لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا تھا اور وہ لڑکی اسے دیکھ کر بوکھلا گئی تھی اسی بوکھلاہٹ میں دو قدم پیچھے ہٹی تو نجانے کس چیز سے ٹکرا کر لڑکھڑا سی گئی اس نے سہارے کیلئے دوبارہ اس کی گاڑی کو تھام لیا۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں، کون ہو تم؟" وہ گھوم کر اس کی طرف آ رہا تھا جب وہ ایک چیخ کے ساتھ لہرا کر زمین پہ آ رہی۔ اس کے قدم جم کے رہ گئے۔ اب کی بار وہ بوکھلا چکا تھا اس نے چند سیکنڈ ٹھہر کر آگے پیچھے دیکھا دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ ساری گہما گہمی اندر تھی باہر تو ہر طرف سناٹا ہی تھا۔

"اے...... ہیلو۔" اس نے ہمت کر کے قریب آ کر اس لڑکی کو پکارا۔ لیکن وہ تو سچ مچ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ گاڑی سے پانی کی بوتل نکال کر اس کے چہرے پہ چھینٹے مارے مگر اس کا وجود حرکت نہیں کر رہا تھا اور وہ گاڑی بھی نہیں نکال سکتا تھا کہ وہاں سے بھاگ ہی جاتا، مجبوراً اسے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال کا رخ کرنا پڑا۔ ہسپتال کی روشنیوں میں آ کر اس نے اس لڑکی کو بغور دیکھا۔ الجھے بکھرے بال، میلے کچیلے کپڑے، ننگے پیر اور چہرے پر کھنڈی زردی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مشکلوں اور مصیبتوں کے شکنجے سے فرار ہو کر بھاگی ہے اس کی حالت کافی ابتر تھی۔ وہ اس کی ٹریٹمنٹ تک راہداری میں ٹہلتا رہا تھا۔

"سر یہ میڈیسن لے آئیں۔" نرس نے باہر نکل کر اسے لسٹ تھمائی جس پہ انجکشن، ڈرپ اور چند مختلف دوائیاں درج تھیں۔ وہ فوراً لینے کے لئے چلا گیا۔ دوائیاں خاصی مہنگی تھیں لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی البتہ وہ اس لڑکی کے بارے میں خاصا پر تجسس ہو چکا تھا، جس نے بقول ڈاکٹر کے شاید کافی دنوں سے کھانا نہیں کھایا تھا اور بھوک کی وجہ سے وہ اس قدر کمزوری اور نقاہت کو پہنچ چکی تھی اور اسی بات نے اسے بے حد متجسس کر رکھا تھا اس چکر میں اسے گھر سے دیر ہو رہی تھی۔

"انہیں کب تک ہوش آئے گا؟" اس نے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

"کل صبح تک ہوش آ جائے گا وہ کافی زیادہ ذہنی ٹینشن کا شکار ہیں لیکن صبح تک بہتر ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر نے اسے تسلی دی اور تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ بچار کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی کو ڈاکٹر کی ذمہ داری پہ چھوڑ کے گھر چلا جائے۔ وہ اپنا نام و پتہ درج کروا کے گھر چلا گیا۔

صبح وہ ہسپتال پہنچا تو وہ لڑکی ہوش و حواس میں بیڈ پہ تکیوں کے سہارے ٹیک لگائے

بیٹھی تھی اور نرس اسے سوپ پلا رہی تھی۔

"گڈ مارننگ!" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا وہ لڑکی چونک گئی اور اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ نرس چلی گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا اور پلکیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"آپ کا نام و پتہ پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے کہا ہی تھا کہ اس لڑکی کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی۔

❁......❁......❁

"ہیلو!" وہ سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھی جب بھاری مردانہ آواز پہ اس کا قلم رک گیا سر اٹھا کے دیکھا۔ رجب آفریدی اس کی ٹیبل کے قریب کھڑا غالباً اس سے ہی مخاطب تھا کیونکہ اور تو کوئی تھا بھی نہیں۔

"جی فرمائیے......؟" ناگواری لہجے سے ظاہر تھی۔

"مجھے بانو قدسیہ کا ناول چاہئے غالباً آپ کے پاس ہے۔" رجب آفریدی بات کرنے کے لئے بہت مشکل سے بہانہ ڈھونڈ کر لایا تھا اور یہ اس کے دل کی بے بسی کا سب سے بڑا ثبوت تھا کہ اب اسے بہانوں کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔

"لیکن وہ تو شہوار......"

"جی ہاں، وہ شہوار درانی کا ناول ہے اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے ان فیکٹ اس ناول سے ایک اقتباس نوٹ کرنا ہے، بہت جلد آپ کو واپس مل جائے گا۔"

"لیکن وہ ناول میں گھر چھوڑ آئی ہوں اس لئے اس وقت تو ممکن نہیں آپ لائبریری سے رجوع کر لیں۔" وہ کہہ کے سر جھکا کے دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو چکی تھی اس کے لکھنے کی رفتار بہت تیز تھی وہ اس کے ہاتھ اور پین کو دیکھنے لگا جو اس کے لئے بہت خاص اور منفرد تھے۔

"آپ کل وہ ناول لے آئیے گا، میں کل لے لوں گا۔" اس نے ٹیبل بجا کر تاکید کی اور پلٹ کے چلا گیا۔

"ایک ذرا سے حادثے نے اس لڑکی کو میرے لئے کتنا اہم اور عزیز بنا دیا ہے۔" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے کافی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا، جب سامنے سے آتے آفاق بدر پہ نظر گئی۔

"آفاق!" اس نے آفاق کو اپنے دھیان میں کوریڈور میں مڑتے دیکھ کر فوراً پکار لیا اور قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے قریب آ کر استفسار کیا۔

"یار کلاس اٹینڈ کرنے اور کہاں؟" آفاق کو رجب کی کھوئی کھوئی کیفیت پہ حیرت ہوئی جو کلاس روم کے سامنے کھڑا ہو کر پوچھ رہا تھا کہ کہاں جا رہے ہو؟

"اوہ ہاں کلاس......" اس نے سر جھٹکا پھر دونوں ہی اندر داخل ہو گئے۔

"تمہاری مما کیسی ہیں طبیعت کچھ بہتر ہوئی یا نہیں؟"

رجب انتہائی شرافت، سنجیدگی اور توجہ سے پوچھ رہا تھا۔ اسے آفاق کی مما سے خود بھی بہت لگاؤ تھا اپنی ماں کی کمی کا احساس تو کبھی نہیں ہوا تھا لیکن آفاق کی مما کو دیکھ کر احساس ہوتا کہ مائیں سچ مچ بہت پیاری ہوتی ہیں خود چاہے کتنی ہی بے بس ہو جائیں اولاد کا حوصلہ نہیں گرنے دیتیں۔

"پہلے سے بہتر ہیں۔ مما بھی تمہیں بلا رہی تھیں۔"

"سوری یار! مجھے حقیقتاً اتنے دنوں سے تمہاری طرف چکر لگانے کا خیال نہیں آیا میں آج شام کو ہی آؤں گا اور انشاء اللہ مسئلہ بھی ڈسکس ہو جائے گا۔" وہ دونوں گفتگو میں محو تھے جب پروفیسر زیدی اندر داخل ہوئے، تب ان کے سارے مسئلے ملتوی ہو گئے۔

❁......❁......❁

"آپ وہ ناول لے آئیں؟" دوسرے روز وہ دوبارہ اس کے سامنے تھا۔

"جی وہ شہوار کے پاس ہے۔" اس نے دور بیٹھی شہوار کی سمت اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔ رجب اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا تھا گویا اس نے ناول خود رجب آفریدی کو دینا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لئے آتے ہی شہوار کو تھما دیا تھا۔ اس وقت رجب آفریدی کو اس کے تیکھے پن کا شدت سے احساس ہوا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس کے باوجود بھی اسے حبہ الٰہی پہ غصہ نہیں آیا تھا اور نہ وہ مزاجاً غصے کا تیز تھا ذرا سی بات پہ بھی اکھڑ جاتا تھا مگر یہ حبہ الٰہی ہی تھی جو مسلسل اسے نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ ڈس ہارٹ بھی کئے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا معاملہ اختیار سے باہر ہے کیا؟" فرہاد کاشمیری اچانک کہیں سے نمودار ہو کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"معاملہ نہیں یار میں خود اختیار سے نکل چکا ہوں۔" دونوں ساتھ چلتے لان میں آ گئے۔

"اتنی بے بسی کیوں؟" فرہاد کافی شوخ طبیعت کا مالک تھا اور اس کی منگیتر عروج بھی تقریباً اس جیسا ہی مزاج رکھتی تھی دونوں کی دلچسپ نوک جھونک اور دوسروں کو چھیڑنے کی عادت بھی چلتی رہتی تھی۔

"اس کیوں کا پتہ چل جائے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے میرے یار۔" رجب نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مار کے کہا اور فرہاد نے اسے سرتا پا گہری نظروں سے دیکھا۔

"اس کیوں کا پتہ مجھے معلوم ہے۔" اس کے لہجے میں یقین تھا۔ رجب نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"جب ایک انسان کی زندگی میں بے بسی اور بے اختیاری کی راہ بھی شامل ہو جائے تو سمجھ لو کہ وہ راہ اس انسان کو اس منزل کی طرف لے کر جا رہی ہے جس پہ صرف اور صرف اس کے محبوب کا نام لکھا ہوتا ہے تم بھی شاید اسی راہ پر چل نکلے ہو اور تمہاری منزل پہ حبہ الٰہی لکھا ہے کیونکہ عمارت تو محبت کے جزیرے پہ کھڑی ہے البتہ اس عمارت کی مالکہ حبہ الٰہی ہے لیکن ابھی شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ منزل یہ عمارت حبہ الٰہی کے نام ہو چکی ہے مگر میرے یار یہی حقیقت ہے کہ تمہیں حبہ الٰہی سے محبت ہو چکی ہے اس لئے تو اس کے معاملے میں بے اختیار کھڑا ہے۔"

فرہاد نے اسے سمجھایا تھا اور محبت کے نام پہ رجب تو جیسے حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ پھر فرہاد تو چلا گیا لیکن اس کے لئے سوچوں کے در وا کر گیا تھا اس نے اپنے دل کے اگلے پچھلے کھاتے کھول لئے تھے۔ ایک ایک کاغذ دیکھا شاید کسی اور کا نام لکھا ہو مگر وہ تو سارے صفحے کورے تھے، صرف ایک کاغذ نظر آیا جس پہ درج تھا...... "حبہ الٰہی"

"دینو بابا...... دینو بابا" گاڑی سے اترنے کے بعد پہلی پکار دینو بابا کی پڑی۔

"جی سائیں حکم؟" دینو بابا سارے کام چھوڑ چھاڑ کے بھاگے بھاگے آئے تھے۔

"رجب کہاں ہے؟" انہوں نے ذرا سختی اور تشویش سے پوچھا رات کے ساڑھے گیارہ کا وقت ہو رہا تھا، لیکن اس کی گاڑی غائب تھی۔

"سائیں یار باش (یار دوست) آئے تھے ساتھ لے گئے ورنہ چھوٹے سائیں تو انکار ہی کر رہے تھے۔"

"پہلے بھی جاتا ہوگا؟" ان کا انداز دیکھ کر دینو بابا گڑبڑا گئے۔

"نا سائیں پہلے تو نو دس بجے آ جاتے تھے۔" دینو بابا کو جھوٹ بولتے ہوئے تھوڑا ڈر تو لگا، لیکن اس خیال سے جھوٹ بولنا ہی پڑا کہ مبادا ان کا غصہ چھوٹے سائیں پہ نہ اترے۔ چند سیکنڈ وہ چپ رہے پھر سر ہلا کر قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے۔ دینو بابا بھی ان کے پیچھے ہو لئے۔ زریاب آفریدی کبھی کبھار ہی شہر کی رہائش گاہ پہ چھاپہ مارتے تھے لیکن ہمیشہ رجب آفریدی اس چھاپے سے پہلے ہی سنبھل جاتا تھا کیونکہ اس چھاپے کی خبر اسے بھرجائی پہلے ہی دے دیتی تھیں۔ لیکن آج نجانے بھرجائی کو کہاں دیر ہو گئی تھی کہ وہ بے خبر گھوم رہا تھا۔"

"تم سناؤ دینو بابا، مائی رشیداں ٹھیک ہے نا اور تیرے کمالے (بیٹے) کا کیا حال ہے؟" زریاب آفریدی صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"سائیں اللہ کا بڑا کرم ہے سب ٹھیک ہیں۔ کمالا بیمار ہو گیا تھا چھوٹے سائیں خود ساتھ گئے رات بھر ہسپتال میں رہے علاج کروایا۔ ڈاکٹر کو انگریزی میں ہدایت بھی دیتے رہے اور ڈاکٹر نے بڑا خیال رکھا ہمارا۔"

دینو بابا خوشی خوشی بتا رہے تھے۔ زریاب آفریدی بے ساختہ مسکرا دیئے۔

"یعنی وہ تم لوگوں کی ٹھیک ٹھاک کیئر کرتا ہے بس ہمارے سامنے لاپروا بنتا ہے۔"

"سائیں ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے اور یہی تو عمر ہوتی ہے من مرضی کرنے کی۔" دینو بابا نے رجب آفریدی کی حمایت کی، پھر رشیداں نے ان کے لئے کافی بنائی اور دونوں میاں بیوی اپنے کوارٹر میں چلے گئے۔ زریاب آفریدی ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر کے نیوز سننے لگے۔ نیوز وہ محض اس کے انتظار میں سن رہے تھے رفتہ رفتہ وقت ساڑھے گیارہ سے ایک بجے تک جا پہنچا۔ اب وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے انہیں بے حد تشویش ہونے لگی تھی۔ اپنا موبائل اٹھا کر اس کے نمبر پریس کیئے دوسری طرف رسپانس ہی نہیں تھا وہ جھنجھلا گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کا غصہ مزید تیز ہوتا باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ رجب اپنی الجھن میں گم اپنے ہی دھیان میں گاڑی سے اتر کر اندر آ گیا۔ زریاب آفریدی کی گاڑی بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ لیکن زینہ طے کرتے ہوئے قدم ٹھٹک گئے لاؤنج سے ٹی وی کی آواز سنائی دے رہی تھی اور روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

"لالہ سائیں آپ؟" لاؤنج میں قدم رکھتے ہی وہ گڑبڑا گیا۔

’’کیوں ہم نہیں آسکتے؟‘‘

’’نن نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔‘‘ ان سے بغل گیر ہوتے ہوئے وہ اندر سے پریشان بھی ہو چکا تھا۔

’’بیٹھو۔‘‘ وہ اسے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے اور پھر دونوں ہی بیٹھ گئے۔

’’کھانا کھایا آپ نے؟‘‘

’’ہاں کھانا تو ہم کھا چکے ہیں، تم سناؤ یونیورسٹی کے کیا حالات ہیں اور آج کل گھر سے باہر رہنے کا شوق کہاں سے چرایا ہے؟‘‘ وہ اب تفتیش شروع کر چکے تھے رجب کو اندازہ تھا اسی لئے اپنے آپ کو پہلے سے ہی تیار کر رہا تھا۔

’’گھر سے باہر رہنے کا کیا سوال لالہ سائیں ان فیکٹ آج ایک دوست نے جاب ملنے کی خوشی میں ڈنر پرانوائٹ کیا ہوا تھا تمام دوست موجود تھے اس لئے دیر ہو گئی۔‘‘ اس نے کافی سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا جس پہ زریاب آفریدی فوراً ٹھٹک گئے، رجب نے کبھی بھی اتنی متانت سے انہیں جواب نہیں دیا تھا ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لے کر غائب ہو جاتا تھا اور وہ چھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور کبھی کبھی تو اسے ڈانٹنا بھول کر ہنسنے لگتے تھے۔

’’کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟‘‘ انہوں نے فکرمندی سے اس کا ہاتھ چھوا۔

’’جی میں بالکل ٹھیک ہوں گل جانی اور بھرجائی کیسی ہیں؟‘‘ وہ ان کا دھیان بٹانا چاہتا تھا کافی دیر دونوں بھائی باتیں کرتے رہے آخر رجب نے ہی اٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کھڑا ہو گیا تب رات کے تین بج رہے تھے...... ’’رجب بیٹھو یہاں۔‘‘ انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

’’جی کیا بات ہے؟‘‘

’’کیا چھپا رہے ہو ہم سے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے یا پھر کوئی اور پریشانی ہے تو بتاؤ۔‘‘ وہ مکمل اس کی طرف متوجہ تھے۔

’’نہیں لالہ سائیں میں کچھ نہیں چھپا رہا نہ ہی مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے آپ جانتے ہیں ضرورت ہوئی تو آپ کے سوا بھلا کس سے کہوں گا۔‘‘

’’لیکن پھر بھی کوئی تو بات ایسی ہے جو تم ہم سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو......‘‘ ان کا مشاہدہ بالکل درست تھا مگر رجب ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ انہوں نے کریدنے کی کوشش

کی مگر ناکام ہی رہے اور یونہی متفکر سے دوسرے روز واپس حویلی چلے گئے۔

❂......❂......❂

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

حبہ نے سر اٹھا کر دیکھا لڑکیوں کا گروپ با آواز بلند یہ شعر پڑھ رہا تھا حبہ کے دیکھنے پہ زبردست معنی خیز قہقہہ پڑا اس گروپ میں عروج بخاری بھی موجود تھی جس کو حبہ شروع سے ہی ناپسند کرتی تھی۔

’’یار لیلیٰ کو خبر ہی نہیں اور مجنوں درخت کے ساتھ ہوا جا رہا ہے۔‘‘ کسی لڑکی نے کہا۔

’’ارے ہو جائے گی خبر بھی پھر لیلیٰ بھی کہے گی ’’کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔‘‘ عروج باقاعدہ گنگنا کر کہہ رہی تھی۔ حبہ کی چھٹی حس الارم دے رہی تھی کہ موضوع گفتگو اس کی ذات ہے اسی لئے وہ بار بار اسے دیکھ کر فقرے کس رہی تھیں۔

’’ارے کہاں وہ زمانے کہ رجب آفریدی کی آنکھوں پہ زمانہ مرتا تھا اور کہاں یہ زمانہ کہ رجب آفریدی کسی پر مرمٹا۔‘‘ کسی نے آہ بھری۔ حبہ کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا اور الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ رجب آفریدی کا نام حیرت اور ناسمجھی کا باعث بن رہا تھا لیکن چند دنوں بعد ہی شہوار درانی نے اس کی الجھن کو واضح کر دیا تھا۔

’’ہاں حبہ میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے رجب تم میں انٹرسٹ لے رہا ہے اور تمہاری وجہ سے وہ کوئی بھی پیش رفت نہیں کر رہا کیونکہ اسے اندازہ ہے تمہیں یہ سب پسند نہیں۔‘‘ شہوار کے منہ سے یہ سب سن کر حبہ کو شاک لگا تھا اور شدید غصہ بھی آیا کہ اس کی ذات بغیر انوالو ہوئے بھی لوگوں کی باتوں اور مذاق کا نشانہ بنی ہوئی ہے اور اسے معلوم ہی نہیں۔ وہ تلملاتی ہوئی سیدھی اس کی کلاس میں جا پہنچی جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھا۔

’’مسٹر آفریدی میں آپ کو اتنا گھٹیا ہرگز نہیں سمجھتی تھی جتنا آپ نے بن کے دکھایا ہے۔‘‘ وہ اس کے سر پہ کھڑی جیسے پھٹ پڑی تھی اور رجب کے تاثرات بھی یک لخت بدل گئے تھے۔

’’مس حبہ الٰہی آپ۔‘‘

’’شٹ اپ! میں یہاں آپ کی گھٹیا بکواس سننے نہیں آئی، بلکہ صرف اتنا بتانے آئی

ہوں کہ آئندہ میرا نام آپ کے ساتھ آیا تو اچھا نہیں ہوگا۔" اس نے عروج سمیت سب کی طرف دیکھا۔

"اور ہاں اپنی اس جاگیرداری اور پرکشش پرسنالٹی کا رعب ایرے غیرے لوگوں کے لئے سنبھال کے رکھیئے یقیناً کام آئے گا میری طرف دیکھنے کی بھی کوشش کی تو بہت بُرا ہوگا۔"

"حبہ! یہ کیا کر رہی ہو پاگل ہوگئی ہو؟" شہوار تیزی سے کلاس روم میں داخل ہوئی اور حبہ کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ وہ کھڑے کھڑے رجب آفریدی کو بے عزت کر چکی تھی۔

"چھوڑ دو میرا بازو، میں دیکھوں تو سہی یہ مرد ذات سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو، جب چاہا جس کو چاہا رسوا کر دیا، بدنامی کا ٹیکا لگا دیا اور خود آزاد پھرتے رہے......" وہ اس وقت بری طرح بپھر چکی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو بھی چھڑا لیا تھا۔ رجب آفریدی نے چونک کر اس کے اس قدر شدید ردعمل کو دیکھا۔

"اتنا یاد رکھو رجب آفریدی اگر تمہاری وجہ سے میں رسوا ہوئی تو تمہیں چوک میں کھڑا کر کے تمہارا وہ حال کروں گی کہ دنیا دیکھے گی۔" وہ نخوت اور نفرت سے کہتی واپس پلٹ گئی، رجب جوں کا توں کھڑا رہ گیا تھا آفاق، فرہاد، مدثر سب دیکھتے رہ گئے، کچھ بھی کہنے کے لئے کسی کے پاس الفاظ نہیں تھے کیونکہ وہ سب ہی رجب کے جذبات کو سمجھتے تھے انہیں یقین تھا کہ رجب اس سے محبت کر بیٹھا ہے اور اس معاملے میں وہ بھلا کیا کہہ سکتے تھے۔ پوری کلاس دم سادھے بیٹھی تھی۔ حبہ الٰہی نے رجب آفریدی کی ہتک اور تذلیل کرنے میں انتہا کر ڈالی تھی وہ خود حیران تھا کہ اچانک ہوا کیا ہے؟ سب سے پہلے کلاس روم سے آفاق بدر نے واک آؤٹ کیا تھا جس پہ رجب اور بھی پریشان ہوا۔

"محبت کا مفہوم جانتے ہو؟" انتہائی بے مروت اور تیکھے لہجے میں طنزیہ استفسار کیا گیا تھا۔ رجب کو سامنے والے کی کم عقلی پہ ہنسی آئی تھی اور حیرت بھی ہوئی۔

"جواب دو میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ محبت کا مفہوم جانتے ہو؟ آفاق مزید تلخ ہوا تو رجب بھی چڑ گیا۔

"مفہوم جانتا ہوں تب ہی تو اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں ورنہ ایک لڑکی رجب آفریدی کی انسلٹ کر کے چلی جاتی اور زندہ بھی رہتی۔"

"اپنی انسلٹ کا کتنا خیال ہے کہ تم کسی کو زندہ ہی نہیں چھوڑ سکتے تھے کسی دوسرے کی انسلٹ کا بھی خیال کر لینا چاہئے، میں نے تمہیں بارہا سمجھایا تھا کہ یوں کسی کو اسکینڈلائز کروانے سے پہلے سوچ لو کیونکہ وہ ان لڑکیوں جیسی ہرگز نہیں جن سے تمہارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔"

"لیکن آفاق میری غلطی ہی کیا ہے میں نے کب اسے سکینڈلائز کرنے کی کوشش کی ہے؟" رجب جھنجلا گیا۔

"میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جب یونیورسٹی میں ہمہ وقت تم اسی کو مرکز نگاہ بنائے رکھو گے تو یقیناً باتیں ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ اس پہ اتنی توجہ دینا چھوڑ دو ورنہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے اور آج وہی ہوا جس سے بچنے کے لئے میں کہتا تھا۔" آفاق سچ مچ غصے میں تھا رجب کا اپنا دماغ کام کرنا چھوڑ چکا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"اب بتاؤ کیا کرنا چاہئے؟" اس نے بے حد آہستگی سے کہا۔

"تمہیں اس سے معافی مانگ لینی چاہئے۔"

"کیا؟" آفاق کے الفاظ سے اسے گہرا جھٹکا لگا جیسے اس نے معافی کا نہیں کسی کو قتل کرنے کا کہہ دیا ہو۔

"کیوں تم معافی نہیں مانگ سکتے؟" آفاق نے کافی گہری نظروں سے اسے سرتاپا جانچا۔

"آفاق تم پاگل ہوگئے ہو اتنے لوگوں میں انسلٹ میری ہوئی ہے اور معافی بھی میں ہی مانگوں کہیں دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔" رجب آفریدی معافی کے لفظ پہ جیسے دیوانہ ہی تو ہو گیا تھا۔

"جب تم معافی نہیں مانگ سکتے تو محبت کو تم کیا جانو گے محبت میں کبھی بھی میں نہیں رہتا سب کچھ تم ہو جاتا ہے اگر محبت میں کچھ پانے کے متمنی ہو تو پہلے اپنی ذات کو بے ثبات کرو جس روز تمہاری اپنی ذات تمہارے لئے بے ثبات ہوگئی اور اُس روز محبت تمہیں مکمل کر دے گی کیونکہ محبت میں "میں اور تو" کا فرق نہیں ہوتا جس روز اس مقام کو پا لو گے اس روز محبت خود تمہارے قدم چومے گی، آگے تمہاری مرضی کہ تمہیں معافی مانگنی ہے یا نہیں۔"

آفاق چلا گیا لیکن رجب آفریدی اس بات کے اثر میں جکڑا بے حس و حرکت بیٹھا کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا، بالکل جامد بیٹھا تھا۔

رجب آفریدی کا تعلق پشاور سے تھا۔ آفریدی حویلی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ

صرف دو ماہ کا تھا جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماں اور باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔ زمان آفریدی ماں باپ کے اکلوتے چشم و چراغ تھے، دو بہنیں تھیں جن کو اپنے اکلوتے بھائی سے بے پناہ پیار تھا انہوں نے بہت ارمانوں سے بھائی کی شادی کی، زمان آفریدی کے صرف دو بیٹے تھے زریاب آفریدی اور رجب آفریدی، گل جانی کے دل میں بہت زیادہ پوتے پوتیوں کا شوق تھا وہ اپنے بیٹے زمان آفریدی اور پوتوں پہ جان چھڑکتی تھیں لیکن ایک روز شادی کے فنکشن سے واپسی پہ ان کی گاڑی ایک ٹرالر سے ٹکرا گئی اور وہ دونوں...... موقع پہ جاں بحق ہو گئے تھے۔ آفریدی حویلی میں کہرام مچ گیا تھا۔

زریاب آفریدی بھی ماں باپ کی موت سے جیسے تنہا صحرا میں آن کھڑے ہوئے تھے لیکن دو ماہ کا رجب تو ہر دکھ ہر غم سے انجان تھا اسے کیا خبر تھی کہ قدرت نے اس سے کیا کچھ چھین لیا ہے۔ ماں کی آغوش ہی نہیں باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا تھا اور یہ زریاب آفریدی ہی تھے جنہوں نے اتنے غم کے باوجود رجب آفریدی پہ دھیان دیا اور اسے اپنی بانہوں میں چھپا لیا تھا۔ اپنے غم سے سنبھلنے کے بعد رفتہ رفتہ گل جانی کو خبر ہوئی کہ سب سے زیادہ نقصان تو رجب کا ہوا ہے جس نے ابھی اماں کہنا بھی نہیں سیکھا اور باپ سے کوئی لاڈ نہیں اٹھوایا تھا یہی سوچ کر ان کے دل میں دوبارہ سے غم کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا اور رجب کو اپنی ہتھیلی کا پھپھولا بنا لیا، ہر سرد و گرم سے یوں بچا کے رکھتیں جیسے وہ موم کا بنا ہو۔

جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھنے تک آفریدی حویلی میں رجب کے لئے بہنوں سی چاہنے والی بھرجائی بھی آ چکی تھیں یوں رجب کے لئے باپ کا مفہوم بھائی، ماں کا مفہوم گل جانی اور بہن کا مفہوم بھرجائی تھا اس نے آج تک ان رشتوں کی موجودگی میں کوئی کمی محسوس نہیں کی تھی نہ ہی ماں باپ کے لئے دل گرفتہ ہو کر انہیں پریشان کیا تھا، وہ اپنی زندگی سے پوری طرح سے مطمئن تھا ہمیشہ من مانی کی، جو چاہا وہ حاصل کیا تھا تعلیم کے لئے بھی کوئی روک ٹوک تھی۔

زریاب آفریدی نے اسلام آباد کے مہنگے ترین ایریا میں رہائش کے لئے بنگلہ خرید کر دیا گاڑی، بینک بیلنس اور ملازم سب کچھ ہمہ وقت اس کے لئے تیار اور الرٹ رہتے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی کئی رنگینیاں انجوائے کی تھیں۔ لیکن ایک روز یونیورسٹی سے فل اسپیڈ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ آتے ہوئے اچانک گاڑی اس کے اختیار سے باہر ہو گئی تھی اور سیدھی ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ بس اسٹاپ تک پیدل جاتی حبہ الٰہی اس دھماکے سے چیخ اٹھی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی

گاڑی کے پاس آئی۔

''بچاؤ...... پلیز بچاؤ......'' وہ یکدم چلانے لگی۔ ڈور کھولا اور رجب آفریدی کو ہراساں نظروں سے دیکھا وہ اس کا یونیورسٹی فیلو تھا البتہ دونوں کے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے اس کے ماتھے سے بہتا خون اور نیم بے ہوش حالت اسے بدحواس کر رہی تھی اس نے بیگ سے اپنا دوپٹہ نکال کر اس کے ماتھے پہ باندھا اور پھر بھاگتی ہوئی روڈ پہ آئی اتفاقاً آفاق، فرہاد، مدثر اور دوسرے دوست بھی اپنی گاڑیوں میں نکل رہے تھے۔

''پلیز وہ...... وہ رجب آفریدی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' حبہ کا بدحواس لہجہ اور انداز انہیں چونکا گئے جب ان کی گاڑیاں ہسپتال کے لئے روانہ ہوئیں وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی دل میں اس غیر اور اجنبی کے لئے زندگی کی دعا کرتی ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتی واپسی کے لئے مڑ گئی لیکن گھر دیر سے آنے پہ اسے بابا کی کافی صلواتیں سننا پڑی تھیں۔

❁......❁......❁

رجب آفریدی کو ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس لڑکی کا خیال آیا جو اس کے لئے بدحواس ہو رہی تھی اسی نے اسٹیئرنگ سے ہٹا کر سیدھا کیا تھا اسے اس کی دھندلی دھندلی صورت یاد تھی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ حبہ الٰہی تھی۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تو گل جانی اور بھرجائی کی فکر اور بھاگ دوڑ جاری ہو گئی تھی، زریاب آفریدی بھی آج کل شہر والے بنگلے پہ موجود تھے...... اور یونیورسٹی آتے ہی رجب نے سب سے پہلے حبہ الٰہی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور آفاق بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

''ہیلو! مس حبہ الٰہی کہاں ملیں گی؟'' آفاق نے شہوار درانی کو کلاس روم سے نکلتے دیکھ کر مخاطب کر لیا۔

''اندر کلاس روم میں ہی ہے۔'' شہوار انہیں الجھن آمیز نگاہوں سے دیکھتی آگے بڑھ گئی۔

''ہیلو! کیسی ہیں آپ؟'' پہلے آفاق نے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔ حبہ نے چونک کر سر اٹھایا اور رجب آفریدی کو صحت یاب دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہوئی کیونکہ چند روز قبل اس حادثے کی وجہ سے وہ اس کی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ رجب کی حالت ہی اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ مایوسی تعجب آمیز بات نہیں تھی۔

''آئم فائن۔'' وہ کھڑی ہو گئی، چہرے کے گرد سیاہ اسکارف کا ہالہ بنا ہوا تھا سوٹ کی

میچنگ چادر شانوں پہ پھیلائے وہ ان کے سامنے بہت اعتماد سے کھڑی تھی۔

''مس حبہ الٰہی! میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں، تھینک یو سوچ اس وقت میں آپ کی وجہ سے یہاں کھڑا ہوں اگر آپ بروقت میرے لئے بھاگ دوڑ نہ کرتیں تو شاید آج میرا ٹھکانہ کہیں اور ہوتا۔''

رجب بے حد متحمل لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے بات کر رہا تھا نجانے کیا بات تھی حبہ کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا ایسا احساس جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا جس کی لذت بہت نئی بہت انوکھی نرالی لگ رہی تھی۔

''مسٹر رجب آفریدی! آپ اس وقت یہاں میری وجہ سے نہیں اس پاک ذات کی وجہ سے کھڑے ہیں، جس نے آپ کی عمر اتنی مختصر نہیں لکھی تھی کیونکہ اگر آپ کی عمر کا گوشوارہ ختم ہو چکا ہوتا تو میرے جیسی دس اور بھی آجاتیں

تو آپ میرا نہیں اپنے ربِ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیجئے، جس نے آپ کی عمر دراز لکھی ہے میری طرف سے آپ کو صحت یابی مبارک ہو۔'' وہ بہت نرمی اور نپے تلے انداز میں کہتی اپنی کتابیں سمیٹنے لگی تھی۔ رجب اس کی بات سن کر چند ثانیے کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔

''ایکسکیوزمی!'' وہ معذرت کرتی وہاں سے چلی گئی تھی، رجب نے آفاق کو اور آفاق نے رجب کو بیک وقت دیکھا تھا۔ آج تک یونیورسٹی میں کسی نے یوں نظر انداز..... نہیں کیا تھا اور یہی سلوک رجب آفریدی کے دل پہ اثر انداز ہو گیا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ ہوتا چلا گیا وہی حبہ الٰہی جو پہلے کبھی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی اب ہر سو نظر آنے لگی۔ رجب آفریدی نے باقی لڑکیوں سے موازنہ کیا تو وہ سب سے منفرد سب سے الگ نظر آئی، آہستہ آہستہ اس کا دل مائل ہونے لگا۔

ان ہی دنوں آفاق اپنی ماں کو لے کر چیک اپ کے لئے کراچی گیا ہوا تھا واپسی پہ اسے لڑکے لڑکیوں کی سرگوشیوں سے اندازہ ہوا کہ رجب کا آج کل کسی طرف رجحان ہے اس نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ سمجھے سمجھانے کی حدود سے نکل چکا تھا وہ اپنے دل کو کسی بھی طرح سے روک نہیں پا رہا تھا۔ اس کے جذبات اس کے اختیار سے نکلتے جا رہے تھے اور اسی بے اختیاری کے ہاتھوں حبہ الٰہی کے لئے اس کے دل میں موجود جذبات عیاں ہونے لگے جس کا نتیجہ اسے حبہ الٰہی کے غصے اور نفرت کی صورت میں ملا تھا اور اب آفاق اسے معافی کا

راستہ دکھا کر جا چکا تھا۔ وہ ہنوز ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا اپنے دل کی وادی کو اتھاہ گہرائیوں تک ٹٹول آیا تھا جس میں کسی بھی طرح کا غصہ نہیں تھا انا نہیں تھی اپنی تذلیل اپنی ہتک کی ذرا بھی پروا نہیں تھی نہ ہی وہ اس سے انتقام کا کوئی ارادہ رکھتا تھا، بس خاموشی سے بیٹھا سوچے جا رہا تھا۔

❁......❁......❁

''اتنی چپ رہتی ہو تھکتی نہیں ہو؟'' شہوار نے گھاس پہ اس کے قریب آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم اتنا بولتی ہو تمہیں تھکن نہیں ہوتی؟'' حبہ نے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے جواباً شہوار کو لپیٹ میں لے لیا تو شہوار گھورنے لگی۔

''بولنے سے تھکن نہیں ہوتی، بھوک لگتی ہے اور جب بھوک لگتی ہے تو پیٹ بھر کے کھانا کھاتی ہوں اسی لئے صحت اچھی رہتی ہے اور اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بولنا صحت کے لئے اچھا ثابت ہوتا ہے۔''

شہوار نے انتہائی سکون سے وضاحت دی تو نہ چاہتے ہوئے بھی حبہ کے ہونٹوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ کھیل گئی جبکہ کی سوائے شہوار کے کسی سے بھی بات چیت یا انڈرسٹینڈنگ نہیں تھی نہ ہی وہ زیادہ دوستوں کو پسند کرتی تھی ہاں شہوار کردار کے حوالے سے کافی محتاط لڑکی تھی اسی لئے دونوں کی نبھ رہی تھی اور شہوار ہی وہ واحد لڑکی تھی جو حبہ الٰہی کے گھریلو پرابلمز بھی جانتی تھی۔

''یعنی ہر چیز کے فائدے دیکھتی ہو؟''

''ہاں یار دیکھنا بھی چاہئے اب میں بغیر فائدے کے بولتی ہوئی اچھی لگوں گی؟'' شہوار نے کندھے اچکائے حبہ اس کے فریش بے فکر چہرے کو دیکھ کر نظر چرا گئی۔

ایسی ہی بے فکری کبھی ان کے چہروں کا خاصا ہوتی تھی لیکن حالات نے ان کو تفکرات کا نقاب بخش دیا تھا وہ اپنے ہی چہروں سے نظر چرانے لگی تھیں۔ انہیں اپنے ہی چہروں کی شگفتگی بھول چکی تھی۔

''کیا ہوا تم چپ کیوں ہو گئیں؟'' شہوار اس کی خاموشی نوٹ کر کے اس کا ہاتھ پکڑ چکی تھی۔ ''بس ایسے ہی کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ ہمیں تو ہنسنے کھیلنے کا کوئی حق نہیں ہم کیوں ہنس رہی ہیں؟'' اس کا لہجہ شکستہ ہو رہا تھا۔

ارے پگلی ایسا نہیں سوچتے، ہر انسان کا ہر چیز پہ حق ہے بس کبھی کبھی کچھ دیر کے لئے

کوئی چیز ہمیں اپنے لئے موزوں نہیں لگتی انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اللہ بہتر کرے گا۔ بابا کی طبیعت کیسی ہے؟'' شہوار نے بہت اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھپکا اور اسے سمجھانے کے لئے تسلی دی۔

''پہلے سے بہتر ہیں۔'' وہ مختصراً بتا کر چپ ہو گئی۔

''حبہ تمہیں اتنا دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے تم گھر میں رابیہ اور ہانیہ سے بڑی ہو اپنا حوصلہ بلند رکھو روحان بھائی کا فون وغیرہ آیا؟''

''نہیں میں نے دو مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ چھٹی پر ہیں اب پتہ نہیں وہ کہاں ہیں اور ہم سے رابطہ کیوں نہیں کر رہے، چند دنوں کے لئے آجاتے تو بابا کا موڈ بھی شاید بہتر ہو جاتا۔''

حبہ اس وقت بے حد دکھی ہو رہی تھی اور شہوار بہت خلوص اور محبت سے اسے تسلی دلاسہ دینے میں مصروف تھی۔

''ہو سکتا ہے انہیں کوئی کام پڑ گیا ہو یا پھر وہ واپس آنے کی تیاری میں ہوں۔''

''نہیں شہوار وہ کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے ان کے دل میں ہمارے لئے نفرت بیٹھ چکی ہے۔ وہ ہمیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور...... اور اس میں بھلا ان کا کیا قصور ہے ہمیں اس حال اس نوبت کو پہنچانے والی ہماری بہن ہے، ہماری اپنی بہن جس نے ہم بہنوں کا خیال نہیں کیا باپ اور بھائی کی عزت کا خیال نہیں کیا ماں کی تربیت کی لاج نہیں رکھی سب روند ڈالا۔ عذاب میں جھونک دیا ہمیں......'' وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی اور شہوار اسے خاموش کروانے لگی کہ یونیورسٹی کے بیچوں بیچ تماشا نہ بن جائے۔

* * *

غفار الٰہی دیہاتی تھے لیکن اچھی تعلیم، سوچ اور ماں باپ کے تعاون سے وہ دیہاتی بن کے نہیں رہے تھے، انہوں نے شہر میں ملازمت کر لی وہ واپڈا کے محکمہ میں بہت اچھی پوسٹ پر تھے اور بہت خوش بھی تھے۔ ماں باپ نے اپنی پسند سے ان کی شادی کر دی اس پہ بھی انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نوکری کے لئے شہر آئے تو بیوی، خدیجہ بیگم کو گاؤں ہی چھوڑ آئے تھے خدیجہ بیگم بھی ساس، سسر کے ساتھ رہتے ہوئے خوش اور مطمئن تھیں، لیکن جب روحان پیدا ہوا تو غفار الٰہی کے دل میں اس کی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ پوسٹ کا خواب پہلے سے موجود تھا ایسے ہی

خواب انہوں نے بیٹیوں کے حوالے سے بھی دیکھ رکھے تھے روحان کے بعد حبہ اور حبہ کے بعد ردا پیدا ہوئی اور پھر تین سال بعد رابیہ اور ہانیہ جڑواں پیدا ہوئی تھیں۔

رفتہ رفتہ بچے بڑے ہوئے تو غفار الٰہی کو اندازہ ہوا کہ ان کے خوابوں کی تکمیل گاؤں میں رہ کر ممکن نہیں ہو گی، اسی لئے خاندان کی مخالفت کے باوجود شہر آ گئے بچوں کو اچھے اداروں میں داخل کروایا اور خود دن رات محنت کرنے لگے انہیں بیٹے سے زیادہ بیٹیاں عزیز تھیں اور وہ ان کی تعلیم پہ بھی بھرپور توجہ دیتے تھے ان کے ناز نخرے اٹھاتے ہر خواہش پوری کرتے لیکن ساتھ ہی اپنی عزت کو سنبھالنے کی تاکید بھی کرتے رہتے۔ روحان اپنا ایم بی اے کلیئر کر چکا تھا اور ایک دو جگہ جاب کے لئے اپلائی بھی کر رکھا تھا حبہ سیکنڈ ایئر اور ردا فرسٹ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی۔ حبہ بھی روحان کی طرح ایم بی اے کا شوق رکھتی تھی اسی لئے اس کے اور ردا کے راستے جدا ہو گئے بی اے فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ انصر نیاز اس میں انٹرسٹ لے رہا تھا۔ اور ردا الٰہی جو ابھی بچپن کی سیدھی سادی گلیوں سے نکل کر نوخیز جوانی کے گلستان میں داخل ہوئی تھی دیوانہ وار لپکتے اس بھنورے کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی، بہت جلد انصر نیاز نے اسے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا اس کا نوخیز حسن اسے دن رات بے چین کئے ہوئے تھا وہ اسے ہر صورت حاصل کرنا چاہتا تھا، محبت کے نام پہ کئی وعدے کئی عہد بھی ہو چکے تھے لیکن ابھی تک وہ اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کی عزت سے ڈرتی تھی تب اسے بہلانے کے لئے انصر نیاز نے کورٹ میرج کا شوشا چھوڑا تب وہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور ایک روز سچ مچ نکاح کر کے وہ باپ کا گھر اور عزت روند کر چلی گئی۔

غفار الٰہی کو خبر نہ تھی کہ ان کی بیٹی انہیں گہرے پاتال میں بھی گرا سکتی ہے، وہ پہلے تو کئی روز جیسے ہر احساس سے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے، لیکن جب روحان کا جھکا سر نیچی نظریں دیکھ کر احساس ہوا کہ لوگ باہر کیا کیا باتیں کر رہے ہیں تب ان کے اندر کا زہر امڈنے لگا۔

''چلی جاؤ تم سب بھی چلی جاؤ...... بھاگ جاؤ تم سب بھی۔ دفع ہو جاؤ...... مر گئیں تم سب میرے لئے۔ مر گئیں تم سب......'' وہ چیخ چلا رہے تھے حبہ بھاگتے ہوئے روحان کے پاس گئی۔

''روحان بھائی دیکھیں نا بابا ہم پہ۔''

حبہ کے الفاظ اور روہانسا لہجہ پتھرا کے رہ گئے تھے۔ روحان بابا سے بھی زیادہ نفرت

سے دیکھ رہا تھا۔

''دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... میں تم لوگوں کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا نفرت ہو گئی ہے تمہاری صورتوں سے چلی جاؤ کہیں، یہ نہ ہو کہ تیل چھڑک کے تم تینوں کو آگ لگا دوں۔'' روحان کے منہ سے بھی شعلے لپک رہے تھے۔ آنکھیں نفرت کے رنگ میں رنگی تھیں۔ حبہ تھپڑ سے زیادہ اپنے بھائی کی نفرت کا درد لئے الٹے قدموں چپ چاپ ساکت واپس لوٹ آئی۔

گھر کے در و دیوار بھی کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ ایک خدیجہ بیگم تھیں اور وہ بھی گھر کا شیرازہ بکھر جانے سے بے جان ہو چکی تھیں، چند دن اسی طرح ہر طرف آگ دہکتی رہی۔ رابیہ اور ہانیہ نے الگ رو رو کر بُرا حال کر رکھا تھا البتہ حبہ خاموش ہو چکی تھی اسے ادراک ہو چکا تھا کہ ان کی زندگیاں کسی حد تک غیر اہم، قابل نفرت اور تباہ ہو چکی ہیں۔ غفار الٰہی نے اس کے یونیورسٹی اور رابیہ ہانیہ کے سکول جانے پہ پابندی لگا دی، مگر خدیجہ بیگم نے احتجاج بلند کر دیا اور بہت مشکلوں سے انہیں پڑھنے کی اجازت دلوائی تھی حبہ اپنے باپ اور بھائی کا اعتماد بحال کرنا چاہتی تھی۔ روحان فرار کے طور پہ جاب کا بہانہ کر کے کراچی چلا گیا تھا اور آج تک واپس نہیں آیا تھا، کبھی کبھار گھر فون کر کے خیر خبر معلوم کر لیتا تھا حبہ اپنی کوششوں میں لگی تھی مگر غفار الٰہی تو جیسے دل کی جگہ پتھر رکھ چکے تھے جس سے ہر احساس ختم ہو چکا تھا اگر کبھی پانچ دس منٹ لیٹ ہو جاتیں تو ہزاروں طعنے سننا پڑتے تھے، ہزاروں نشتر سہنے پڑتے تھے اسی لئے وہ دامن بچا بچا کے چلتی تھی ایسے میں رجب آفریدی کی حرکتیں جلتی پہ تیل کا کام کر سکتی تھیں بلکہ کر چکی تھیں۔ حبہ نفرت کرنے لگی تھی ہر اس مرد سے جو محبت کے نام پہ لڑکیوں کو بہکاتا تھا اور ہر اس لڑکی سے جو اس بہکاوے میں آ کر ماں باپ اور بہن بھائیوں کی زندگی عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

❂......❂......❂

وہ یونیورسٹی سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتی بس سٹاپ پہنچنے تک نجانے کتنی بار اپنی نازک کلائی پہ بندھی رسٹ واچ دیکھ چکی تھی، سوئیاں اندھا دھند بھاگ رہی تھیں اس کی ہر ہر حرکت سے بے چینی اور عجلت ظاہر ہو رہی تھی چند سیکنڈ بعد گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔

''آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' رجب آفریدی نے گاڑی کا فرنٹ ڈور یوں کھول دیا جیسے برسوں سے دونوں کے درمیان لفٹ لینے کا سلسلہ چلا آ رہا ہو اور حبہ الٰہی، رجب آفریدی کو دیکھ کر جیسے شعلوں میں گھر گئی تھی انتہائی حقارت بھری نگاہ ڈال کر دوسری سمت

رُخ موڑ لیا۔

''حبہ! میں جانتا ہوں آپ کو مجھ پہ شدید غصہ ہے لیکن پلیز میرا یقین کریں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے آپ کی عزت پہ کوئی حرف آتا، یہ سب اسٹوڈنٹس کی......''

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ! آپ کی وجہ سے جو ہو چکا سو ہو چکا اب آپ کے صفائی دینے سے کچھ نہیں ہو سکتا اور آئندہ پلیز میرے آس پاس نظر آنے کی کوشش مت کیجئے گا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔'' حبہ اس معاملے میں آ کر اتنی کرخت ہو جاتی تھی کہ رجب آفریدی گنگ سا دیکھتا رہ جاتا کہ کیا کوئی لڑکی جو بظاہر بہت نرم و نازک اور کم عمر ہو اندر سے اتنی سخت بھی ہو سکتی ہے۔

''لیکن حبہ میں آپ سے......''

''اسٹاپ اٹ پلیز آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔'' وہ یکدم پھنکار کے پلٹی تب تک اس کی مطلوبہ وین آ چکی تھی۔ رجب وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ چلی گئی تھی رجب کو اپنی منزل بہت مشکل نظر آ رہی تھی۔ حبہ الٰہی کی ذات تک پہنچنا ناممکن لگ رہا تھا لیکن دل کی خاطر یہ کام بھی آخر کرنا ہی تھا۔

❂......❂......❂

''آ گئی ہو، اڑا لئے گلچھرے؟ روند ڈالی میری عزت؟ کر لیا منہ کالا؟'' گھر میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ سامنے ہی غفار الٰہی کھڑے شعلے اُگل رہے تھے اسی منہ سے کبھی ان ہی بیٹیوں کے لئے پھول جھڑتے تھے، ذرا سی دیر ہونے پہ پریشان ہو کر دعائیں مانگنے لگتے تھے۔

''وہ...... بابا میں لائبریری میں کتابیں ایشو......''

''بکواس بند کر حرام خور! مجھے پاگل سمجھتی ہے میں اندھا ہوں تیری رنگ رلیاں نہیں دیکھ سکتا؟''

''بابا پلیز میرا یقین کریں، مجھے لائبریری میں دیر ہو گئی تھی اور میری وین بھی لیٹ پہنچی۔''

''وین لیٹ نہیں پہنچی تو لیٹ پہنچی کسی کے ساتھ گئی ہو گی، بتا کس کے ساتھ گئی تھی؟ بولو چپ کیوں ہو گئی ہو؟ دیکھ لڑکی اگر تو نے بھی کسی کے ساتھ بھاگنا ہے تو تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے بتا کر بھاگنا کم از کم اپنے سر میں مارنے کے لئے لوگوں کے جوتے تو اکٹھے کر

لوں یا پھر اپنے اوپر خاک ڈالنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ دیکھ اللہ کے لئے مجھے بتا کر بھاگنا تجھے روکوں گا نہیں بالکل نہیں روکوں گا۔'' وہ سچ مچ ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ حبہ ہچکیوں سے روتی ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور دونوں پاؤں پکڑ لئے۔

''بابا پلیز ہم پہ بھروسہ رکھیں...... میں کبھی ایسی نوبت نہیں آنے دوں گی آپ، آپ کی عزت سے بڑھ کے میرے لئے کچھ بھی نہیں آپ مجھ پہ اعتماد کریں، پلیز بابا میں آپ کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گی...... آپ کا اعتماد ایک بیٹی نے توڑا ہے اور آپ کا اعتماد جوڑے گی بھی ایک بیٹی ہی صرف ایک بار مجھے پہلے جیسی حبہ سمجھ کر دیکھئے۔'' وہ ان کے پاؤں پکڑے روتی ہوئی ہچکیاں لے رہی تھی وہ یکدم سامنے سے ہٹ گئے اور نجانے کس چیز کو ٹھوکر مارتے بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔

حبہ دو زانو جھکی ہوئی تھی لیکن وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ انہوں نے اس کے آنسوؤں کو بھی قابل اعتنا نہیں جانا تھا وہ ان کی اس قدر بے رحمی اور بے اعتمادی پہ اور زیادہ تڑپ تڑپ کے روئی تھی اور خدیجہ بیگم کا کلیجہ مٹھی میں آ گیا تھا انہوں نے قریب آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

گھر سے باہر بہادر نظر آنے والی حبہ الٰہی گھر کی چار دیواری میں دکھ اور بے اعتباری کے نشتر کھاتے ہوئے بے حد کمزور اور نڈھال ہو گئی تھی۔

اسے آج تک روحان کا مارا ہوا تھپڑ نہیں بھولا تھا۔ تھپڑ تو شاید وہ بھلا ہی دیتی لیکن تھپڑ کے ساتھ ملنے والی نفرت اور حقارت کو کیسے بھلاتی کیونکہ انسان نے ہمیشہ جن آنکھوں میں پیار اور محبت کے دیپ جلتے دیکھے ہوں ان آنکھوں میں نفرت اور غصے کے شعلے دیکھنا بہت اذیّت ناک لگتا ہے اور حبہ نے بھی ایسی اذیّت اٹھائی تھی اسی لئے اس میں شدت بڑھ گئی تھی۔

''میں کیا کروں امی؟ میں ایسا کیا کروں کہ بابا پہلے جیسے ہو جائیں وہ...... وہ اپنی نفرت کی دیواریں گرا ڈالیں بھول جائیں سب کچھ...... بھول جائیں کہ ان کی چار بیٹیاں تھیں۔'' وہ بلک بلک کے کہہ رہی تھی اور خدیجہ بیگم نے اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کر لئے۔

بے بسی کا وہ مقام تھا کہ وہ اس بیٹی کو بھی بددعا نہیں دے سکتی تھی جو اپنی بہنوں کی زندگی عذاب کر گئی تھی اور نہ ہی شوہر سے کچھ کہہ سکتی تھیں جن کا اعتماد کرچی کرچی ہوا تھا اور اس سارے قصے میں عذاب تو حبہ، رابیہ اور ہانیہ جھیل رہی تھیں جن کو روز زہر میں بجھے تیر کھانا پڑتے تھے عذاب تو

ان کی ممتا جھیل رہی تھی جس کا بیٹا ایک سال سے گھر نہیں آیا تھا پھر بھی صبر کئے بیٹھی تھیں اور رب تعالیٰ سے بھلائی اور بہتری کی دعا کر رہی تھیں۔

''کیا ہوا کچھ پریشان لگتے ہو؟'' بھرجائی نے اس کے مضبوط شانے پہ ہاتھ رکھ کے انتہائی اپنائیت سے پوچھا وہ آج ہی ویک اینڈ پہ آفریدی حویلی آیا تھا لیکن سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی الجھا الجھا متفکر سا نظر آ رہا تھا۔

''آپ کا وہم ہے۔'' وہ بات کو مسکرا کر ٹالتے ہوئے اٹھنے لگا جب بھرجائی نے اسے ہاتھ پکڑ کر بیٹھے رہنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

''ماں بہنوں کے وہم بے بنیاد نہیں ہوتے تم کچھ چھپا رہے ہو تمہارے لالہ سائیں بھی تمہاری طرف سے بہت فکر مند ہیں کیا بات ہے بتاتے کیوں نہیں۔'' بھرجائی کے لہجے میں خفگی در آئی۔

''بھرجائی مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔'' وہ بات کو مذاق کے رنگ میں بدلتے ہوئے ان کی سمت پلٹا۔

''تم کیا سمجھتے ہو مجھے معلوم نہیں؟'' انہوں نے رجب کے بالوں میں ہاتھ پھیرا وہ ان کی بات کا مفہوم سمجھ کر چپ ہو گیا۔

''بیٹے کبھی ماؤں سے چھپ نہیں سکتے، تم کیسے چھپ سکتے ہو تمہاری آنکھیں تمہارے دل کا آئینہ ہیں اور اس آئینے میں آج کل اس کا عکس ابھر رہا ہے جو تمہارے دل کی حکمران بن بیٹھی ہے، بولو کون ہے وہ۔''

بھرجائی تو سچ مچ اس کے دل میں جھانک رہی تھیں۔ رجب نے نظر جھکا لی۔

''رجب آخر تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟ کیا معاملہ ہے کیوں اندر ہی اندر گھٹ رہے ہو؟''

''بھرجائی میرے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں، ہاں یہ سچ ہے کہ وہ میرے دل کی حکمران بن چکی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور آپ جانتی ہیں جب حکمران رعایا سے نفرت کرنے لگے اس کا انجام تباہی و بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، شاید میرا دل بھی تباہی کے دہانے پہ پہنچ چکا ہے۔''

''اللہ نہ کرے! کیسی منحوس بات منہ سے نکال رہے ہو......'' انہوں نے دل تھام لیا تھا۔

"تو اور کیا کروں بھرجائی، میں بے بس ہو چکا ہوں...... میرے سب اختیار ختم ہو چکے ہیں میں سچ کہہ رہا ہوں بھرجائی میں ہار چکا ہوں...... ہار چکا ہوں اس کے سامنے۔"

وہ کہتے کہتے انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنے بالوں میں ہاتھ پھنسا چکا تھا۔حبہ کا روّیہ دیکھ کر وہ اتنے دنوں سے سچ مچ بہت منتشر اور مضطرب سا رہنے لگا تھا اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ حبہ الٰہی کا دِل اپنی طرف سے صاف کر کے اسے اپنے دل کا حال کیسے بتائے کہ وہ یقین بھی کر لے۔اسی اضطراب میں اٹھ کر چلا گیا لیکن اپنا موبائل صوفے پہ ہی بھول گیا تھا اور اس کی یہی بھول زریاب آفریدی کے ہاتھ لگ گئی وہ ابھی ابھی زمینوں سے لوٹے تھے اور ریلیکس ہونے کی غرض سے صوفے کی بیک سے پشت ٹکا کر بیٹھے تو اچانک ہی آس پاس موبائل کی رنگ سنائی دینے لگی۔انہوں نے آگے پیچھے دیکھا پھر کشن کے قریب رجب کا موبائل نظر آ گیا۔آفاق کا نام جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو رجب تم بغیر بتائے گاؤں چلے گئے۔" آفاق کے لہجے میں خفگی تھی۔

"تمہیں کافی ڈھونڈا لیکن تم ملے ہی نہیں۔" زریاب آفریدی دلچسپی سے مسکراہٹ روک کر بولے۔

"کون؟ لالہ سائیں کیسے ہیں آپ؟" آفاق فوراً سنبھل گیا۔

"اللہ کا شکر ہے تم سناؤ کیسے ہو، گاؤں ہی آ جاتے۔"

"دل تو چاہ رہا تھا لیکن ممی کی وجہ سے میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔" آفاق کی مما بلڈ پریشر کی اور نفسیاتی مریضہ تھیں اسے ہمہ وقت اپنی مما کی دیکھ بھال کے لئے گھر رہنا پڑتا تھا۔

"اور سناؤ کیا کر رہے ہو آج کل؟" زریاب آفریدی سنجیدہ ہو چکے تھے چند منٹ کی گفتگو کے بعد کال بند ہوئی اور وہ موبائل صوفے پہ دوبارہ رکھنے والے تھے جب نظر موبائل کی اسکرین سے ٹکرا گئی موبائل کی اسکرین وال پہ کسی لڑکی کی تصویر تھی اور اس تصویر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ نیچرل تصویر ہے اور اسی نیچرل پن کے احساس سے متجسس ہو کر انہوں نے پکچرز فائل اوپن کی اور اس پکچر کی ڈیٹیل نکالی۔

"حبہ آفریدی۔" یکدم ان کو جھٹکا لگا تھا۔وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے انہوں نے اس تصویر کو دوبارہ، سہ بارہ دیکھا لیکن 'حبہ آفریدی' والی اُلجھن دور نہ ہوئی آخر کون تھی وہ لڑکی جو حبہ آفریدی بھی بن چکی تھی اور وہ ابھی تک لاعلم تھے۔کہیں رجب نے کسی سے شادی یا نکاح

وغیرہ تو......اس خیال کے آتے ہی ذہن میں ایک جھماکا ہوا تھا سوچ کی پرواز کہیں سے کہیں جا پہنچی اور وہ حیرت سے گنگ بس دیکھے جا رہے تھے۔

"پتر یہاں کیوں کھڑے ہو؟ زمینوں سے کب آئے؟" گل جانی تسبیح کے دانے گراتی اندر داخل ہوئی تو زریاب آفریدی کو تنہا کھڑے دیکھ کر حیران ہوئیں۔انہوں نے خالی خالی نظروں سے گل جانی کو دیکھا تو گل جانی کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے ٹھٹک گئیں۔

"پتر خیر تو ہے؟" دل ہول رہا تھا اسی لئے قدرے آہستگی سے استفسار کیا۔

"ہوں! ہاں......جی......جی خیریت ہے آپ بیٹھیں سب خیریت ہے ہم ابھی آتے ہیں آپ بیٹھیں۔" وہ بے ربط سا بولتے ہوئے موبائل سمیت ڈرائنگ روم سے نکل گئے تھے، تھوڑی دیر بعد رجب اپنا موبائل ڈھونڈتا ہوا پورے ڈرائنگ روم کو الٹ پلٹ کر چکا تھا مگر موبائل نہیں مل رہا تھا۔

"جی لالہ سائیں آپ نے مجھے بلایا تھا؟ وہ گہری سوچ میں گم بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔جب آفاق بدر کی آواز سن کر سوچ سے دامن چھڑا کر ہوش کی دنیا میں لوٹ آئے۔

"ہاں آؤ بیٹھو! کیسے ہو؟" انہوں نے خود بھی صوفے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی ٹھیک ہوں سب خیریت تو ہے نا؟ رجب کہاں ہے؟" وہ پورچ میں دیکھ چکا تھا کہ رجب کی گاڑی غائب ہے اسی لئے تشویش ہو رہی تھی۔

"سب خیریت ہے یا نہیں یہ تو تم بتاؤ گے البتہ رجب اس وقت گاؤں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" ان کے مشکوک انداز اور مبہم باتوں سے آفاق اندر ہی اندر گھبرا رہا تھا کہ نجانے کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔

"کیا بات ہے تم سوچ میں پڑ گئے ہو؟" انہوں نے ہی اسے چونکایا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ کہیے میں سن رہا ہوں۔" وہ اپنے حواس، تاثرات اور اندازِ نشست درست کرتے ہوئے پوری طرح سے متوجہ ہوا۔

"آفاق! اولاد بڑی ہو یا چھوٹی، ماں باپ سے اس کی حرکتیں ڈھکی چھپی نہیں رہتیں نہ بچپن میں نہ جوانی میں کیونکہ ماں باپ کے ہاتھوں کا لمس اور اولاد کی حرکتوں کے انداز ایک

دوسرے میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ میں نے دو ماہ کے رجب کو ان ہاتھوں سے پالا ہے، میرے لئے وہ ابھی بھی بچہ ہے لیکن حقیقتاً دیکھا جائے تو وہ بچہ نہیں رہا اور کوئی بھی مکمل مرد عورت کے وجود سے نظر نہیں چرا سکتا، وہ بھی نہیں چرا سکا۔ جب سے اس نے کالج، یونیورسٹی میں قدم رکھا ہے ہزاروں لڑکیوں سے تعلقات رکھ چکا ہے وہ سمجھتا ہے لالہ سائیں گاؤں میں ہوتے ہیں اس لئے کچھ نہیں جانتے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اولاد سے اتنی آسانی سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا مجھے معلوم تھا کہ وہ محض دل لگی کرتا ہے اس لئے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کے اسے پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اب معاملہ سنجیدہ ہے اس لئے ہم چپ نہیں رہ سکتے اور چاہتے ہیں کہ اس سے باز پرس کرنے سے پہلے تم سے جان لیں کہ سارا چکر کیا ہے اور یہ حبہ نامی لڑکی کون ہے؟'' انتہائی تحمل آمیز انداز میں بات کرتے کرتے جب انہوں نے سوال کیا تو آفاق بُری طرح گڑبڑا گیا۔

''حبہ؟ کس حبہ کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''تم کس حبہ کو جانتے ہو؟''

''نن...... نہیں لالہ سائیں میں کسی حبہ کو نہیں جانتا......'' آفاق کو معاملہ زیادہ سنگین محسوس ہوا تو بات سے انکاری ہو گیا۔

''دیکھو آفاق، تم ہمارے لئے رجب جیسے ہو ہم نے کبھی بھی تمہیں اس کا دوست نہیں سمجھا اسی لئے امید ہے کہ تم غلط بیانی سے کام لے کر چھپانے کی کوشش نہیں کرو گے سچ سچ بتاؤ حبہ کون ہے وہ حبہ جس کو اس نے حبہ آفریدی بنا لیا ہے۔''

''کیا حبہ آفریدی؟'' آفاق اچھل پڑا۔

''کیا اب بھی انکار کرو گے؟'' انہوں نے موبائل آن کر کے آفاق کے سامنے کیا تو آفاق حبہ الٰہی کی تصویر دیکھ کر نظر چرا گیا، یہ اس کے چہرے کا سائیڈ پوز تھا، چہرہ واضح نہیں تھا اور نجانے اس نے یہ تصویر کیسے اور کب لی تھی لیکن جب بھی لی تھی اسے اندازہ تھا کہ بہت مشکل سے لی ہو گی۔

''بولو آفاق ہم سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں جو بھی بات ہے صاف صاف بتاؤ ہم آج شہر اسی لئے آئے ہیں کہ بات کی اصلیت معلوم ہو سکے۔'' آفاق کو علم ہو چکا تھا کہ اب کچھ بھی چھپانا بے سود ہے اسی لئے آہستہ آہستہ سب کچھ بتاتا چلا گیا اور وہ پوری توجہ سے سنتے رہے۔

''وہ لڑکی ہے کون اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟''

''لالہ سائیں! وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے اس کے والد صاحب شاید واپڈا کے شعبے سے وابستہ ہیں کافی اچھے اور شریف لوگ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ رجب کو پسند نہیں کرتی اور رجب یکطرفہ دیوانگی میں اس انتہا کو پہنچ چکا ہے کہ اسے حبہ الٰہی کی بجائے حبہ آفریدی لکھنے لگا ہے یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ بھی اس کی دیوانگی کی ایک جھلک ہے ورنہ دوسری طرف ایسا کوئی بھی جذبہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔''

آفاق نے ہر مسئلہ سلجھا کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا اور ان سے اجازت لے کر چلا گیا، لیکن وہ نجانے کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے ان کی خیالات اور جذبات عجیب سی کشمکش کا شکار تھے۔

❁......❁......❁

انسان جذبات کے بھنور میں اُلجھ جائے تو اس سے نکلنا مشکل ترین مرحلہ بن جاتا ہے وہ بھی اپنے جذبات کے بھنور میں اُلجھ گیا تھا، کبھی اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگتا، اپنے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کرتا اور کبھی اپنے آپ کو سرپٹ دوڑتے ہوئے من مانی کر گزرنے پہ اکساتا تھا لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ من مانی سے وہ اور بھی روٹھ جائے گی، مشتعل ہو جائے گی اور وہ اسے مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے دل پہ جبر کئے رہتا لیکن اس کے دل سے کدورت نکالنے کی کوشش وہ اب بھی کرتا تھا گاؤں سے واپسی پہ وہ عہد کر کے آیا تھا کہ حبہ سے معافی مانگ کر ہمیشہ کے لئے اس سے نظر چرا لے گا بھول جائے گا کہ وہ اس کے آس پاس ہوتی ہے مگن ہو جائے گا۔ کسی اور دنیا میں۔ لیکن معاملہ یہاں بھی الٹ ہو گیا تھا تقدیر اس کی جلد بازی کو ایک اور امتحان میں مبتلا کر گئی تھی۔

اس روز بھی حبہ بس سٹاپ پہ کھڑی وین کا انتظار کر رہی تھی جب وہ گاڑی سے اُتر کر اس کے قریب آ گیا تھا۔

''حبہ! میں جانتا ہوں آپ کو میری بات سننا بھی گوارا نہیں لیکن پھر بھی ریکویسٹ کرتا ہوں کہ آپ میری بات صرف آخری دفعہ سن لیں۔'' وہ اس کے سامنے نظر جھکائے کھڑا تھا۔

''دیکھئے مسٹر رجب آفریدی! اس وقت میری وین آنے والی ہے پلیز آپ مجھے پریشان مت کریں چلے جائیں یہاں سے پلیز......'' وہ دبے لہجے میں بولتے ہوئے اپنا غصہ بھی دبا رہی تھی۔

"نہیں پلیز بلیوی! میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتا آپ کی عزت مجھے خود سے بھی زیادہ عزیز ہے لیکن اس روز جو کچھ آپ نے میرے کلاس روم میں آکر کہا اور......"

"پلیز اسٹاپ اٹ مجھے کوئی بات نہیں سننی چلے جائیں یہاں سے ورنہ لوگوں کو اکٹھا کرلوں گی۔" اس کے اس قدر سخت تیور اور جارحانہ انداز سے اس کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ وہ بے بسی سے دیکھنے لگا کہ اب کیا کرے۔

"حبہ! ایک بار آپ مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع تو دیں۔"

"میں تم جیسے آدمی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی تم چاہتے ہو کہ بات سنوں، ہونہہ۔"

وہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی ایک بے اختیاری کے عالم میں رجب آفریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حبہ کی پوری ہستی جھنجھنا اٹھی۔

"حبہ آپ رجب آفریدی کی زندگی ہیں اور زندگی کے لئے انسان کیا کچھ کرسکتا ہے یہ آپ بخوبی جانتی ہوں گی۔" آہستگی سے کہتا وہ اس کا ہاتھ چھوڑ چکا تھا، لیکن دو منٹ پہلے رکنے والی وین میں بیٹھے غفار الٰہی اس منظر کو دیکھ چکے تھے۔

گھر کے در و دیوار پہ موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ وحشت گھر کے اندر باہر رقص کرتی پھر رہی تھی اعتماد کا وجود دھجی دھجی ہوا تھا اعتبار کی ڈور ٹوٹی تھی کیا یہ کسی موت سے کم تھا اور حبہ وہ تو جیسے پتھر کا مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن پہ صرف اور صرف رجب آفریدی کا عکس جما ہوا تھا بس وہی نظر آ رہا تھا اور غفار الٰہی تو جیسے اپنی تمام عزت کی جمع پونجی لٹا کر خود خاک کا ڈھیر بنے بیٹھے تھے۔ جو کر سکتے تھے کر چکے تھے اب ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا لیکن اس خاموشی میں اک کنکر گرا جو انہیں عجیب سے فیصلے پہ آمادہ کر گیا تھا۔

"ہم لوگ آپ سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں آپ اپنی بڑی بیٹی......"

"کہاں سے آئے ہو؟" غفار الٰہی بہت سرد و سپاٹ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"ہمارا تعلق پشاور سے ہے رجب آفریدی چھوٹا بھائی ہے ہمارا حبہ کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے حبہ جانتی ہے اُسے۔" زریاب آفریدی کو نہیں معلوم تھا کہ اپنے بھائی کی محبت میں وہ اس کی محبت تو مانگنے آ گئے ہیں، لیکن محبت مانگتے مانگتے کبھی کبھی عذاب بھی حصے میں آجاتے ہیں۔

"شادی کب کرنا چاہتے ہو۔" اب کی بار زریاب آفریدی بُری طرح چونکے اور سامنے بیٹھے غفار الٰہی کی دماغی حالت پہ شبہ ہوا تھا جو غیر معمولی باتیں کر رہے تھے۔

"جب آپ مناسب سمجھیں ہم بارات لے کر آئیں گے۔"

"جمعہ کو آجانا رخصتی ہو جائے گی۔" وہ کہہ کر اٹھ گئے اور زریاب آفریدی کو ساکت و صامت چھوڑ گئے وہ گنگ بیٹھے تھے انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ ایسا فیصلہ ایک سگا باپ اپنی بیٹی کے لئے کرسکتا ہے وہ بھی ایسا باپ جو مکمل ہوش و حواس میں ہو......

وہ وہاں سے اُلجھے اُلجھے واپس آئے تھے، بھرجائی اور گل جانی کو رجب کی پسند دیکھنے اور مثبت جواب ملنے کا بے چینی سے انتظار تھا جیسے ہی زریاب آفریدی نے آکر اطلاع دی وہ خوشی سے جھوم اٹھیں۔

اور جب اس خبر نے رجب کے کانوں تک رسائی حاصل کی تو وہ پتھرا گیا۔

"لالہ سائیں یہ...... یہ کیسے؟"

"پگلے! تو ہم سے یہی معاملہ چھپا رہا تھا نا؟" انہوں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن لالہ سائیں؟" وہ بے یقینی سے کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

"بس اب دلہن گھر لانے کی تیاری کر، دن بہت کم رہ گئے ہیں۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر چلے گئے تو بھرجائی نے گھیر لیا پھر گل جانی واری صدقے جانے لگیں۔ اور وہ سب کو چھوڑ کر حیران پریشان سا سیدھا آفاق کے پاس آ گیا تھا اور آفاق بھی اس خبر سے متعجب سا رہ گیا۔ اسے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر یہ ہی حقیقت تھی۔

انسان جس کام کے ہو جانے کی امید ہی نہ رکھتا ہو جس چیز کی اسے توقع ہی نہ ہو وہ ہو جائے تو وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتا رہتا ہے اسے خواب سے حقیقت تک سفر طے ہو جانا ایک فسانہ لگنے لگتا ہے اور وہ بھی چپ چاپ اس فسانے کو دیکھ رہا تھا۔ حبہ الٰہی آج 'حبہ آفریدی' کے روپ میں سر تا پا سجی سنوری اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ "شادی مبارک ہو۔" عروج اور فرہاد کاشمیری بیک وقت مبارکباد دے کر پھول اور گفٹ دے رہے تھے۔

"یار تیری محبت سچی تھی تو جیت گیا اللہ ایسا مقدر ہر کسی کا لکھے۔"

تھوڑی دیر بعد فرہاد نے رجب سے سرگوشی کی اور رشک کا اظہار کیا تھا رجب اپنی جیت پہ خود مشکوک تھا کسی کے رشک پہ فخر کیسے محسوس کرتا اس کی بات سن کر خاموش ہی رہا۔

شادی کافی دھوم دھام سے اپنے انجام کو پہنچی لیکن رخصتی کے وقت روتے روتے اچانک حبہ کے آنسو تھم جانا خدیجہ بیگم کا دل چیر گئے تھے رابعہ اور ہانیہ بھی اس سے لپٹ کر بے تحاشا روئی تھیں مگر وہ خاموشی سے آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ اب اس کے دائیں بائیں رجب آفریدی کی بھرجائی اور کزنز تھیں۔

''میں بہت بُرا تھا حبہ! بہت زیادہ بُرا تھا لیکن محبت بُرے انسان کے من میں سما جائے تو تن کی تمام برائیاں بھی نکال کے پھینک دیتی ہے۔'' من کے ساتھ ساتھ تن بھی معطر اور پاکیزہ کر دیتی ہے تمہاری محبت میرے من میں اتری تو میں تن کی تمام بُری خواہشات سے نکل آیا۔ میں جو ہمیشہ حسن کو چھو کر محسوس کرنے کا قائل تھا، تمہاری پاکیزہ خوبصورتی کو دور سے دیکھ کر دل کو سیراب ہوتا محسوس کرنے لگا تھا شاید یہی پاکیزگی تمہاری انفرادیت تھی کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے تمہاری طرف جھکنے لگا لیکن شاید میرا دل میری آنکھوں میں بس چکا تھا، جس کی وجہ سے میرے جذبات کی تشہیر ہو گئی اور معاملہ تم تک پہنچ گیا۔ اچھے لفظوں میں اچھے انداز میں پہنچتا تو مجھے خوشی بھی ہوتی۔ لیکن غلط انداز اور غلط لفظوں نے میرے جذبات کی خوبصورتی مجروح کر ڈالی۔'' اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ آہستگی سے کہتا اطمینان، سکون، سرشاری اور چاہت کی وادی میں گم بے پناہ خوش تھا۔ حبہ کا پرسوز حسن اس وقت دلہناپے کے سنگھار سے مزید دو آتشہ ہو رہا تھا اور وہ اسے بار بار یوں دیکھ رہا تھا جیسے ابھی ابھی خواب ٹوٹے گا اور منظر بدل جائے گا اور وہ پہلے کی طرح یونیورسٹی کے گیٹ سے بس سٹاپ تک اس کے پیچھے پیچھے جا رہا ہوگا اور وہ اپنا غصہ اس پہ اتار کر چلی جائے گی۔

''کیا بات ہے، تھک گئی ہو؟'' اتنی نرمی سے تو آج تک وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوا تھا نجانے اس کے معاملے میں دل اتنا نرم کیوں ہو جاتا تھا۔ وہ نفی میں گردن ہلا کر رجب آفریدی کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی جن میں اس کے اپنے ہاتھ دبے ہوئے تھے۔

''کھانا منگواؤں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا تو دوبارہ انکار میں جواب ملا تھا۔

''اُداس ہو، گھر والوں کے لئے؟''

''نہیں......''

''نیند آ رہی ہے؟''

''نہیں!''

''میں ڈسٹرب کر رہا ہوں؟''

''نہیں!'' ہر جواب میں نہیں سن کر وہ دلچسپی سے سوال کر رہا تھا اور آخری سوال کے جواب میں یکدم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''یعنی کہ میں ڈسٹرب کر بھی لوں تو تم نہیں میں جواب دو گی یار اس سے اچھی بات تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔''

وہ شرارت سے پوچھتا اس کی چوڑیوں کو چھیڑنے لگا۔ اپنی خوشی اور سرشاری میں اس نے حبہ کے تاثرات ابھی تک نوٹ نہیں کئے تھے اگر ایک بار کر لیتا تو پھر ساری خوشی اور سرشاری رخصت ہو جاتی اور وہ بھول جاتا کہ اس نے حبہ الٰہی کو حاصل کر لیا ہے بلکہ یہ یاد رکھتا کہ کسی کو حاصل کر کے بھی۔ نہ کر پانا کیسا ہوتا ہے۔ لاحاصل کی اذیت کیسی ہوتی ہے جو موجود بھی ہو اور بظاہر حاصل بھی ہو......لیکن وہ ایسی اذیت سے بے خبر رات کی مدہوش خوبصورتی میں ڈوبا کسی اور دنیا کی سیر کر رہا تھا۔

''میرا نیگ؟'' صبح صبح بھرجائی دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی اپنے رسم و رواج کے مطابق نیگ مانگ رہی تھیں اور وہ انہیں ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا ہوا بھرجائی کیا ملا نیگ میں؟'' رجب کی پھوپھی زاد لالہ رخ بھی قریب چلی آئی۔

''ابھی اس کی نیند ہی پیچھا نہیں چھوڑ رہی نیگ کیا دے گا بھلا؟'' بھرجائی نے اسے خفگی سے گھورا۔

''بھرائی پلیز دوپہر میں دے دوں گا ابھی مجھے کچھ خبر نہیں میرا والٹ کہاں رکھا ہے اور اگر رکھا ہے تو اس میں کیش بھی ہے یا نہیں......'' اس نے بھرجائی سے بھی زیادہ خفگی ظاہر کی۔

''ٹھیک ہے مت دو پھر پورے سات روز کے لئے اپنی دلہن کو بھول جانا۔'' وہ کہہ کے مڑ گئیں اور چند سیکنڈ بعد جب اسے بھرجائی کی دھمکی سمجھ آئی تو بوکھلا کے ان کے پیچھے لپکا۔

''بھرجائی ارے رکیں نا بھرجائی کیسا ظلم کرنے چلی ہیں۔'' اس نے بھرجائی کو

کندھوں سے تھام لیا۔

"مطلب کی بات کہو ہمیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔" وہ اب اجنبیت دکھا رہی تھیں۔

"پیاری بھرجائی! آپ رکیں آپ کا نیگ ابھی لے کر آتا ہوں۔" وہ انہیں وہیں کھڑا کر کے بیڈروم میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ڈبہ ہاتھ میں لئے آ گیا۔

"یہ رہا آپ کا نیگ۔" اس نے خفگی سے کہا چہرہ بھی خفا خفا نظر آ رہا تھا۔ انتہائی بھاری موٹے موٹے سونے کے کنگن بے حد خوبصورت تھے بھرجائی کو یقین نہ آیا کہ لاپروا سا رجب آفریدی ان کے نیگ کے لئے پہلے سے انتظام کئے ہوئے تھا۔

"جیتے رہو اللہ تجھے لاکھوں خوشیاں دے اور تیری جوڑی سلامت رکھے۔" اس کے ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ وہی ان کا بیٹا ہے آج تک رجب کے ہوتے ہوئے انہوں نے اولاد کی کمی محسوس نہیں کی تھی نہ ہی کبھی اللہ سے شکوہ کیا تھا کہ ان کی گود کیوں خالی رکھی شاید انہیں رجب کی صورت میں بیٹا نظر آتا تھا۔

"اب میری دلہن میرے پاس ہی رہے گی نا؟" اس نے شرارت سے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

شام کو ولیمہ کی رسم تھی زریاب آفریدی نے بے شمار لوگوں کو انوائٹ کر رکھا تھا اور رجب نے بھی اپنے دوستوں کو فیملیز سمیت مدعو کیا ہوا تھا پورا دن حبہ کمرے میں لڑکیوں کے درمیان بیٹھی رہی۔

گاؤں کی عورتیں کافی اشتیاق سے آفریدیوں کی چھوٹی بہو دیکھنے آ رہی تھیں سب کو دلہن بہت پسند آئی مگر دلہن کے چہرے پہ مسکراہٹ کی کمی بھی سب کو محسوس ہوئی تھی اور یہ کمی بھرجائی بھی محسوس کر چکی تھیں۔

"رجب ادھر آؤ۔" انہوں نے اپنے جاننے والوں کے ساتھ باتوں میں مصروف رجب کو قریب بلا لیا۔

"جی بھرجائی خیریت؟" وہ ان کے چہرے پہ تفکرات کے بادل منڈلاتے دیکھ چکا تھا۔

"تمہارا اپنی دلہن سے جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی کیوں؟ آپ کو ایسا کیوں لگا؟" وہ سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"بس مجھے لگا کہ دلہن خوش نہیں لگ رہی صبح سے چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کچھ کھانا وغیرہ بھی نہیں کھایا اور اس کے گھر والے بھی ابھی تک نہیں آئے کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

"ارے بھرجائی کیوں پریشان ہوتی ہیں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے جہاں تک اس کی چپ اور خوش لگنے کی بات ہے تو آپ ذرا خود سوچیں ایک دم سے جب کوئی اپنوں سے جدا ہو کر ایک نئی اور اجنبی جگہ پہ آتا ہے تو وہ خوش کیسے لگ سکتا ہے اور چپ تو اس نے ہونا ہی ہے یہ جو ڈھیر ساری خواتین اس کے پاس بیٹھی ہیں کیا وہ ان کی زبان سمجھتی ہے؟"

رجب نے ڈرائنگ روم میں بیٹھی عورتوں کے جم گھٹے میں خاموش سی حبہ کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بھرجائی کو سمجھایا مجبوراً بھرجائی کو اس کی بات سے متفق ہونا پڑا۔

"ایک بات سنو!" وہ جاتے جاتے دوبارہ مڑ آئیں اور رجب کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"جی سنائیے؟" وہ نظروں کا زاویہ بدل چکا تھا۔

"کتنا پیار کرتے ہو اس سے؟" ان کے انداز میں سنجیدہ سی شرارت تھی۔

"اتنا پیار کہ مر جاؤں تو بھی اسی کا نام....."

"اللہ نہ کرے کیسی منحوس باتیں کرتے ہو کتنی اچھی بات پوچھی تھی لیکن تم نے تو دل ہی دہلا کے رکھ دیا ہے۔" بھرجائی نے دہل کے اس کی بات کاٹ دی۔ لہجے میں خوف سمٹ آیا تھا۔

"میرا مطلب تھا کہ اتنا پیار کرتا ہوں کہ دل چاہ رہا ہے سب عورتوں کو ہٹا کر خود اس کے سامنے جا کر بیٹھ جاؤں اور اسے دیر تک دیکھتا رہوں۔" وہ ان کا دل بہلانے کے لئے بات بدل گیا۔ وہ مسکرا کر اس کے سر پہ چپت لگا چکی تھیں۔

وہ ہنستا ہوا دوبارہ مردوں کے لئے مخصوص کئے حصے کی سمت بڑھ گیا مگر شام کو اس کی ساری خوشی اور سرشاری ہوا ہو گئی۔

"حبہ...... تمہارے امی، بابا اور سسٹرز ابھی تک نہیں آئیں، لالہ سائیں اتنا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ ولیمہ کے لئے دلہن بنی حبہ کے پاس سٹیج پہ اس کے برابر بیٹھا تشویش کا اظہار کر رہا تھا۔

"وہ نہیں آئیں گے۔" انتہائی سرد لہجے میں انتہائی مختصر جملہ۔ رجب نے چونک کے دیکھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" اس کے استفسار کے باوجود وہ خاموش رہی۔

"حبہ میں کیا پوچھ رہا ہوں، وہ کیوں نہیں آئیں گے؟"

"اس کیوں کا جواب سرعام مت پوچھو رجب آفریدی بہت اذیت اٹھاؤ گے۔" اس نے کہتے ہوئے جن نظروں سے رجب کو دیکھا اسے اپنی محبت کا شفاف فلک تاریک ہوتا نظر آ رہا تھا اسے لگا آج بھی اس کے سامنے حبہ الٰہی بیٹھی ہے حبہ آفریدی نہیں۔"

"لیکن کچھ وجہ بھی تو معلوم ہو وہ کیوں نہیں آ رہے؟ اگر ہم سے کچھ غلطی کوئی بھول ہوئی ہے تو ہم معافی بھی مانگ لیں گے۔" زریاب آفریدی حبہ کے قریب کھڑے نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے مگر رجب کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا وہ جان چکا تھا کہ حبہ کے دل میں اس کے لئے اس وقت کیا ہے اور آئندہ کیا ہوگا؟

"وجہ اب مٹ نہیں سکتی اور معافی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اسی لئے آپ لوگ اپنے احساسات کی طرف دھیان دیں کسی اور کی فکر مت کریں۔" حبہ کا لہجہ اس کا انداز اس کی باتیں عجب سی تھیں زریاب آفریدی بھی اُلجھ کر رہ گئے۔

"لیکن بیٹا تم جان سکتی ہو ولیمہ کی رسم میں اگر دلہن کے گھر والے شریک نہ ہوں تو لوگ کیسی کیسی باتیں کریں گے۔"

"ہونہہ کیسی کیسی باتیں نہیں کریں گے صرف اتنا کہیں گے کہ لڑکی بدکردار تھی جو ماں باپ نے بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکی ہے یا پھر لاوارث ہے اس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں اور میرا خیال ہے کہ لوگوں کا پہلا خیال درست ہے، میری بدکرداری کی وجہ سے ہی تو میرے ماں باپ نے مجھے یوں پھینکا کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ کسی نیک پروین اور باکردار لڑکی کا باپ ہوش وحواس کے باوجود اس طرح بیاہ سکتا ہے؟"

اس نے زریاب آفریدی کی آنکھوں میں دیکھ کر بے خوف وخطر کہا تھا اور رجب کو یوں لگا وہ کسی پہاڑ کے ملبے تلے دبتا جا رہا ہو حبہ کی دماغی حالت کافی مشکوک نظر آ رہی تھی۔

"رجب۔" زریاب آفریدی نے اس کا کندھا ہلایا۔

"جی لالہ سائیں" اس نے بے حد آہستگی سے پوچھا۔

"تم حبہ کو لے کر اوپر کمرے میں جاؤ اور ذرا آرام سے پوچھنے کی کوشش کرو کہ وہ لوگ کیوں نہیں آ رہے۔"

"لالہ سائیں وہ نہیں بتائے گی۔" رجب کو احساس ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔

"تم کوشش تو کرو اور میرا خیال ہے اس کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔" زریاب آفریدی کے اصرار پہ اس نے حبہ کو اسٹیج سے اٹھنے کو کہا مگر وہ اپنی جگہ پہ یوں بیٹھی رہی جیسے کبھی ہلے گی نہیں۔

"حبہ پلیز ہم تھوڑی دیر تک واپس آ جائیں گے اور بیڈ روم تک ہی تو جانا ہے۔" رجب ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ نجانے کیسے اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

"کیوں؟ کیوں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟ جو بھی کہنا ہے یہیں کہو سب کے سامنے کہو، کیا چھپانے کی کوشش کرتے ہو پہلے کچھ چھپایا ہے جو آج چھپانے کی کوشش کر رہے ہو بولو کیوں لے جا رہے ہو مجھے؟"

وہ یکدم چیخ اٹھی تھی اور پورے ہال میں یکدم سکوت چھا گیا۔ زریاب آفریدی، رجب آفریدی، بھرجائی، گل جانی، آفاق، فرہاد، مدثر اور مہمانوں کے علاوہ رجب کے خاندان والے بھی بھونچکا رہ گئے تھے۔ دلہن بنی حبہ آفریدی شدید غم وغصے کی کیفیت میں گہری ذہنی توازن کھو چکی تھی وہ رجب کو قہر بار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"پلیز حبہ یوں لوگوں میں تماشا مت......"

"تماشا، تمہارا تماشا کیا بنے گا رجب آفریدی؟ تماشا تو میرا بنایا تھا سڑک کنارے میرا تماشا تم ہی نے تو لگایا تھا کیا بھول چکے ہو، تم تماشا لگا کر بھول چکے ہو لیکن میں نہیں بھولی رجب آفریدی، میں اپنا تماشا نہیں بھولی میں اپنی بدکرداری نہیں بھولی میں بدکردار ہوں میں بدچلن ہوں شادی سے پہلے ہی تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منا چکی ہوں گلچھرے اڑاتی رہی ہوں اور بھلا کیا باقی ہے؟" وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی اور وہاں موجود لوگ دم بخود اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ رجب خاک کا ڈھیر بن چکا تھا۔ زریاب آفریدی خود ساکت کھڑے تھے۔

"حبہ یہ کیا کر رہی ہو؟ دیکھو اس طرح کتنی انسلٹ۔"

"شٹ اپ! تم کون ہوتی ہو میرے معاملے میں بولنے والی دفع ہو جاؤ۔" اس نے عروج کا ہاتھ نفرت اور حقارت سے جھٹک دیا تھا، تذلیل اور ہتک کے احساس سے عروج کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ فرہاد بھی شرمندہ ہو چکا تھا لیکن شرمندگی کی گہری دلدل میں تو رجب آفریدی تھا۔ جس کی عزت کے آج حبہ الٰہی نے سرعام پرخچے اڑا دیئے تھے۔

آفریدی حویلی پہ دو روز سے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر میں چہل پہل بھی برائے نام تھی۔ رجب دو دن سے اپنے بیڈ روم میں نہیں گیا تھا۔

بھرجائی، گل جانی اور زریاب آفریدی اپنی اپنی جگہ پہ پریشان اور سوچوں میں گم تھے اور حبہ دو روز سے بیڈ روم میں تھی گل جانی نے رجب کو خاموش بیٹھے دیکھا تو بات کرنے کی ہمت کر ہی لی۔

''پتر! یوں چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرنے سے کچھ نہیں ہوگا کہیں آرام سکون سے اس کے پاس بیٹھ کر سمجھا بجھا کر پوچھنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر پھر بھی نہ بتائے تو بھول جاؤ اس بات کو اور اپنی آگے کی زندگی کے لئے سمجھداری سے قدم بڑھاؤ ہوسکتا ہے اس روز پریشانی اور غصے میں وہ اپنا اختیار کھو بیٹھی ہو اور اب اپنے کئے پہ نادم ہو تمہیں اس کی کیفیت جاننے کی کوشش کرنی چاہئے ویسے بھی وہ اس گھر میں بالکل اجنبی ہے، اکیلی بیٹھی رہی تو برے خیالات کا شکار ہوگی اسے تنہا مت چھوڑو اپنا ساتھ دو شاباش اپنے کمرے میں جاؤ۔''

انہوں نے اچھی خاصی تمہید کے بعد اسے اوپر کمرے میں جانے کے لئے کہا۔

اگرچہ اسے دیکھنے کے لئے اس کا اپنا دل بھی بے تاب ہو رہا تھا لیکن پھر بھی اوپر جاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔

''دیکھو بیٹا وہ اس گھر میں تیرے لئے آئی ہے اور تو ہی اسے اس طرح چھوڑ بیٹھا تو اس کا کیا بنے گا؟''

گل جانی بہت نرمی اور ملائمت سے سمجھاتی تھیں ان کی بات جلد ہی سمجھ میں بھی آجاتی تھی۔

''میں کب اسے چھوڑ بیٹھا ہوں گل جانی، میں اسے مر کر بھی نہیں چھوڑ سکتا میں اسے چھوڑ کے خاک ہو جاؤں گا اسی لئے اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔'' رجب آفریدی کی شدت اور دیوانگی ہنوز تھی اندر داخل ہوتے زریاب آفریدی نے اس کی پوری بات مکمل توجہ سے سنی تھی۔

''تمہیں کون کہتا ہے کہ اسے چھوڑو میری جان، وہ تو ہمارے شہزادے کی پسند ہے اس کی خوشی ہے ہمارے ساتھ جیسے چاہے سلوک کرے ہمیں پروا نہیں اتنے سال تم نے عیش کئے من مانی کی اب وہ کرے گی تو کون سا قیامت آجائے گی۔'' ان کا لہجہ اور انداز بشاشت لئے ہوئے تھے رجب نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

''ارے پگلے تو ضدی تھا تو تیری گھر والی کو بھی تو ضدی ہی ہونا چاہئے تھا۔''

انہوں نے رجب کو چھیڑا تھوڑی دیر بعد بھرجائی بھی ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے شریک ہو چکی تھیں اور پھر انہوں نے زبردستی رجب کو کمرے میں بھیجا کہ حبہ کو ساتھ لے کر آئے اور اگر وہ چاہے تو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ رجب آ تو گیا مگر اندر قدم رکھنے کے لئے خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن آخر کب تک دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر داخل ہوا۔

وہ پورے کمرے میں اندھیرا کئے صوفے پہ پاؤں چڑھائے دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔ رجب نے آگے بڑھ کے تمام لائٹس آن کر ڈالیں اور قدم صوفے کی سمت بڑھا دیئے۔ وہ قدموں کی چاپ اور کمرے میں پھیلتی روشنی محسوس کر کے بھی خاموش ہی رہی اور بدستور ایک ہی انداز میں بیٹھی رہی۔

''حبہ!'' اس نے حبہ کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھنسا کر آہستگی سے اسے پکارا وہ اس کے بے حد قریب بیٹھا تھا۔

''دیکھو حبہ میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیا ہوا ہے اور تم نے ایسا کیوں کیا لیکن پھر بھی میں ابھی تک تم پہ غصہ نہیں کر سکا حالانکہ جو کچھ ہوا وہ اتنی چھوٹی بات نہیں جو نظر انداز کر دی جائے، مگر نجانے کیا بات ہے تمہارے معاملے میں، میں تمہارے سوا ہر چیز نظر انداز کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہوں مجھے تمہارے سامنے کوئی چیز بری نہیں لگتی مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے لیکن اتنا جان گیا ہوں کہ میں اپنی پوری ہستی تمہارے سامنے ہار گیا ہوں اور تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ہارے ہوئے انسان کے جذبات کو اتنا نہیں کچلنا چاہئے کہ وہ زندگی ہی ہار جائے۔'' وہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے انتہائی آہستگی سے کہہ رہا تھا۔ حبہ کے وجود میں ہلکی سی بھی جنبش نہیں ہوئی تھی اس کا انداز نشست ہنوز تھا۔

''کیا بات ہے ناراض ہو؟'' اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ الٹا اسی کی ناراضگی کی فکر میں مبتلا تھا۔ حبہ نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا نظروں میں سپاٹ احساس تھا اور برف جیسی سرد کیفیت تھی اب۔ لمحے کے لئے رجب آفریدی کا دل ڈوب کے ابھرا تھا۔

''رسوا ہونا کیسا لگتا ہے رجب آفریدی؟'' اتنی چبھتی ہوئی بات وہ کتنے تحمل اور سکون سے پوچھ رہی تھی۔

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے تم پہ کوئی اعتراض نہیں کیا مجھے تم پہ کوئی غصہ بھی نہیں شاید ایسا ہونا ہی تھا۔'' رجب کا تحمل اور سکون بھی انتہا کا تھا۔

''لگتا ہے تمہارے سینے میں احساس کرنے والا دل نہیں ورنہ تمہیں اپنے بھائی کی حالت ضرور محسوس ہوتی۔'' حبہ کا لفظ لفظ سرد تھا ایک دم برف جیسا یخ اور بے حس۔

''میرے سینے میں دل ہے لیکن دل میں انا، ضد اور غصہ نہیں رہا اور تمہاری محبت کا اعجاز ہے اور جس کی محبت کا اتنا کرم ہو اس پہ انسان اپنی انا اپنی ضد اور اپنا غصہ نہیں آزما سکتا، رہی بات میرے بھائی کی تو تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرے بھائی کے سینے میں مجھ سے بھی زیادہ بڑا دل ہے اور اس دل میں محبت بھی بہت وسیع پیمانے پہ پھیلی ہوئی ہے اس لئے وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اپنے آپ کو پریشان نہیں کرتے وہ اس وقت مجھ سے زیادہ فریش نظر آ رہے ہیں۔'' اس کی بات سن کر حبہ کی رنگت غصے سے سرخ ہو گئی وہ یکدم غصے سے پھٹ پڑی۔

''ہاں تم لوگوں کو کیا فرق پڑتا ہے؟ تم لوگوں کو فرق پڑ ہی نہیں سکتا، فرق تو غریب لوگوں کو پڑتا ہے جن کی عزت بھی بہت غریب ہوتی ہے سسک سسک کر پروان چڑھتی ہے لیکن تم جیسے گھٹیا امیر زادے اور جاگیر دار اس عزت کو داؤ پہ لگانے کے لئے پہنچ جاتے ہیں لیکن رجب آفریدی اتنا یاد رکھو میں حبہ الٰہی ہوں غفار الٰہی کی بیٹی اس غفار الٰہی کی بیٹی جس نے عزت کو ہمیشہ سینت سینت کر رکھا مگر تم جیسے لوگوں نے اس عزت کو محفوظ نہیں رہنے دیا اور نہ ہی ایک بیٹی کو ایک باپ کی نظروں میں سرخرو ہونے دیا پورا دامن ہی داغ داغ کر دیا کوئی گناہ نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار بنا دیا۔ رجب آفریدی! میں بدکردار ٹھہری، ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے، میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی تم زندگی بھر سکھ کا سانس لینے کو ترسو گے میری بہنیں عذاب سہیں گی تو تم بھی جہنم جیسی آگ میں تڑپو گے۔ میری ماں روئے گی تو تمہارے گھر والے بھی خون کے آنسو روئیں گے رجب آفریدی پچھتاؤ گے۔ تم نے بہت خسارے کا سودا کیا ہے اور یہ خسارہ بھی ایسا ہے کہ زندگی بھر تاب نہیں لا سکو گے تم نے اپنی ضد میں میرا یہ جسم تو حاصل کر لیا ہے نا لیکن جسم کے اندر دھڑکتے دل اور روح کو کبھی حاصل نہیں کر سکو گے تم کبھی بھی مجھے اپنا کر بھی اپنا نہیں بنا سکتے، تم حبہ الٰہی کو مار چکے ہو تم نے دفن کر دیا ہے حبہ الٰہی کی ذات کو......'' وہ رجب کا گریبان پکڑے ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی نجانے کیا کہے جا رہی تھی اور رجب ناسمجھی کے عالم میں حیرت زدہ بس اس کا یہ پاگل پن دیکھ رہا تھا اور وہ جو منہ میں آ رہا تھا بولے جا رہی تھی باقی افراد بھی شور سن چکے تھے اور اپنے اپنے مقام پہ چپ چاپ بے بس سے کھڑے تھے۔

❁......❁......❁

''میں نے محبت کر کے کوئی گناہ نہیں کیا تھا شہوار، جس کی وہ مجھے اتنی کڑی سزا دے رہی ہے، مجھے دو سال ہو چکے ہیں میں کبھی سکون کی نیند نہیں سو سکا ان دو سالوں میں، میں نے اس برف کی مورت سے نجانے کتنی بار سر ٹکرایا ہے لیکن وہ برف ایک بار بھی نہیں پگھلی وہ خود تو پتھر تھی ہی اپنے ساتھ مجھے بھی پتھر کا بنا رہی ہے، شہوار پلیز مجھے بتاؤ مجھے کس گناہ کی سزا ملی ہے؟''

آج شادی کے دو سال بعد اتفاقاً ایک ریسٹورنٹ میں شہوار اور رجب آفریدی کا ٹکراؤ ہو گیا تھا اور شہوار، حبہ کے متعلق پوچھنے لگی تو رجب نے اسے تھوڑی دیر کے لئے روک لیا تھا اور رجب نے ساری تفصیل بیان کی تو شہوار حیرت سے گنگ دیکھتی رہ گئی، مگر رفتہ رفتہ ساری بات سمجھ میں آتی گئی۔

''یہ سب حبہ کا قصور نہیں نہ ہی آپ کا قصور ہے بلکہ یہ سب کیا دھرا حبہ کی چھوٹی بہن ردا الٰہی کا ہے۔''

''ردا الٰہی؟'' رجب کو حیرت کا جھٹکا لگا وہ پہلی بار یہ نام سن رہا تھا

''ہاں ردا الٰہی، حبہ سے تقریباً ایک ڈیڑھ سال ہی چھوٹی ہو گی۔ حبہ ایم بی اے کرنے کی غرض سے یونیورسٹی آ گئی تو ردا کو اکیلے کالج جوائن کرنا پڑا وہ فرسٹ ائیر کی سٹوڈنٹس تھی، لیکن غلط صحبت نے اسے غلط سمت چلنے پہ مجبور کر دیا۔ غفار انکل کو اپنی چاروں بیٹیوں سے بے پناہ محبت تھی وہ انہیں اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے اور اس کے لئے دن رات محنت کرنے میں کوشاں رہتے تھے اور کافی اصول پسند آدمی تھے وہ اپنے ایک کالج فیلو کو پسند کرنے لگی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کبھی بھی اپنی پسند سے شادی نہیں کر سکے گی اسی لئے ایک روز گھر چھوڑ کر اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی جسے وہ پسند کرتی تھی، غفار انکل کو اپنی تربیت پہ اتنا مان تھا کہ جب وہ مان ٹوٹا تو وہ ہر احساس سے عاری ہو گئے انہوں نے حبہ، رابیہ اور ہانیہ کو تختہ مشق بنا لیا۔ روحان جو سب بہنوں سے بڑا تھا وہ بھی بہنوں سے متنفر ہو چکا تھا لوگوں کی باتوں سے اس قدر تنگ آیا کہ یہ شہر ہی چھوڑ گیا۔

حبہ بہنوں میں سب سے بڑی تھی اس نے اپنے آپ سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ کا کھویا ہوا اعتماد ضرور بحال کرے گی لیکن ایک روز شاید بس سٹاپ پہ غفار انکل نے حبہ کو آپ کے ساتھ کھڑے دیکھ لیا اور پھر رہی سہی کسر وہاں پوری ہو گئی انہوں نے گھر آ کر حبہ کو بہت زیادہ ٹارچر کیا تھا رابیہ اور ہانیہ نے روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے ان دونوں کو بھی بہت زیادہ

مارا خدیجہ آنٹی گھر میں ایسی قیامت دیکھ کر چپ سادھ چکی تھیں اور ان ہی دنوں آپ کے لالہ سائیں پرپوزل لے کر چلے گئے اور شدید نفرت اور غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے غفار انکل نے فوراً ہامی بھرلی۔

شاید آپ لوگوں کو یہ بات غیر معمولی نہیں لگی تھی ورنہ کوئی بھی باپ اس طرح اپنی بیٹی کو رخصت نہیں کرتا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنے آنگن سے حبہ کی ڈولی نہیں جنازہ اٹھا تھا کیونکہ رخصتی کے وقت غفار انکل نے حبہ سے کہہ دیا تھا کہ آج سے ان کا حبہ سے ہر تعلق ختم ہو چکا ہے نہ وہ کبھی اس سے ملیں گے اور نہ ہی وہ ان سے ملنے کی کوشش کرے گی اگر ایسا ہوا تو وہ اپنے ساتھ ساتھ رابیہ اور ہانیہ کو بھی مار ڈالیں گے اس طرح صرف آپ سے رشتہ جڑتے ہی حبہ کے باقی سارے رشتے ناطے سب سے ٹوٹ گئے وہ گنہگار نہ ہوتے ہوئے بھی سزا کی لپیٹ میں آچکی تھی۔

شادی کے روز ہی اس کی سزا شروع ہو چکی تھی مگر اس سے بھی زیادہ سزا رابیہ اور ہانیہ نے جھیلی ہے چند روز قبل مجھے لاہور کے ایک میڈیکل سٹور پر خدیجہ آنٹی ملی تھیں۔ انہوں نے ہی یہ ساری تفصیل بتائی تھی اور یہ بھی کہ رابیہ اور ہانیہ کی تعلیم کا سلسلہ انہوں نے دو سال پہلے ہی بند کروا دیا تھا اور اب تو آئے روز وہ دونوں پہ ہاتھ اٹھاتے رہتے ہیں ذرا سی بات ہوتی ہے وہ مارنا شروع کر دیتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اتنی اذیت اور بے اعتباری جھیلنے کے بعد اگر حبہ کا رویہ آپ کے ساتھ اتنا سرد ہے تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ کیونکہ ایسے حالات میں مضبوط سے بھی مضبوط اعصاب کا مالک انسان بھی ایسا ہی سلوک کرتا ہے اور یقیناً آپ کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ حبہ کہیں سے بھی غلطی پر نہیں بلکہ غلطی آپ سے ہی ہوئی تھی جو اس طرح جلد بازی میں اسے بھی اذیت دے بیٹھے اور اپنی زندگی بھی مشکل میں ڈال دی......''

شہوار کی گفتگو سنتا وہ دم بخود بیٹھا جیسے پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔

''حبہ کی بہن ردا الٰہی؟'' اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے ہر چیز گڈمڈ ہوتی جا رہی تھی ''ہاں ردا حبہ سے چھوٹی بھی ہے اور خوبصورت بھی شاید اس کی یہی خوبصورتی اس کی سب سے بڑی خامی تھی کہ اپنے کردار کے ساتھ ساتھ ماں باپ اور بہن بھائی کے دامن بھی داغ دار کر گئی۔'' شہوار کا لہجہ افسوس لئے ہوئے تھا۔

''تم مجھے شناخت کے طور پہ اس کی کوئی نشانی بتا سکتی ہو؟'' رجب آفریدی کے دل

دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے وہ اتنا عرصہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا رہا فقط اپنی ذات کو ستم کا شکار سمجھتا رہا حالانکہ ستم تو سب ہی نے سہا تھا۔

رابیہ نے ہانیہ نے، غفار الٰہی اور خدیجہ بیگم نے روحان الٰہی اور خود حبہ الٰہی نے بھی اور شاید ان کا ستم رجب آفریدی سے بھی زیادہ سنگین تھا کیونکہ وہ لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ کر...... جدا ہو کر سزا کاٹ رہے تھے اور سزا تو شاید ردا الٰہی بھی کاٹ رہی تھی۔

شہوار نے رجب کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا اور اس کے بعد زیادہ دیر اس سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا تھا اور شہوار سے رابطہ کرنے لئے اس کا ایڈریس اور نمبر بھی لے لیا تھا۔ بہت جلد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

۞......۞......۞

''ارے آج کہاں سے رستہ بھول گئے؟'' آفاق کی مما رجب کو دیکھتے ہی خوشگواری سے بولیں۔ رجب ان سے مل کر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''آفاق اوپر اپنے بیڈروم میں ہے وہیں جاؤ گے یا اسے بلاؤں؟''

''میں آفاق سے ملنے نہیں آیا...... میں جبیں سے ملنے آیا ہوں۔'' اس کا انداز بہت نپا تلا تھا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا پھر سر جھٹک دیا۔

''خیریت تو ہے؟''

''جی خیریت ہے کہاں ہے وہ؟ اسے کہیں کہ رجب آفریدی ملنے آیا ہے۔'' رجب کے لہجے میں نجانے کیسی چبھن تھی کہ آنٹی بار بار چونک کے دیکھ رہی تھیں اور اسی طرح الجھتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

''السلام علیکم!'' تھوڑی دیر بعد وہ اس کے سامنے تھی۔ رجب نے نظر اٹھا کے اسے سرتاپا جن نظروں سے دیکھا پہلی بار وہ اس کے سامنے گڑبڑا سی گئی تھی۔

''آپ مجھ سے ملنے آئے تھے؟'' اس نے خشک ہونٹوں سے بمشکل یہ فقرہ ادا کیا تھا۔

''ہاں آؤ بیٹھو!'' اس نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنے سامنے والے صوفے کی سمت اشارہ کیا تھا وہ مرے مرے قدم اٹھاتی کافی مشکل سے صوفے تک کا فاصلہ طے کر پائی تھی، کیونکہ رجب آفریدی کا انداز ہی خطرے کی گھنٹیاں بجانے کو کافی تھا۔

''جی کہئے میں سن رہی ہوں؟''

"تم جانتی ہو میری شادی کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟"

"جی تقریباً دو سال یا پھر اس سے چند ماہ زیادہ۔"

"لیکن تم یہ نہیں جانتی ہو گی کہ ان دو سالوں میں میری بیوی میرے پاس ہو کر بھی میرے پاس نہیں رہی وہ میرے پاس زندہ لاش کی طرح رہتی ہے......" رجب کی بات پہ اس نے قدرے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس کی بات سے پریشان ہو گئی ہو۔

"اور زندہ لاش وہ اس لئے بن گئی ہے کہ رخصتی کے وقت اس کے ماں باپ نے اس سے اپنے تمام رشتے اور رابطے توڑ لئے تھے کیونکہ ان کی نظر میں وہ بدچلن اور بدکردار لڑکی تھی۔" لمحہ بھر کے لئے اس کی رنگت متغیر ہوئی۔

"تم جانتی ہو بدکردار کو کوئی بدکردار کہہ دے تو اسے کتنا بُرا لگتا ہے لیکن ایک پاکردار کو جب کوئی بدکردار کہے تو وہ مر جاتا ہے وہ بھی مر چکی ہے اسے بھی بدکرداری کا طعنہ ملا ہے، کیونکہ اس کی بہن گھر سے بھاگ گئی تھی ایک لڑکے کے فریب میں آ کر وہ باپ اور بھائی کی عزت تو روند گئی ساتھ میں اپنی بہنوں کی زندگی بھی۔ بربادی کا ماتم آج تک ہو رہا ہے اور نجانے کب تک ہو گا۔" رجب کہتے کہتے بپھرنے لگا تھا اور وہ متغیر ہوتی رنگت اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔

"میں تم سے صرف اتنا پوچھنے آیا ہوں کہ تم بھی ایک لڑکی ہو تم نے بھی زمانے کی ٹھوکریں کھائی ہیں تم بتاؤ کہ سزا کا مستحق کون ہے وہ لڑکی جو میری بیوی ہے یا پھر وہ لڑکی جو گھر سے بھاگ گئی کیونکہ جو لڑکی میری بیوی ہے اس نے مجھے ستایا ہے مجھے دن رات اذیت دی ہے میرے گھر والوں کو ذہنی ٹارچر کیا ہے، میری محبت کی دھول اڑائی ہے، اپنے قدموں تلے روندا ہے میری محبت کو، لیکن دوسری لڑکی نے اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کو ستایا ہے ان کو اذیت دی ہے ان کی عزت خاک میں ملائی ہے اس نے محض ایک خواہش ایک وقتی جذبات کے آگے اتنی محبتیں روندی ہیں، یہاں تک کہ میری محبت بھی اسی کی وجہ سے عتاب کا شکار ہوئی ہے۔" اس نے بغور اپنے سامنے بیٹھی جبیں نامی لڑکی کو دیکھا جو یقیناً کسی بھنور میں چکرا رہی تھی۔

"بولو جبیں کون سزا کا مستحق ہے میری بیوی یا پھر میری بیوی کی بہن؟" وہ اسے بولنے پہ اکسا رہا تھا اور وہ اپنے ہونٹوں کی لرزش چھپا رہی تھی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"آ......آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" بالآخر اسے بولنا ہی پڑا۔

"کیونکہ تم ردا الٰہی ہو اور حبہ الٰہی کا شوہر ہونے کے ناطے میں تم سے اتنا پوچھنے کا تو حق رکھتا ہی ہوں کہ سزا کسے دوں تمہیں یا پھر تمہاری بہن کو......" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے غصے سے دیکھتا بے حد غضب ناک ہو رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"پلیز میرے سامنے یہ جذباتی سین ری ایکٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں مجھے صاف صاف بتاؤ تم کہاں کہاں کس کس کو دھوکہ دیتی آئی ہو اور تم نے آفاق کے سامنے اتنے جھوٹ کیوں بولے، حالانکہ وہ تمہارا محسن تھا تمہیں اتنی بُری حالت سے نکال کے یہاں لے آیا رہنے کے لئے چھت ہی نہیں بلکہ عزت احترام اور اعتماد بھی دیا اور تم نے تو شاید ہر کسی کا اعتماد توڑنے کا عہد کر رکھا ہے تمہیں کسی کی بھی پروا نہیں سوائے اپنے آپ کے......تم نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا احساس نہیں کیا تھا آفاق کا احساس تمہیں بھلا کیوں ہو گا۔"

"نہیں رجب بھائی ایسا نہیں ہے میں......"

"شٹ اپ! مجھے بھائی مت کہنا میری بہن تم جیسی خود غرض نہیں ہو سکتی بلکہ مجھے تو ندامت ہو رہی ہے کہ تم حبہ جیسی لڑکی کی بہن ہو وہ حبہ جس نے اپنوں سے بچھڑنے اور باپ کا اعتماد مجروح ہونے کی پاداش میں آج تک ہر خوشی خود پہ حرام کر رکھی ہے، جس نے میری بے پناہ اور اندھی محبت کو ہمیشہ ٹھکرایا ہمیشہ میرے دل کو پاش پاش کرتی رہی صرف اس لئے کہ وہ تمہارے لگائے ہوئے داغ کو دھو نہیں سکی تھی اور تم......ایک فریب کے بعد دوسرا فریب دینے کے لئے تیار کھڑی ہو؟"

"پلیز اللہ کے لئے مجھے، مجھے غلط مت سمجھئے میں نے صرف اس لئے سچ نہیں بتایا تھا کہ آفاق مجھے پناہ دینے سے انکاری نہ ہو جائیں اور میں سچ بتاتی بھی کیا کہ میں اپنوں کو ٹھکرا کر خود بھی اتنی بڑی ٹھوکر کھا چکی ہوں۔"

"تم قابل رحم نہیں ہو کیونکہ تم جیسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے بلکہ ایسا ہی ہوتا ہے تم جتنی بھی ٹھوکریں کھاؤ کم ہے۔" وہ اس وقت غصے میں سفاکی کی حد کو چھو رہا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا۔ ردا الٰہی کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دے اور وہ رجب آفریدی کی اس قدر نفرت اور شدید ردعمل دیکھ کر روئے جا رہی تھی جب سے آفاق اسے اپنے گھر لے کر آیا تھا ہمیشہ رجب آفریدی اور آفاق بدر نے اس کی بے پناہ عزت کی تھی۔ اسے ہمیشہ احترام سے مخاطب کیا تھا اور آفاق کی

ممانے بھی اسے ماؤں کا سا پیار دیا تھا لیکن آج یہ سب بھی ختم ہو چکا تھا۔ آج احترام سے دیکھنے والی نظروں سے نفرت لپک رہی تھی۔

''نفرت ہو رہی ہے اس دنیا سے کہ اس میں تم جیسی بیٹیاں اور تم جیسی بہنیں بھی ہیں، لیکن فخر ہو رہا ہے مجھے اس کائنات پہ جس میں حبہ جیسی لڑکیاں بھی ہیں جو کسی کی بے پناہ محبت کو اپنے ماں باپ کی عزت اور اعتماد پہ ترجیح دیتیں، چاہے اس کے لئے ان کا اپنا سکھ و آرام داؤ پے لگ جائے۔'' رجب کے لہجے میں ایک دم فخر کا احساس اتر آیا تھا اور ردا کے لئے آنکھوں میں ابھی بھی نفرت کا جذبہ ہنوز تھا۔

''پلیز مجھ سے جو کچھ ہو چکا ہے مجھے......''

''دیکھو میرے سامنے یہ آنسو اور یہ معافی تلافی کا چکر مت چلاؤ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آفاق کو اس بات کی خبر ہونے سے پہلے پہلے اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لو میں نہیں چاہتا کہ وہ مزید تمہارے کسی فریب کا شکار ہو......'' رجب سختی سے کہتا ہوا پلٹا لیکن آفاق کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر اس کے قدم ساکت ہو گئے تھے اور ردا بھی روتے روتے آفاق کو دیکھ کر یکدم پتھرا گئی، وہاں موجود تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ پہ ساکت و صامت کھڑے تھے۔ کسی کے پاس بھی کہنے کے لئے کچھ نہ تھا اور سب سے پہلے وہاں سے رجب نے ہی قدم اٹھایا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا پیچھے آفاق اور جبیں نامی ردا الٰہی میں کیا گفتگو اور بحث و تکرار ہوئی وہ نہیں جانتا تھا۔

❁......❁......❁

اتنی تھکن اور ذہنی ٹینشن کے باوجود وہ گاؤں آنے کے لئے بالکل تیار تھا اور حویلی میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلی بار حبہ کے متعلق پوچھا تھا ورنہ ہمیشہ وہ اسے صرف نگاہوں سے تلاش کرتا تھا کبھی منہ سے چھوٹتے ہی اس کے بارے میں استفسار نہیں کیا تھا۔

''خیر تو ہے آج کچھ زیادہ ہی دیوانے لگ رہے ہو؟'' بھرجائی نے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے چھیڑا۔

''ہاں بھرجائی آج میں سچ مچ اس کا دیوانہ ہو رہا ہوں آج جی چاہ رہا ہے عقیدت سے جھک کر اسے سلام پیش کروں۔'' رجب کا لہجہ سچ مچ عقیدت اور محبت سے بھیگ رہا تھا۔

''کیوں جناب آج اتنا پیار کیوں آ رہا ہے؟'' اب کی بار تو بھرجائی کو مزید تجسس ہوا تھا۔

''بھرجائی پیار ہمیشہ پیاری چیز پہ ہی آتا ہے اور آپ جانتی ہیں مجھے شروع سے کتنی

پیاری ہے آج تو بس اضافی پیار اُمڈ رہا ہے۔'' آج بہت عرصے بعد بھرجائی کو رجب کے لب و لہجے اور انداز اطوار میں خوشی کی رمق محسوس ہو رہی تھی ورنہ ہمیشہ حبہ کی طرف سے دلبرداشتہ ہو کر وہ کچھ کھویا کھویا نظر آتا تھا ان دو سالوں میں انہوں نے ایک بار بھی رجب کو خوش اور مطمئن نہیں دیکھا تھا، ہمیشہ وہ بے سکون اور مضطرب سا دکھائی دیتا تھا۔

''کاش کہ تمہیں اس پیار کے بدلے پیار ہی ملتا۔'' بھرجائی کے منہ سے آہ نکلی اور رجب نے ان کو روک دیا۔

''نہیں بھرجائی مجھے پیار کے بدلے بہت کچھ ملا ہے جب ایک مرد ایک عورت سے محبت کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ عورت بھی پیار کرے یہ تو اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے اور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے باکردار عورت ملی ہے میں نے اس عورت سے محبت کی ہے جو سچ مچ محبت کے قابل تھی۔'' رجب کو آج حبہ کا ہر ستم بھی کرم لگ رہا تھا وہ دو سال کی اذیت بھول چکا تھا اب وہ اس کی اذیت دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اس کا مقام واپس دلانا چاہتا تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو میں سمجھی نہیں۔'' بھرجائی نے سنجیدگی سے پوچھا رجب کے چہرے پہ بھی سنجیدگی کا عکس لہرا رہا تھا اس نے بھرجائی کے ہاتھ تھام لئے اور پھر انہیں تمام سچائی سے آگاہ کر دیا۔

''بھرجائی اب میں اس سے صرف محبت نہیں کروں گا بلکہ محبت کے ساتھ ہر وہ جتن کروں گا جس سے وہ خوش ہو سکے کیونکہ محبت کبھی بھی جتن کئے بغیر مکمل نہیں ہوتی شاید دو سال بغیر جتن کئے گزارے ہیں اس لئے کچھ بھی حاصل نہیں کر پایا۔''

رجب کے کئے گئے انکشاف پہ بھرجائی حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں وہ دو سال سے یہی سمجھ رہی تھیں کہ حبہ، رجب کے علاوہ کسی اور کو پسند کرتی ہے جب ہی آج تک وہ اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکی بلکہ رجب کو بھی خوش نہیں رہنے دیتی۔

''بھرجائی میرے لئے دعا کریں کہ میں حبہ کی خوشی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے دعا گو تھا بھرجائی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

حبہ سو رہی تھی وہ بنا آہٹ کے بیڈ کے قریب آیا اور جھک کر ہمیشہ کی طرح اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا ہمیشہ اس کے ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی نیند نہ ٹوٹ

جائے کیونکہ اگر اس کی نیند توڑنے کا ارتکاب کر بیٹھتا پھر یقیناً کوئی نئی سزا جاری ہو جاتی اور وہ تو ابھی پہلی سزائیں بھگت رہا تھا کسی نئی سزا کا یارا نہیں تھا اس لئے اکثر و بیشتر ایسے معاملے میں احتیاط کرتا تھا اس وقت بھی وہ اسے دل و نظر میں جذب کر رہا تھا اور یقیناً احساسِ تشکر سے مغلوب تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ اس بات پہ وہ جتنا بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔

زریاب آفریدی کو اس کے ارادوں کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی حبہ کو خوش دیکھنا چاہتے تھے ان کی حویلی بھی خوشیوں کے لئے ترس رہی تھی۔ گل جانی اور بھرجائی نے بھی اسے دعاؤں سے نوازا تھا اور وہ روانگی کی تیاری کر رہا تھا لیکن ان دو سال میں پہلی مرتبہ وہ اتنے دنوں کے لئے حویلی سے باہر جا رہا تھا ورنہ تین چار دن سے زیادہ حویلی سے باہر نہیں رہ پاتا تھا۔

"میرے ساتھ کراچی چلو گی؟" وہ پیکنگ کرتے کرتے اس کے قریب آ گیا۔ حبہ کا ہاتھ بالوں میں ہیئر برش پھیرتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے رکا پھر دوبارہ حرکت کرنے لگا۔

"روحان سے ملوگی؟" اس دفعہ وہ پوری اس کی سمت گھوم گئی۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔

"ہاں حبہ! میں روحان سے ملنے جا رہا ہوں اسے تمہارے پاس لے کر آؤں گا پھر تم اپنے امی ابو سے ملنے جاؤ گی۔ رابیہ اور ہانیہ سے ملوگی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتی ہو۔" رجب نے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

پہلے تو چند سیکنڈ وہ اسے دیکھتی رہی پھر یکدم قہقہہ لگا کر ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

"تم روحان بھائی سے ملوگے، امی ابو سے ملواؤ گے رابیہ اور ہانیہ سے بھی ملاقات ہوگی امیزنگ......واؤ کتنے خوش خیال ہو کتنے اونچے اونچے خواب دیکھتے ہو۔" وہ اور زیادہ ہنسنے لگی۔

"حبہ! میں ان خوابوں اور ان خیالوں کو سچ کرنے جا رہا ہوں......! ہونہہ رجب آفریدی یہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے، تم مر بھی جاؤ تو ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا اپنے باپ اور بھائی کو میں جانتی ہوں تم نہیں۔" اس کے لہجے سے نفرت جھلکنے لگی تھی رجب پھر بھی مطمئن ہی تھا۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو میں سچ مچ مر جاؤں گا۔ حبہ میری زندگی میں اگر تم کوئی خوشی نہ دیکھو یا میں تمہیں کوئی تحفہ نہ دے سکا تو اس زندگی کا کیا فائدہ؟"

"یعنی روحان بھائی نہ آ سکے تو تم مر جاؤ گے؟" وہ مذاق اڑا رہی تھی رجب نے بغور اسے دیکھا اور گہری سانس کھینچی۔

"ہاں مر جاؤں گا۔"

"تو پھر میں دعا کرتی ہوں روحان بھائی کبھی نہ آئیں۔" رجب نے چونک کر اس کی صورت دیکھی جہاں نفرت کا جہان آباد تھا، جہاں حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پلٹ کر بیڈ کی سمت جانے لگی جب رجب نے یکدم ایک جھٹکے سے اسے اپنی سمت کھینچ لیا تھا وہ بے ساختہ توازن کھونے کی وجہ سے اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔

"تمہارے روحان بھائی بھی آئیں گے اور میں بھی مر جاؤں گا حبہ آفریدی، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ مرنے کے بعد بھی رجب آفریدی کے دل میں تمہاری محبت رہے گی۔"

گرفت میں جکڑے ہوئے وہ کافی شدت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا آج پہلی بار حبہ کی کوئی بات اس کے دل پہ نقش ہوئی تھی۔ حبہ نے بے اختیار پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا آج سچ مچ وہ کسی چوٹ پہ بلبلایا ہوا لگ رہا تھا اس کی آنکھوں میں تڑپ تھی اس کا لمس بھی سلگ رہا تھا وہ اس کے چہرے پہ اپنی آنکھوں کی تڑپ چھوڑ کے اپنا بیگ اٹھاتا کمرے سے نکل گیا تھا اور حبہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی سناٹے میں آ گئی۔ وہ جا چکا تھا لیکن چلے جانے کے بعد بھی بہت کچھ پیچھے چھوڑ گیا تھا حبہ کی پوری ہستی ہل کے رہ گئی تھی۔ اس کا دل پہلی بار دھڑکا اور اپنی ہی دھڑکن سے سہم گیا تھا ہر آہٹ سے خوف آنے لگا تھا نجانے کیا کیا احساسات اور جذبات تھے جو اس کے دل و دماغ میں ہی نہیں روح میں بھی سرائیت کر گئے تھے۔

آج من کے آنگن میں رجب آفریدی کی آنکھوں کی تڑپ نے ایک اٹھا پٹخ مچا دی تھی ایک قیامت برپا ہونے کو تھی اور شاید ایک جذبہ پیدا ہونے کو تیار تھا ایسا جذبہ جس سے وہ قطعی طور پر نا آشنا تھی۔

⁂ ...... ⁂ ...... ⁂

اسے سیڑھیاں اتر کر ڈرائنگ روم کی سمت آتے دیکھ کر بھرجائی اور گل جانی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا تھا آج رجب کو گھر سے گئے ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے لیکن ان پانچ دنوں میں اس کی کمی نجانے کتنی مرتبہ محسوس ہو چکی تھی، لیکن وہ اس چیز کا اظہار نہیں کر سکتی تھی اس لئے اظہار سے محتاجی کا سامنا ہوا تو اپنے آپ سے گھبرا کر وہ دو سال سے سجائی گئی خلوت گاہ سے باہر نکل آئی تھی جس پہ ان لوگوں کو بے پناہ خوشی ہو رہی تھی۔

"طبیعت ٹھیک ہے نا؟" گل جانی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ حبہ نے بے ساختہ

چہرہ جھکا لیا اسے ان کے محبت بھرے انداز اور اتنی اپنائیت سے ندامت ہونے لگی تھی۔ آج تک وہ ان لوگوں کے قریب نہیں آئی تھی نہ ہی ان کو اپنے قریب آنے دیا تھا لیکن پھر بھی ان کے ماتھے پہ شکن تک نہ تھی۔

''کیا بات ہے پتر خیر تو ہے؟'' گل جانی نے تشویش سے بھرجائی کو بھی دیکھا تھا۔

''رجب کے لئے اداس ہو؟'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا حبہ کی آنکھیں بھر بھر آئیں دل الگ موم کی طرح پگھلا جارہا تھا۔

''ارے پگلی آ جائے گا، تیرے لالہ سائیں دو بار اسے فون کر چکے ہیں کہتا ہے جب تک اس کا کام مکمل نہیں ہوگا وہ واپس نہیں آئے گا اور میرا خیال ہے اس کا کام بہت جلد ختم ہو جائے گا وہ بھی تیرے بغیر نجانے کیسے دن گزار رہا ہوگا۔''

بھرجائی نے قریب بیٹھ کر اس کا کندھا تھپکا تو حبہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، بے اختیار بھرجائی کی گود میں جھکی ہوئی ہچکیوں سے روتی جارہی تھی بھرجائی کو احساس ہو چکا تھا کہ کون سا جذبہ کونسا احساس اسے رلا رہا ہے اسی لئے اسے رونے سے نہیں روکا تھا بہت دیر بعد جب وہ سنبھلی تو زریاب آفریدی بھی وہیں موجود تھے۔

''مجھے معاف کر دیں لالہ سائیں میں نے بہت غلطیاں کی ہیں، میں نے بہت اذیت دی ہے آپ لوگوں کو۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ زریاب آفریدی نے شفقت سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''بیٹیاں معافی مانگتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں تم بھی ہماری بیٹی ہو بس ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں خوش رہو۔''

''خان سائیں! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' ملازمہ نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''کون ہے؟''

''سائیں کراچی سے آئے ہیں روحان الٰہی نام بتاتے ہیں۔'' ایک دھماکہ ہوا تھا اور حبہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''انہیں یہیں لے آؤ۔'' زریاب آفریدی کے چہرے پہ طمانیت کا احساس بکھر گیا تھا اور حبہ رجب کے دیئے گئے پے در پے جھٹکوں سے پتھرائی آنکھوں سے دیکھتی بے یقینی سے بت بنی ہوئی تھی، تھوڑی دیر بعد روحان الٰہی ان سب کے سامنے تھا سب سے مل کر وہ حبہ کی طرف

متوجہ ہوا وہ ابھی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

''حبہ!'' روحان نے اس کے سامنے دوزانوں بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر دونوں بہن بھائی اس قدر روئے کہ وہاں موجود ہر فرد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''میں اپنے کزن کی شادی اٹینڈ کرنے گیا ہوا تھا، میرج ہال میں کافی شور ہنگامہ اور گہما گہمی تھی لیکن اس گہما گہمی میں مجھے صرف مما کی غیر موجودگی کا احساس ستا رہا تھا اسی لئے میں شادی کا فنکشن ختم ہونے سے پہلے ہی ہال سے باہر نکل آیا مگر پارکنگ تک آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں اتنی جلدی کیوں آ گیا ہوں کیونکہ میری گاڑی کی اوٹ میں ایک لڑکی چھپنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے انداز اطوار کافی مشکوک تھے وہ مجھے دیکھ کر خوفزدہ ہو چکی تھی۔ میں نے قریب جا کر اسے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کی تو وہ یکدم ہٹی اور غیر متوازن ہوتی ہی زمین پہ گر گئی میں چاہ کر بھی اسے گرنے سے نہیں بچا سکا تھا۔

پانچ منٹ سوچنے اور سمجھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ سنگین بھی ہو سکتا ہے اس لئے میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اسے ہسپتال لے کر جانا پڑا ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ لڑکی ذہنی دباؤ کا شکار ہے اور اس نے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا جس کی وجہ سے اتنی کمزوری اور نقاہت ہو رہی ہے میں اسے ہسپتال میں ایڈمٹ کروا کے گھر آ گیا صبح دوبارہ ملنے گیا تو وہ مکمل ہوش میں تھی میں نے اس سے اس کا بیک گراؤنڈ پوچھا پہلے تو وہ رونے لگی پھر اس نے اپنی داستان سنائی کہ اس کی سوتیلی ماں اسے کسی کے ہاتھوں بیچنا چاہتی ہے جس پہ احتجاج کرنے سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے لیکن وہ موقع ملتے ہی گھر سے بھاگ نکلی ہے مگر وہ لوگ اسے ابھی بھی ڈھونڈ رہے ہیں اس لئے وہ چند دنوں کے لئے پناہ لینا چاہتی ہے میں پہلی بار ایسی سچویشن سے دوچار ہوا تھا اس لئے کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا اسی لئے میں نے یہ معاملہ اپنی مما اور رجب کے سامنے رکھ دیا مما ہر وقت بیمار رہتی تھیں ان کو بھی کسی کے سہارے کی ضرورت تھی انہوں نے اس لڑکی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی رجب نے بھی اس لڑکی کو جانچنے کے بعد ہی کہا کہ کسی اچھے خاندان سے ہے بس حالات کے چکر میں اُلجھ چکی ہے۔

اسے پناہ دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اس لئے میں اس لڑکی کو جو بقول اس کے کافی مظلوم تھی اسے گھر لے آیا میری مما کی طبیعت کبھی کبھی کافی بہتر ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی وہ

اتنی بیمار ہو جاتی ہیں کہ ان کی زندگی کی امید ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن اس لڑکی کے آجانے سے مجھے مما کی طرف سے کافی اطمینان ہو گیا تھا کیونکہ پہلے میں گھر سے باہر ہوتا تو مجھے ٹینشن رہتی تھی مگر اب ایسا نہیں تھا اب وہ مما کی کیئر کرنے لگی تھی، لیکن ایک عجیب سی بات تھی کہ رجب اسے جب بھی دیکھتا یہی کہتا کہ اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے اور ایک روز اس نے اظہار کر ہی دیا کہ یہ جبیں نامی لڑکی حبہ الٰہی جیسی لگتی ہے چند روز پہلے یہ گتھی سلجھی کہ وہ جبیں نہیں ہے اور اس کی داستان بھی جھوٹی ہے۔ کیونکہ چند روز قبل شہوار رجب کو کسی ریسٹورنٹ میں ملی تھی اس نے آپ کے متعلق ساری تفصیل بھی بتائی اور یہ بھی کہ غفار انکل آپ کی شادی کے دوسرے روز ہی لاہور چلے گئے تھے اور جانے سے پہلے وہ بیٹیوں سے کافی متنفر اور دلبرداشتہ تھے ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ جو کچھ ردا نے کیا وہ برداشت کے قابل تو نہ تھا......''

''ردا؟'' آفاق کے منہ سے ردا کا نام سن کر حبہ اور روحان دونوں ہی چونک گئے تھے۔

''ہاں بھابی وہ جبیں نام کی لڑکی درحقیقت ردا ہی ہے رجب اس سے مل چکا ہے اور اب آپ کو اس سے ملوانا چاہتا ہے......''

''لیکن ہم اس سے نہیں ملنا چاہتے۔'' حبہ کے انداز میں سختی تھی۔

''بھابی جو کچھ ہو چکا ہے اس کو بھول جائیں اس نے بھی کافی سزا پائی ہے اس کا کلاس فیلو یا پھر وہ کالج فیلو جو بھی تھا نکاح کرنے کے دو ماہ بعد ہی اسے طلاق دے کر چھوڑ گیا تھا اور وہ اسی مقام پہ کھڑی تھی جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا نجانے کہاں کہاں سے ٹھوکریں کھاتی وہ ایک عورتوں کے گینگ کے ہتھے چڑھ گئی وہ اسے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتی تھیں جس سے انکار کرنے کی صورت میں اسے جسمانی ٹارچر کیا گیا اور بھوکا رکھنے کے ساتھ ساتھ کمرے میں بند رکھا وہاں یہ تقریباً دو تین ماہ اذیت کا نشانہ بنتی رہی اور جب موقع ملا تو وہاں سے بھاگ آئی اسی لئے جب وہ مجھے ملی تو کافی خوف زدہ اور پریشان حال تھی اور میں سوچ رہا ہوں کہ جو کچھ اس نے کیا اس کی دگنی سزا پا چکی ہے اب اسے معاف کر کے آپ اس کا جینا آسان کر سکتی ہیں۔'' آفاق اتنے بڑے دھچکے کے بعد فوراً سنبھلنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، آخر کو وہ اسے پسند کرنے لگا تھا اور اسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا اور اس فیصلے کے بعد اتنا بڑا انکشاف کسی دھچکے سے کم تو نہیں تھا پھر بھی رجب کے سمجھانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کے مشورے سے وہ ایک اور فیصلہ کرتے کرتے رک گیا تھا اور آج رجب نے ہی اسے حویلی

آنے کا کہا تھا جہاں روحان اور حبہ موجود تھے روحان کو آئے ہوئے آج دوسرا دن تھا اور کل وہ دونوں لاہور کے لئے روانہ ہو رہے تھے اسی لئے رجب چاہتا تھا کہ حبہ اور روحان کے جانے سے پہلے ہی آفاق ان سے مل کر ردا کا معاملہ بھی ڈسکس کر لے۔

''آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟'' حبہ نے آفاق کو سر تا پا دیکھا اور آفاق کا سر مزید جھک گیا تھا اور حبہ اس کے جھکے سر سے جواب پا چکی تھی روحان بھی چپ ہو کے رہ گیا تھا آفاق بھی اس راہ کا مسافر تھا جہاں سے کبھی کوئی لوٹ نہیں سکا تھا اور نہ لوٹنے کی بے بسی انسان کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتی تھی آفاق بھی مجبور تھا وہ بھی ردا کو اتنی آسانی سے اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اور حبہ اس کی مجبوری سمجھ چکی تھی اسے آفاق کی کیفیت کا احساس ہو چکا تھا۔

حویلی سے نکلتے ہوئے اس کا دل بار بار گھبرا رہا تھا وہ کسی انجانے خدشے سے اندر ہی اندر سہمی ہوئی تھی لیکن اندر اُمڈنے والے ان خدشوں کو وہ زبان کی نوک پہ لاتے ہی ڈر رہی تھی۔ وہ حویلی سے جانے سے پہلے رجب آفریدی کو دیکھنا چاہتی تھی اس سے ملنا چاہتی تھی لیکن چاہنے کے باوجود وہ اس سے مل نہیں سکی تھی۔ بھرجائی گل جانی اور زریاب آفریدی حبہ کو جلدی واپس آنے کی تاکید کر رہے تھے وہ ہر بات پہ سر ہلاتی رہی مگر یہ نہ کہہ سکی کہ مجھے رجب آفریدی سے ملنا ہے سفر کے دوران بھی وہ خاموش ہی تھی۔

''حبہ میں کیا پوچھ رہا ہوں کیا ہوا اتنی چپ کیوں ہو؟'' روحان نے دوبارہ اسے متوجہ کیا۔

''حبہ، رجب کے گھر والے بہت اچھے ہیں بہت اپنائیت ہے ان لوگوں میں بلکہ خود رجب تو ان سے بھی زیادہ اچھا اور سمجھدار آدمی ہے۔'' روحان اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا اور جواباً وہ ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی تھی۔

لیکن لاہور پہنچ کر جب وہ روحان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو بے ساختہ ہی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے سامنے ہی خدیجہ بیگم، رابیہ اور ہانیہ کھڑی تھیں وہ بھی حبہ کو دیکھ کر لپک کے قریب آئیں اور پھر حبہ جو اتنے عرصے سے ایک پتھر کے مجسمے کی صورت میں جی رہی تھی یوں تڑپ کر روئی کہ ہر آنکھ اشک بار ہو گئی غفار الٰہی کے قدموں میں بیٹھ کر اس نے معافی مانگی ایسے گناہ کی معافی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا اور غفار الٰہی بھی اپنی بے رحمی کے خول سے نکل کر رو پڑے تھے۔

آپی یہ خط رجب بھائی دے کر گئے تھے کہتے تھے کہ جب تمہاری آپی یہاں آجائے تو یہ خط دے دینا......'' سب سے چھوٹی ہانیہ ایک لفافہ لے کر اس کے بستر کے قریب آگئی اور حبہ، رجب کا خط دیکھ کر سرتا پالرز اٹھی تھی۔

''وہ خود کہاں ہیں؟'' اس نے کانپتے ہاتھوں سے بمشکل لفافہ تھاما دل سینے کے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''وہ کہہ رہے تھے ایک دو ضروری کام نپٹا کر واپس پشاور جائیں گے۔''

''پشاور؟'' حبہ کا دل بیٹھنے لگا پہلے وہ اتنے دنوں سے اس سے ملنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی بعد میں امید بندھی کہ ہو سکتا ہے لاہور میں ہی ملاقات ہو جائے لیکن اب یہ امید بھی ختم ہو چکی تھی۔

''اُف میرا اللہ! کیوں کر رہا ہے وہ ایسا میرے سامنے کیوں نہیں آ رہا؟'' وہ سوچ سوچ کر چکرانے لگی تھی جب وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی وہ ہمہ وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا اب اسے دیکھنے کی تمنا جاگی تھی وہ کہیں دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔

''آپی کہاں کھو گئی ہیں؟'' ہانیہ نے اس کا کندھا ہلایا۔

''کہیں نہیں بس یونہی۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''چند دن اپنا دھیان ہماری طرف ہی رہنے دیں دو سال تو دھیان دیا ہے ان پہ۔'' اب کی بار رابیہ نے مداخلت کرتے ہوئے اسے چھیڑا حبہ ان کو کیسے بتاتی کہ دو سال بھی اس نے دھیان ان ہی پر دیا تھا اس پہ نہیں......آہستہ آہستہ لفافہ چاک کیا۔

''حبہ! مجھے معاف کر دو کہ میں تمہاری خوشیاں پہلے نہیں ڈھونڈ سکا مجھ سے اتنی دیر ہو گئی مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم کس کس گناہ کی سزا بھگت رہی ہو اور اتنی اذیت میں ہو بہرحال دیر آید درست آید......تمہیں اپنے گھر والوں سے ملنا مبارک ہو اور تمہیں تمہاری خوشیاں بھی مبارک ہوں آج کے بعد میں کبھی بھی تمہاری راہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گا، رکاوٹ تو میں پہلے بھی نہیں بنا تھا بس لالہ سائیں ذرا جلد بازی میں پرپوزل لے کر تمہارے گھر چلے گئے وہ شاید مجھے خوش دیکھنا چاہتے تھے لیکن انہیں کیا پتہ چند خوشیاں سراب کی مانند ہوتی ہیں مل کر بھی نہیں ملتیں پھر بھی انسان ان کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ میں بھی دو سال تمہارے پیچھے بھاگتا رہا اور تم مجھے مل کر بھی نہیں مل سکیں مجھے اس

بات کا قطعی دکھ نہیں کہ تم مجھے نہیں ملیں کیونکہ مجھے اس وقت اس بات کی خوشی ہے کہ اتنا عرصہ جس چیز کے پیچھے تم بھاگی ہو وہ تمہیں مل گئی ہے۔ عزت اور تمہارا کھویا ہوا مقام، تمہارا اعتماد، تمہارے اپنے، یہی تمہاری زندگی کا مقصد اور حاصل تھے جو پورا ہو چکے ہیں میں جانتا ہوں تمہاری زندگی میں رجب آفریدی کے لیے کچھ بھی نہیں ایک محبت بھری نگاہ بھی نہیں جس کے سہارے میں اپنی زندگی گزار سکوں اور اگر تمہاری ایک نگاہ بھی میرے لئے نہیں ہو سکتی تو یہ زندگی بھی نہیں ہو سکتی۔ میں نے دو سال تمہاری بے رخی کا عذاب سہا ہمیشہ تمہاری ہر بات کو نظر انداز کیا ہے کیونکہ کچھ لوگ کہتے ہیں محبت میں ثبات چاہتے ہو تو پہلے اپنی ذات کو بے ثبات کرو اور میں تو نجانے کب سے اپنی ذات کو بے ثبات کئے بیٹھا ہوں لیکن ابھی تک محبت میں ثبات نہیں پا سکا خیر یہ بھی اپنی اپنی قسمت...... ہے تم اب میری ہر پابندی سے آزاد ہو اپنے ماں باپ کے پاس رہنا چاہو تو رہ سکتی ہو ورنہ دوسری صورت میں تمہیں میرے بعد بھی حویلی کے دروازے کھلے ملیں گے، کیونکہ تم حویلی کی مالک ہو اور مالک پہ کبھی در بند نہیں ہوتا اس کے علاوہ جو محبت کرنے کی گستاخی کر چکا ہوں وہ معاف کر دینا اس گستاخی کے ازالے کے طور پہ اپنا آپ ہمیشہ کے لئے ختم کر رہا ہوں کیونکہ تمہارے روحان بھائی بھی آچکے ہیں اور گھر والوں سے بھی مل چکی ہو اس لئے اب مجھے بھی اپنا وعدہ پورا کرنا ہے آخر کو تم نے کہا جو تھا کہ میں مر جاؤں سو مر جاتا ہوں۔

(اللہ حافظ تمہارا رجب)

حبہ کی رنگت سفید لٹھے کی مانند ہو رہی تھی اور ہاتھوں میں پکڑا خط پنکھے کی ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

رجب کا ایکسیڈنٹ اور اس کی موت کی خبر پورے علاقے میں آگ کی طرح پھیلی تھی اور حبہ سکتے میں آگئی تھی۔ حبہ کے گھر والے بھی اس سانحے پہ بھونچکا سے رہ گئے تھے۔ گل جانی اور بھرجائی کے ساتھ ساتھ زریاب آفریدی بھی جیسے مر چکے تھے۔ گھر میں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا ہر کوئی جواں مرگ پہ ماتم کناں تھا، لیکن اتنے لوگوں میں صرف وہی تھی جو ساکت وصامت اور پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی رفتہ رفتہ گھر سے لوگوں کا ہجوم، اظہار تعزیت کے لئے بولے جانے والے جملے، غم زدہ دل سے اُمڈنے والے آنسو سب کچھ ختم ہو گیا حویلی میں سناٹا بولنے لگا در و دیوار سے تنہائی لپٹ گئی۔

لیکن اس کا سکتہ نہیں ٹوٹ سکا تھا روحان، غفار الٰہی، خدیجہ بیگم رابیہ ہانیہ، آفاق گھر والے سب ہی ہار گئے کہ حبہ کچھ بولے مگر وہ جیسے زبان سے محروم ہو چکی تھی اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی وہ بولنے کے ساتھ ساتھ محسوس کرنے کی حس بھی جیسے کھو چکی تھی آخر کار بھرجائی نے اس کی ذمہ داری اٹھا لی اور حبہ کے گھر والوں کو واپس جانے سے پہلے مطمئن رہنے کی تاکید کی تھی وہ لوگ چلے گئے تو سب کی توجہ کا مرکز حبہ کی ذات بن گئی لیکن حبہ خود نجانے کس اذیّت میں جل رہی تھی اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا......

بیڈ روم میں ہوتی تو خالی کمرہ کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا، بیڈ کا ایک حصہ خالی اور بے شکن بستر دیکھ کر اسے وحشت ہونے لگتی تھی اپنے دل میں جھانکتی تو اپنے لئے ہی نفرت کا پہاڑ کھڑا دکھائی دیتا تھا ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا وہ سرد ہو چکی تھی اس کے احساس بھی منجمد ہو چکے تھے ایسے حالات میں بھرجائی کو یقین تھا کہ وہ برف کی مورت اسی روز پگھلے گی جب کوئی پُرتپش احساس جاگے گا اور آج ایسا ہی ہوا تھا ڈاکٹر سے پریگننسی کا سن کر وہ پاگل ہو اٹھی تھی اور مسلسل اپنے آپ کو قاتل کہے جا رہی تھی۔ اس کی زبان پہ ایک ہی رٹ تھی کہ...... میں قاتل ہوں، میں نے قتل کیا ہے۔ میں نے اسے مارا ہے اب اس خوشخبری کی کسے ضرورت ہے اب اس خبر سے کیا حاصل؟ جب اس خوشخبری کا انتظار کرنے والا نہیں رہا تھا تو اس خوشخبری کا فائدہ ہی کیا تھا دو سال وہ اس خبر کا منتظر رہا تھا لیکن یہ خبر ملی کب؟ جب وہ خود نہیں تھا...... وہ بھرجائی کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی اور بھرجائی اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

⊛......⊛......⊛

بے ہوشی کا انجکشن ہی اس کی تڑپ کو کم کر سکا تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے سنبھلنے والی نہیں تھی۔ مگر جب وہ ہوش میں آئی تو آنسوؤں کے سیلاب اُمڈ آئے تھے۔ تکیے میں منہ چھپائے وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اس کا دماغ سوچ سوچ کر مفلوج ہونے کے قریب تھا اور دل کی دھڑکنیں بین کر رہی تھیں اسے رجب آفریدی کی موت ہی نہیں پچھتاوے بھی ڈس رہے تھے اور ان پچھتاوؤں کا زہر اس وقت اتنا تھا کہ اس کی روح نیلو نیل ہو رہی تھی۔ اس نے یونیورسٹی سے لے کر اب تک رجب آفریدی کی ذات کو چرکے لگائے تھے۔ اور ان دو سالوں میں تو زیادہ ہی سفاکی اور بے رحمی کی حد کر ڈالی تھی وہ ذرا خوش ہونے کی کوشش کرتا وہ اپنی نفرت سے سب کچھ ملیامیٹ کر ڈالتی تھی وہ جتنا قریب آنے کی کوش کرتا وہ اتنا ہی دور ہوتی چلی جاتی تھی اس نے آج

تک ایک بار بھی رجب آفریدی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا لیکن جب دیکھا تو پھر آخری بار ہی دیکھا تھا اور اس دیکھنے کا درد اس دیکھنے کی تڑپ آج بھی اس کے دل میں ترازو تھی وہ چاہ کر بھی رجب کی آنکھوں کا آخری تاثر دل سے محو نہیں کر سکی تھی اور کر بھی کیسے سکتی تھی آخر رجب کی بے لوث محبت نے بھی تو ایک نہ ایک دن اپنا آپ منوانا ہی تھا۔

اس نے اپنی ذات کو بے ثبات کیا تھا اپنی پور ہستی کی نفی کی تھی تو ایک دن محبت نے اسے ثبات تو کرنا ہی تھا اس کی محبت تو اپنا آپ منوا چکی تھی۔ حبہ کے دل پہ نقش ہو کر امر ہو گئی تھی لیکن اب وہ اذیّت میں تھی کہ رجب آفریدی کو کیسے بتائے کہ ہاں تمہاری محبت جیتی اور میری نفرت ہار گئی تم فاتح عالم ہو تمہاری محبت فاتح عالم ہے کیونکہ تمہاری محبت سچی تھی، بے غرض اور مخلص تھی مضبوط تھی اسی لئے اپنے مقام پہ قائم رہی۔ باقی سب کچھ مٹ گیا غفار الٰہی کی نفرت مٹ گئی۔ روحان الٰہی کی بدگمانی ڈھل گئی۔ حبہ کی ذات ہار گئی اسے بچھڑے ہوئے رشتے مل گئے سب کچھ اسی کی محبت کا ہی تو اعجاز تھا اس کی محبت کا بویا ہوا بیج تھا جو اب پھل دار درخت بن گیا تھا لیکن وہ نہ اس درخت کی چھاؤں دیکھ سکا تھا، نہ ہی اس کا پھل کا ذائقہ چکھ سکا تھا یہی احساس حبہ آفریدی کو کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ نادم تھی پچھتاوا اور ملال دل سے نکالے نہیں نکل رہے تھے وہ رجب آفریدی کی کمی بھلائے نہیں بھول سکتی تھی۔

⊛......⊛......⊛

رات دن میں اور دن ہفتوں میں بدلے تو مہینوں کی رفتار میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا...... حبہ پہ چھایا ہوا سکتہ تو ٹوٹ گیا تھا مگر دل میں پھیلے ملال کا حصار ٹوٹ کے نہیں دے رہا تھا وہ گل جانی، بھرجائی زریاب آفریدی اور اپنے گھر والوں کا نئے آنے والے مہمان کے لئے اتنا جوش و خروش دیکھتی تو گھنٹوں کڑھتی رہتی کہ وہ لوگ کتنی جلدی رجب کو بھول کر کسی نئے فرد کے لئے خوش ہو رہے ہیں اور کتنی آسانی سے حبہ کو بھی فراموش کر چکے تھے بس ایک بھرجائی ہی تھیں جو اس کا خیال رکھتی تھیں اسی لئے آج ہسپتال جانے سے پہلے وہ بھرجائی کا ہاتھ تھام چکی تھی۔

''بھرجائی! آپ بہت اچھی ہیں مجھ سے آج تک جتنی بھی گستاخیاں ہوئی ہیں مجھے معاف کر دیجئے گا...... میں نہیں جانتی کہ میں زندہ بھی رہوں گی یا نہیں لیکن جس حال میں بھی ہوئی آپ کا خلوص آپ کی محبت نہیں بھلا سکوں گی اور پلیز میرے لئے دعا کیجئے گا کہ مجھے رجب آفریدی بھی معاف کر دے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"پگلی! تو ہمارے لئے خوشیاں لینے جا رہی ہے اللہ انشاء اللہ تیرا دامن خوشیوں سے بھر کے بھیجے گا، تیرے سارے غم مٹ جائیں گے سب کے آزمائش کے دن ختم ہو گئے ہیں تمہارے بھی ہو جائیں گے اللہ سے بہتری کی امید رکھو تمہیں شاید پتہ نہیں کہ رجب کو اپنے بچوں کا کتنا شوق تھا وہ کہتا تھا میرے جتنے بھی بچے ہوئے وہ لالہ سائیں کے بچے ہوں گے۔"

بھر جائی کہہ رہی تھیں اور وہ اس کے ذکر پہ ضبط کرتے کرتے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"اری پگلی تو رو رو کر ہی مر جائے گی دیکھ تیرے لالہ سائیں کو پتہ چلا تو ڈانٹنے کے لئے پہنچ جائیں گے شاباش چپ ہو جا۔"

وہ اسے لپٹا کر بہلانے لگیں، مگر حبہ کا بہلنا اتنا آسان نہیں تھا۔

❁......❁......❁

بچے کی پیدائش کے بعد بھی اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں اس کے احساس کا دامن ابھی بھی ویران تھا اس کے دل میں اپنے بیٹے کو دیکھنے کی کوئی تمنا نہیں تھی مگر اس کے علاوہ ہر فرد کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا ہسپتال میں مٹھائیاں بانٹی جا رہی تھیں، ہر ایک کی زبان پہ مبارک کا لفظ تھا لیکن جس کو سب سے زیادہ خوشی ہونی چاہئے تھی وہ غم اور افسردگی کی لپیٹ میں تھی۔ "آپی اس کی آنکھیں تو بالکل رجب بھائی کی طرح ہیں اور ہونٹ بالکل آپ جیسے۔"

رابیہ کے لہجے سے خوشی اور پیار چھلک رہا تھا۔ حبہ نے لب بھینچتے ہوئے رُخ دوسری سمت موڑ لیا۔ رابیہ نے اس کی اس حرکت پہ گردن موڑ کر بھر جائی اور ہانیہ کو دیکھا وہ بھی حبہ کا انداز دیکھ چکی تھیں......خوشی کو سیلیبریٹ کرتے رہے۔ آفاق ہر کام میں پیش پیش تھا۔

صرف ردا شامل نہیں تھی کیونکہ غفار الٰہی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ اس کی غلطی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے باپ سے شرمندگی کی وجہ سے اپنوں کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونے سے قاصر تھی البتہ باقی سب اسے معاف کر چکے تھے لیکن جب تک غفار الٰہی اسے معاف نہ کرتے وہ اپنے دل میں انکی پھانس اور ماتھے پہ تحریر ندامت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی۔

"رابیہ بیٹا! اپنی آپی کو کمرے میں چھوڑ آؤ۔" بچے اور حبہ کی نظر اتارنے کے بعد بھر جائی نے اشارہ کیا۔

"اسے تھوڑی دیر ہمارے پاس ہی رہنے دیں۔"

روحان اور ہانیہ نے بچے کو روک لیا تھا...... "ارے جانے دو بیٹا ابھی تک اس کی ماں نے تو اسے دیکھا ہی نہیں۔ گل جانی نے ٹوکا تھوڑی دیر بعد بھیج دیں گے۔"

وہ لاپروائی سے بولے تو گل جانی خفگی سے گھورتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئیں وہ لوگ قہقہہ لگا کے ہنس دیئے۔

"اچھا آپی آپ آرام کریں ابھی آپ کے لئے کھانا بھجواتے ہیں۔" رابیہ اسے بیڈ تک چھوڑ کے گئی تھی اور اس کے جاتے ہی اس نے تکیہ چہرے پہ رکھ لیا تھا۔

"تھکن کی وجہ سے رو رہی ہو یا پھر میں یاد آ رہا ہوں؟" بھاری مردانہ آواز آس پاس ہی سنائی دی۔

"ویسے یار بہت خوبصورت ہو گئی ہو نجانے یہ میری محبت کا کرشمہ ہے یا پھر ان آنسوؤں کا اثر۔" آواز کے ساتھ آہٹیں بھی سنائی دینے لگی تھیں اور وہ اپنا وہم سمجھ کر چہرے سے تکیہ ہی نہیں ہٹا رہی تھی۔

"ارے یار کچھ تو بولو ورنہ دوبارہ چلا گیا تو واپس بھی نہیں آؤں گا۔" اب کی بار وہ جھنجھلایا ہوا لگا اور حبہ نے مرے مرے انداز سے چہرے سے تکیہ ہٹا دیا۔ وہ بیڈ پہ اس کے پہلو میں بے حد قریب بیٹھا تھا۔ حبہ اپنے اس قدر جیتے جاگتے وہم سے اور زیادہ دلبرداشتہ ہو گئی۔ حبہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے (کاش کہ تم سچ مچ میرے سامنے میرے اتنے ہی قریب ہوتے جتنے نظر آ رہے ہو۔)

"آج جو تحفہ تم نے مجھے دیا ہے اس کا شکریہ میں تمام عمر ادا نہیں کر سکوں گا بلکہ ہمیشہ احسان مند رہوں گا تمہارا بھی اور اپنے رب تعالیٰ کا بھی۔" وہ جھک کر اس کے ماتھے پہ بوسہ دے رہا تھا، پھر وہاں سے اٹھ گیا اور حبہ کو احساس ہوا کہ اس کے ماتھے پہ دیئے جانے والے بوسے میں زندگی تھی مکمل زندگی اور زندگی کی حرارت تھی۔ اور یہ زندگی کا ہی احساس تھا کہ وہ چونک گئی اس نے تڑپ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے رجب آفریدی کو دیکھا۔ وہ اپنے بال سنوارتا شاید سرشاری کی کیفیت میں کچھ گنگنا بھی رہا تھا، پھر پرفیوم اٹھا کر اسپرے کیا تب تک حبہ ننگے پیر چلتے اس کے قریب آ چکی تھی وہ اسے اس طرح کھویا کھویا سا دیکھ کر ٹھٹکا پھر اس کی کیفیت سمجھ گیا۔ حبہ نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے چہرے پہ رکھا اس کی شیو کی چبھن اسے ہاتھ سے محسوس ہوئی پھر اس کے بال چھوئے جو ابھی ابھی سنوارے گئے تھے وہ بھی بکھر گئے رفتہ

رفتہ اس کے کندھے اس کا سینہ اس کے ہاتھ چھو چھو کر محسوس کرتی وہ خوشی اور بے یقینی کے خلاء میں ڈول رہی تھی۔

''تت، تم زندہ ہو...... تت تم ٹھیک ہو...... ہو؟ تم ٹھیک ہو تم زندہ ہو؟'' وہ گھٹی گھٹی آواز سے بولی اس کا حلق جیسے بند ہو رہا تھا۔

''ہاں میں زندہ ہوں اور ٹھیک بھی ہوں۔'' اس نے حبہ کے آنسو پونچھے تو وہ تڑپ کر اس سے لپٹ گئی اور حبہ آفریدی کو لگا کہ پوری کائنات اس کی مٹھی اس کے حصار میں آ گئی ہو وہ دل ہی دل میں اللہ کے حضور اس کا شکرانہ ادا کرنے جھک گیا تھا۔

کیوں چلے گئے تھے تم...... کیوں چلے گئے تھے کیوں مجھے اتنی سزا دی؟ کیوں اتنا دُکھ دیا؟ وہ بلک بلک کے روتی شکوے بھی کر رہی تھی۔

''اگر اتنا دکھ نہ دیتا تو آج اتنی خوشیاں بھی نہ دیکھ سکتا، آج حبہ آفریدی کی اپنے لئے اتنی محبت اور تڑپ بھی نہ دیکھ سکتا تمام عمر یونہی ترس کے گزار دیتا۔'' وہ اسے حصار میں لئے کہہ رہا تھا اور حبہ نے حیرت سے [illegible] اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ہاں یار ایسا کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا تمہارے سوئے ہوئے دل کو جگانے کے لئے مجھے جھوٹ موٹ کی موت کو گلے لگانا پڑا، ورنہ تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ تم کبھی بھی میرا احساس نہیں کر سکتیں یہ تو بھلا ہو روحان کا جس نے میرا ساتھ دیا اور میری محبت میرا حق مجھے دلا دیا......''

''روحان؟'' وہ اور الجھی۔ ''یار! میں نے روحان کو بتایا تھا کہ تم نے آج تک میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے، اور ابھی تک تم مجھ سے بدگمان ہو تب اس نے مشورہ دیا کہ کچھ عرصہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اُوجھل ہو جاؤ جب ہر پل ہر لمحہ اس کا احساس اس کی پرواہ کرنے والا نہ رہا تو بہت آسانی سے عقل آ جائے گی تب اسے تمہاری قدر بھی ہو گی سو ہم اپنے اکلوتے سالے کا مشورہ مان گئے اور خالی گاڑی کا ایکسیڈنٹ کروا دیا، ویسے یار یہ جو چھ ماہ تم نے میرا سوگ منایا ہے، ماتم کیا ہے اور اتنے آنسو بھی بہائے ہیں کیا پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے میری لاش دیکھی تھی؟'' آخر میں وہ شرارت سے بولا اور حبہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''وہ...... وہ سب تو کہہ رہے تھے گاڑی دریا میں گری ہے اور لاش نہیں مل رہی اور......'' حبہ کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

یکدم اس کے حصار سے نکلی مگر جب نے اسی رفتار سے اسے دوبارہ جکڑ لیا تھا۔

''چھوڑو...... مجھے جھوٹے فریبی...... دھوکے باز...... تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا...... تمہیں احساس تک نہیں ہوا کہ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو؟'' وہ یکدم روہانسی ہو گئی اور غصے سے لڑتی جھگڑتی اس کے سینے پہ مکوں کی برسات کر چکی تھی اور وہ قہقہے لگاتا بہت آرام سے اس کی یہ پیار بھری مار کھا رہا تھا۔

⚙......⚙......⚙

آج ردا کا نکاح آفاق کے ساتھ انجام پا گیا تھا لیکن اس نکاح میں اس کے ماں باپ شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ زندگی بھر اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور یہی اس کی عمر بھر کے لئے سزا تھی وہ اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کی اپنائیت سے محروم تھی اور اسے اب ہمیشہ یونہی محروم ہی رہنا تھا اس نے ایک وقتی خواہش اور وقتی جذبات کے آگے ماں باپ کی عزت روندی تھی باپ کی گردن جھکائی تھی۔ ماں کی تربیت کو داغ لگایا تھا تو بدلے میں یہ سزا یہ محرومی تو پانا ہی تھی نہ وہ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکتی تھی اور نہ اپنے دکھ درد میں شامل کر سکتی تھی کیونکہ اس جیسی کمزور کردار کی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جس طرح اس نے ماں باپ کو غیر اہم کیا تھا اسی طرح انصر نیاز اسے غیر اہم کر کے پھینک گیا تھا وہ سب کی نظروں میں گری بھی تھی اور عمر بھر کا داغ بھی لگا چکی تھی ایسا داغ جسے وہ مرنے کے بعد بھی نہیں دھو سکتی تھی البتہ اس کے برعکس حبہ سرخرو تھی اپنے شوہر کے سامنے بھی اور اپنے ماں باپ کی نظروں میں بھی اس کی ذات معتبر تھی اس کے لئے ہر آنکھ میں عزت تھی احترام تھا وہ اپنے سسرال اور میکے دونوں میں راج کر رہی تھی ہر کوئی اس کے دکھ پہ دکھی ہوتا تھا اور اس کی خوشی میں خوش ہوتا تھا اس کے لئے دعاؤں کا سایہ تنا ہوا تھا۔ اور ردا کے لئے کسی بھی زباں پہ دعا نہیں تھی کیونکہ ایسی لڑکیوں کے مقدر میں ایسے ہی انجام لکھے جاتے تھے...... جن میں عمر بھر کا پچھتاوا اور قبر تک جانے والا سیاہ داغ ہوتا ہے......

جس کے بعد لوگ انہیں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے نام سے جانتے اور پہچانتے تھے لیکن حبہ جیسی باکردار اور باعزت لڑکی کے لئے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا لقب پانا موت کے مترادف تھا اسی لئے وہ سر بلند کئے جی رہی تھی اور ردا جیتے جی مر چکی تھی، کیونکہ وہ گنہگار تھی۔

......⚙......

حسابِ دِل رَہنے دُو

''سر! پلیز اس فائل میں آپ کے سائن چاہئیں یہ فائل آج ہی بینک بھجوانی ہے، مینجر صاحب کا فون آیا تھا۔'' اس نے عارفین شیرازی کو فون کال بند کرتے دیکھ کر فوراً ہی اپنا کام کہنا شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی فائل اس کے سامنے ٹیبل پہ رکھ دی تھی۔

اس نے فائل اٹھا کر چیک کی اور پھر پین کا کیپ ہٹا کر فائل پہ سائن بھی کر دیئے تھے۔

''اور کچھ؟'' وہ ڈائریکٹ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''جی سر! مسز ہمدانی نے یہ فیکس بھیجا ہے۔'' اس نے دوسری فائل کھول کر فیکس بھی اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''او کے......'' وہ آہستگی سے بولا تھا۔

''کیا اب میں جا سکتی ہوں؟'' وہ جانے کے لئے پر تول رہی تھی۔

''ہوں!'' وہ کسی سوچ میں گم صرف سر ہی ہلا سکا تھا اور وہ تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

''اروئی! رکو میری بات سنو۔'' اپنی سوچ، اپنے دھیان سے نکلتے ہی اس نے بے ساختہ اروئی کو پکارا تھا اور اس کا ہاتھ ہینڈل گھماتے گھماتے تھم گیا تھا۔

''جی سر؟'' اس نے پلٹ کر انتہائی نارمل سے انداز میں پوچھا تھا۔ لیکن اب وہ خاموش ہو چکا تھا کہ کیا کہے؟ کیونکہ کہنے کو تو بہت کچھ تھا، مگر کہنے کا...... صحیح وقت نہیں تھا۔

''کیا اب میں جا سکتی ہوں؟'' اس نے دُہرا کر پوچھا تھا۔

''ہوں؟ نہیں بیٹھو یہاں۔'' اس نے ''آپ'' کو ''تم'' میں بدلتے ہوئے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

''سر! میری ٹیبل پہ اس وقت کافی سارا کام ادھورا پڑا ہے، سو پلیز لٹ می گو۔'' وہ بے حد سنجیدہ اور دوٹوک لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ اس کے انداز پہ لب بھینچتے ہوئے خود کو کنٹرول کرتا اپنی چیئر دھکیل کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

''اروئی! تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ جس حقیقت سے تم دامن چھڑا رہی ہو، نظریں چرا رہی ہو، میں اس حقیقت کو ہر زاویے سے، ہر لحاظ سے قبول کر چکا ہوں۔'' عارفین شیرازی کا لہجہ کافی مضبوط تھا۔

''کون سی حقیقت سر؟'' وہ بے حد اجنبیت اور لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو اروئی! پلیز اس طرح بات نہ کرو۔'' عارفین کے لہجے میں پل میں تھکن اتر آئی تھی۔

''سر میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوا ہے وہ ایک ''ڈرامہ'' تھا اور اس ڈرامے میں دو کریکٹر تھے اروئی حیات اور عارفین شیرازی اور ان دونوں کریکٹرز کا اپنے آپ پہ کوئی اختیار نہیں تھا، ان کا تمام دارومدار اور اختیار اس ڈرامے کی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے ہاتھ میں تھا، یعنی زوئلہ شیرازی اینڈ رابعہ شیرازی کے ہاتھ میں...... اور اب جب اس سوپ سیریل کا اختتام...... ہو چکا ہے تو آپ اسے ریپیٹ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ ایک ڈرامہ ایک بار ہی ہٹ ہوتا ہے، بار بار ریپیٹ کرنے سے نہیں...... پلیز بھول جائیں اس بات کو کہ جو گزرا وہ حقیقت تھی، بلکہ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جو ہوا وہ ''ڈرامہ'' تھا۔ ایک ڈرامہ ختم ہو تو دوسرے ڈرامے کی تیاری کی جاتی ہے، پلیز آپ بھی کسی نئے ڈرامے پہ توجہ دیں اور پھر سے تیاری شروع کر دیں۔''

اروئی نے کافی نپے تلے اور کھرے کھرے لفظوں میں اسے اپنی اہمیت اور دائرہ سمجھا دیا تھا۔ جس پہ چند سیکنڈز کے لئے عارفین شیرازی کچھ بھی نہ کہہ پایا تھا۔

''تم آخر چاہتی کیا ہو؟ تم نے کیا سوچا ہے اس سارے قصے کے بارے میں؟'' عارفین کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اروئی کو کیسے سمجھے اور اسے کیسے سمجھائے؟ شاید اِن کی کیفیات، تاثرات اور جذبات اس مقام پہ تھے جہاں لفظوں کا دائرہ اور اظہار کا پیراہن بھی کم پڑ جاتا تھا، بالکل اسی طرح عارفین شیرازی ٹھیک سے اظہار نہیں کر پا رہا تھا اور اروئی اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی اور اسی بات پہ وہ جھنجھلا اٹھتا تھا۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں اروئی کہ تم خود کیا چاہتی ہو؟''

''آپ مجھے بار بار ڈسٹرب کرنا چھوڑ دیں۔'' وہ تیزی سے بولی تھی

''اور جو میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں؟ میری زندگی سکون سے عاری ہو چکی ہے؟ کیا اس کا احساس نہیں ہے تمہیں؟'' وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچتا دبے لہجے میں جیسے بپھر رہا تھا۔

''سر! آپ اپنے ذاتی معاملات میں مجھے مت گھسیٹا کریں، میں آپ کی پی اے ہوں، میرا تعلق آپ کے کاروبار، آپ کے آفس اور آپ کے دیگر کاموں سے ہے۔ آپ کی ذات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور پلیز وقت بے وقت کوئی ڈرامہ ری ایکٹ کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آفس ہے آپ کا بیڈروم نہیں۔''

''شٹ اپ اروی! جسٹ شٹ اپ۔'' عارفین شیرازی کا ہاتھ اٹھا، لیکن پھر اس نے اپنے ہاتھ کو فضا میں ہی روک لیا تھا۔

''تم سے بات کرنے کے لئے مجھے کسی آفس، کسی بیڈروم کی حدود کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جب چاہے، جہاں چاہے تم سے بات کر سکتا ہوں۔'' وہ کافی غضب ناک لہجے میں کہتا دروازے کو ٹھوکر مارتا ہوا اروی سے پہلے آفس سے باہر نکل گیا تھا اور اروی پہلی بار اس کا اس قدر شدید غصہ اور جذباتی انداز دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی تھی، یہ اس کے غصے کی انتہا ہی تھی کہ وہ آج اس پہ ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا، بے شک یہ تھپڑ اس کے چہرے پہ نہیں پڑا تھا، مگر اس تھپڑ کا احساس عارفین کو بھی ہو گیا تھا اور اروی کو بھی۔

''السلام علیکم!'' ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہمیشہ کی طرح ذرا اونچی آواز سے سلام کیا تھا، اور بابا جان نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا، وہ کافی ڈھیلے ڈھالے انداز سے بریف کیس صوفے پہ ڈال کر ٹائی کی ناٹ کھول رہا تھا۔

''تھک گئے ہو؟'' اس کے سلام کا جواب دے کر وہ پوری طرح سے اس کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔

''شاید.....'' وہ بے حد آہستگی سے بولا اور صوفے کی بیک سے پشت ٹکا کر پلکیں موند لی تھیں۔

''عارفین! تم اپنے اندر کا حال کیوں نہیں بتاتے؟ صبح گھر سے آفس کے لئے نکلتے ہوئے بہت تازہ دم، زندگی سے بھرپور ہوتے ہو، لیکن واپسی پہ اک ہارے ہوئے جواری کی

طرح نظر آتے ہو۔ مجھے بتاؤ آخر تم کیا چیز ہار کے گھر آتے ہو؟ ایسی کیا چیز ہے جو تمہیں خوش نہیں رہنے دیتی؟ پہلے تمہاری اولاد نہیں تھی، لیکن تم خوش رہتے تھے، اب اللہ نے یہ کمی بھی پوری کر دی ہے، تمہیں چاند سا بیٹا دیا ہے، لیکن پھر بھی تم خوش نہیں ہو؟ کیا وجہ ہے آخر؟'' بابا جان ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک سائیڈ پہ رکھتے ہوئے اپنی گہری نگاہوں سے اس کا بغور جائزہ لینے لگے۔ جبکہ عارفین کے دل میں ایک سرد لہر اٹھی تھی۔

''بابا جان آپ کی خواہش اور اپنی ماں کی ضد نے ہی تو مجھے اس قدر ہارنے پہ مجبور کیا ہے، اب میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں تو میں کیا کر سکتا ہوں، میں آپ لوگوں میں سے کس کو دوش دوں؟ کون مجرم ہے میرا؟ آپ لوگ یا پھر میں خود؟'' اس نے بے بسی سے سوچا تھا۔

''عارفین بولو کیا ہار کے آئے ہو؟'' بابا جان اسے کھوجنا چاہتے تھے۔

''اپنی زندگی، اپنا دل.....'' وہ بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں آہستگی سے بولا تھا اور بابا جان اس کے جواب پہ اُلجھ کے رہ گئے تھے، شک تو انہیں پہلے سے تھا، اب وہ ان کے شک کو یقین دے رہا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے تم اپنی زندگی یعنی اپنا سب کچھ ہار کے گھر آئے ہو؟'' انہوں نے باقاعدہ دُہرا کر پوچھا تھا۔

''ہاں شاید یہی کہا ہے۔'' عارفین نے آنکھیں کھول کر چھت سے لٹکتے بے حد خوبصورت اور بیش قیمت فانوس کو دیکھتے ہوئے جس لہجے میں کہا تھا بابا جان کو اور بھی بے چینی لگ گئی تھی۔

''ہمارا تو خیال تھا کہ تمہاری زندگی اس گھر میں ہوتی ہے، تمہاری بیوی، تمہارا بچہ، تمہاری ماں، تمہارے دادا، دادی، تمہارا سب کچھ یہاں ہے، پھر باہر تمہاری زندگی.....'' انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''یہاں اس گھر میں میری زندگی نہیں بلکہ زندگی کے چند حصے رہتے ہیں، جبکہ میری پوری زندگی اور زندگی کا حاصل اس گھر سے دور ہے میں اپنی زندگی کو اور زندگی کے تمام حصوں کو یکجا کرنا چاہتا ہوں، ایک جگہ رکھنا چاہتا ہوں، میں ایک مکمل زندگی جینا چاہتا ہوں بابا جان.....لیکن مجھ سے ایسا ہو نہیں پا رہا، مجھ سے میری زندگی کے حصے سمٹ نہیں پا رہے، بلکہ اور بھی بکھر رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ میں بھی بکھر رہا ہوں، مجھ پہ کیا بیت رہی ہے میں بیان نہیں کر پا رہا، میں بے بسی

کی انتہا پہ ہوں اس وقت۔'' وہ اضطراری انداز سے کہتا صوفے سے کھڑا ہو گیا تھا، دونوں ہاتھ اپنے بالوں میں پھنسا لئے تھے، اس کی بے چینی اور بے بسی اک اک حرکت سے عیاں تھی۔

''کوئی نام بھی تو ہوگا تمہاری زندگی کا؟'' بابا جان کے سوال پہ وہ بُری طرح چونک گیا تھا اور جب احساس ہوا کہ وہ ''کس'' کے سامنے کھل رہا ہے تو فوراً ہی اپنے آپ کو اس سنگین حماقت سے روک لیا تھا اور اپنی کیفیت کنٹرول کرنے لگا تھا۔

''حانی! حانی کہاں ہے نظر نہیں آ رہا؟'' وہ بڑی مہارت سے بدل گیا تھا۔

''عارفین ہم نے کچھ اور پوچھا ہے؟'' بابا جان نے زور دے کر کہا تھا۔

''وہ سب بھی ہوتا رہے گا بابا جان ابھی میں اس سے تو مل لوں، روز وہ یہاں ہی ہوتا ہے ڈرائنگ روم میں، لیکن آج کہیں دکھائی نہیں دے رہا، میں ابھی آتا ہوں اسے دیکھ کر۔'' عارفین نے وہاں سے نکلنے میں تین سیکنڈز کا وقت لیا تھا اور بابا جان اپنے پوتے کی دُہری شخصیت کے...... پرزے جوڑتے ملاتے رہ گئے تھے۔

وہ بہت دنوں سے اس پہ غور کر رہے تھے، لیکن ابھی تک کوئی سراغ ہاتھ آ کے نہیں دیا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی عارفین کا خود دل چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ بابا جان کے سامنے بیان کر دے، اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپے تمام اچھے بُرے راز ان کے حضور کھول کے رکھ دے، مگر حوصلہ کرتے کرتے پھر سے ہمت ہار جاتا تھا۔ صرف یہ سوچ کر سب کچھ جان لینے کے بعد نہ جانے ان کا ردعمل کیا ہوگا؟ وہ کونسا فیصلہ کریں گے؟ اور کیا سوچیں گے؟ کیا سب نے ان کو دھوکہ دیا؟ بیٹا ان کا اپنا نہیں بن سکا تو کیا پوتا بھی ان کا نہیں بن پایا؟ ان کے پاس ساری زندگی کا سرمایہ، ساری زندگی کا کیا اثاثہ تھا؟ صرف اور صرف عارفین شیرازی اور زندگی کے ایک مقام پہ وہ بھی ان کو دھوکہ دے گیا تھا؟ اور یہی سب سوچ کر وہ اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے روک لیتا تھا ابھی بھی اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکا تھا اور بات ٹال دی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ بی بی جان نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ بھی بولنے سے روک دیا تھا، گویا حانی ابھی ابھی سویا تھا، وہ ایک ہاتھ سے اسے تھپکتے ہوئے سلا رہی تھیں۔

''السلام علیکم!'' اس نے بے حد آہستگی سے قریب آ کر سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام، بیٹھو بیٹا۔'' انہوں نے بھی آہستگی سے ہی جواب دیا تھا۔

''یہ ٹھیک تو ہے؟'' اس نے حانی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

''ہاں اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہے، یہ بس نیند کے لئے رو رہا تھا اسی لئے سلایا ہے۔'' بی بی جان نے چھ ماہ کے حانی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا، وہ نرم بستر پر، نرم سی کروٹ لئے سو رہا تھا۔

''زوئلہ کہاں ہے؟'' عارفین کو بیوی کا خیال آیا۔

''جہاں ہوتی ہے۔'' بی بی جان نے تلخی سے کہا تھا اور عارفین چپ سا ہو گیا تھا، وہ جن چیزوں، جن کاموں میں قصوروار نہیں بھی تھا ان کے لئے بھی مجرم ہو جاتا تھا۔

''اچھا بیٹا تم کپڑے تبدیل کر کے آؤ تب تک ہم کھانا لگواتے ہیں۔'' بی بی جان بیڈ سے اترتے ہوئے بولیں۔

''دودھ پیا ہے اس نے؟'' عارفین نے بیڈ کے قریب آتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ظاہر ہے بیٹا یہ دودھ پی کر ہی سویا ہے، دودھ کے بغیر گزارا ہے اس کا؟'' وہ خوشگوار لہجے میں بات کر کے عارفین کی فکر مٹا رہی تھیں۔ وہ بیڈ کے قریب کھڑا حانی کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا، آنسوؤں کی نمی سے اس کی پلکیں جڑی ہوئی تھیں، وقفے وقفے سے اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں بھی نکل رہی تھیں، یعنی وہ کافی دیر تک اور کافی شدت سے روتا رہا تھا۔

''میں اس کو اپنے بیڈروم میں لے جاتا ہوں۔'' وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا تھا۔

''ارے...... رہے جاگ جائے گا، اتنی مشکل سے سلایا ہے ابھی...... پگلے اسے کوئی تنگ کر رہا ہے یہاں؟'' بی بی جان نے بڑی تیزی سے عارفین کا بازو پیچھے ہٹایا تھا۔

''دیکھو تھکے ہوئے آئے ہو، جا کر کپڑے تبدیل کرو اور کھانا کھاؤ آ کر، میں بھی آ رہی ہوں۔'' وہ لہجہ بدل کر بولیں تو عارفین خاموشی سے پلٹ کر چلا گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد وہ بی بی جان اور بابا جان کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، لیکن اس کا دھیان بار بار زوئلہ کی طرف جا رہا تھا جو حانی کی ذرا سی بھی پرواہ کئے بغیر اس وقت نہ جانے کہاں رنگ رلیاں منا رہی تھی؟ اور حانی تو دور کی بات اس نے اب عارفین کی تھوڑی بہت پرواہ کرنا بھی چھوڑ دی تھی، پہلے ساری زندگی اس نے ماں کی لاپرواہیاں دیکھی تھیں اور اب ماں کے ساتھ ساتھ بیوی کی عیاشیاں بھی دیکھنا پڑ رہی تھیں، قسمت کا چکر ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ چاہ کر بھی ان سے دامن نہیں چھڑا پا رہا تھا، کیونکہ ان سے دامن چھڑا لینا اتنا آسان ہوتا تو آج وہ اس نوبت کو نہ پہنچتا جہاں وہ سکون بھی گنوا بیٹھا تھا

اور جہاں وہ بی بی جان، بابا جان کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کا اور اپنے بیٹے کا بھی مجرم تھا۔

"تمہیں تنخواہ نہیں ملی ابھی تک؟ گھر کی ہر چیز ختم ہو چکی ہے، اتنی تنگی ہو رہی ہے آج کل۔" اس کو آفس کے لئے تیار ہوتے دیکھ کر بھابی نے ذرا بے زاری سے کہا تھا، اروٰی اپنے لمبے بالوں کی چوٹی بناتے بناتے لحہ بھر کو رکی اور بھابی کا کوفت زدہ چہرہ دیکھا تھا۔

"کیم آج ہے بھابی......" اس نے نپے تلے مگر کچھ خفگی بھرے انداز سے جواب دیا تھا۔

"اچھا؟ میں تو سمجھی تھی کہ کل کیم تھی، خیر واپسی پہ تنخواہ ملے تو میری یہ میڈیسن لے آنا، رات کو تھکن سے نیند نہیں آئی اور بی پی بھی ہائی ہو جاتا ہے۔" انہوں نے جھٹ اپنی لسٹ تھما دی تھی اور اروٰی اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔

"سونیا تیار ہے؟" اس نے پلٹ کر بھابی سے پوچھا تھا۔

"ہاں تیار ہے اس کی ٹیچر سے کہنا کل کسی بچے نے سونیا کو مارا تھا، اس کے گال پہ ابھی بھی نشان ہے یہ دیکھو۔" بھابی نے سونیا کو پکڑ کر سامنے کیا تھا۔

"تو آپ نے مجھے کل کیوں نہیں بتایا تھا؟" اروٰی سونیا کو قریب سے دیکھ کر تڑپ گئی تھی اس کے گال پہ سرخ نشان بہت واضح دکھائی دے رہا تھا۔

"میں ابھی بات کرتی ہوں ٹیچر سے۔" اروٰی سونیا کی انگلی تھامے دروازہ عبور کر گئی تھی۔

سونیا کا سکول ان کے محلے سے اتنا دور نہیں تھا، اروٰی روزانہ آفس جاتے ہوئے سونیا کو سکول چھوڑتے ہوئے جاتی تھی اور واپسی پہ سارہ اس کو لے آتی تھی۔ پانچ سالہ سونیا جو ابھی پریپ میں اپنی زبان اپنے الفاظ کے اتار چڑھاؤ درست کر رہی تھی، سب گھر والوں کو ہی بہت پیاری لگتی تھی، اروٰی اور سارہ بھی بے حد پیار کرتی تھیں اور پیار تو انہیں ایک سالہ عمر سے بھی تھا، وہ بھی اپنی توتلی زبان سے پھوپھو کہہ کر دل موہ لیتا تھا اور وہ بہنیں نثار ہو جاتی تھیں۔

سونیا کی ٹیچر سے بات کرتے کرتے وہ آفس سے لیٹ ہو چکی تھی، جبھی بہت عجلت میں وہ آفس پہنچی تھی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بُری طرح کسی سے ٹکرائی تھی، لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے جس مضبوطی سے اسے بازو سے پکڑ کر گرنے سے روکا تھا وہ اس گرفت اور اس ہاتھ کے مضبوط لمس سے ہی پہچان گئی کہ اسے سہارا دینے والا کون ہے؟

"ایم سوری سر!" وہ فوراً سنبھل کر بولی تھی، جبکہ عارفین نے کلائی پہ بندھی گھڑی

دیکھی تھی۔

"کتنے منٹ لیٹ ہیں آپ؟"

"چالیس منٹ۔" اس نے سر جھکا لیا تھا۔

"آفس کے رولز کے مطابق پندرہ منٹ لیٹ ہونے والے ورکر کو چھوٹ دی جا سکتی ہے اتنا زیادہ لیٹ ہونا قابل قبول نہیں ہو سکتا۔" عارفین آفس ٹائمنگ کے متعلق اتنا سخت ہے پیش آتا تھا کہ اس کا کوئی بھی ورکر کبھی لیٹ نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ سب کے سامنے جھاڑ کے رکھ دیتا تھا، جیسے اس وقت اروٰی کے ساتھ ہوا تھا۔

"ایم سوری سر مجھے اپنی بھتیجی کے ساتھ اس کے سکول جانا پڑ گیا تھا، اس لئے لیٹ ہو گئی تھی۔" وہ اپنے سامنے کھڑے تفتیشی آفیسر کو سر جھکائے جواب دے رہی تھی۔

"کم از کم آپ کو مجھ سے پہلے آفس میں موجود ہونا چاہئے کیونکہ آپ میری پی اے ہیں، میں نہیں، اور یہی اس جاب کی ڈیمانڈ ہے انڈرسٹینڈ؟"

"یس سر!" اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

"او کے آپ اب جا سکتی ہیں۔" وہ سیڑھیوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے راستے سے ہٹ گیا تھا اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

"ہیلو مس اروٰی حیات! کیسی ہیں آپ؟" ابھی وہ اپنی سیٹ پہ آ کر بیٹھی ہی تھی کہ کہیں سے احمر انصاری ٹپک پڑا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں میں۔" وہ انتہائی لاپروائی سے کہتی اپنی ٹیبل کے دراز کا لاک کھول کر ضروری فائلز نکالنے لگی۔

"صبح ہی صبح باس نے اچھا نہیں کیا، کم از کم آپ کو اندر تو آنے دیتے، وہیں سیڑھیوں پہ ہی کلاس لینا شروع کر دی۔" احمر انصاری ہمدردی جتا رہا تھا۔ لیکن اروٰی ایسی کسی بھی ہمدردی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، وہ ایک باشعور اور سمجھ دار لڑکی تھی، وہ ہمیشہ وہی کرتی تھی جو اس کے لئے فائدہ مند ہوتا تھا، جو اس کے لئے نہ سہی، لیکن اس کے گھر والوں کے لئے اچھا ہوتا تھا۔ اور جو اس کے دل و دماغ کو مناسب لگتا تھا۔

"غلطی میری ہی تھی، میں لیٹ آئی تھی، حالانکہ مجھے آفس رولز کی خبر بھی تھی، پھر بھی یہ کوتاہی کر بیٹھی اور سر کا حق بنتا ہے کہ وہ اپنے ورکرز کی غلطی ان کی کوتاہی پہ انہیں ڈانٹ سکیں،

کیونکہ وہ ہمیں ''اس وقت'' کا پیسہ دیتے ہیں، وقت کے زیاں پہ نقصان انہی کا ہوتا ہے ہمارا نہیں۔'' اروی نے ایک مضبوط سی دلیل دے کر احمر انصاری کی بولتی بند کر دی تھی جو اس آفس میں جاب کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے شوق کی تکمیل کرنے کے لئے آتا تھا، وہ کافی اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور عارفین شیرازی کے جاننے والوں میں سے تھا، انہی کی سفارش پہ اس نے اسے جاب دے رکھی تھی، ورنہ احمر انصاری کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔

''اوہ ایم سوری! میں بھول گیا تھا کہ آپ ایک سمجھ دار خاتون ہیں، آپ ہر ایک کا زاویہ نظر سمجھتی ہیں سوائے......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی، جس پہ اروی نے سر اٹھا کر جن نظروں سے دیکھا تھا وہ گڑبڑا کر وہاں سے اٹھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

''ویسے مس اروی حیات انسان کو اتنا روڈ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ دو منٹ کسی سے بات بھی نہ کرے۔'' احمر انصاری کی بات پہ وہ کھول اٹھی تھی۔

''مسٹر احمر انصاری یہ وقت باتوں کا نہیں کام کا ہوتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کام کے علاوہ کچھ نہیں جانتیں، آپ کے پاس کام کے لئے وقت ہے، مگر اپنے آس پاس بکھرے انسانوں کے لئے ذرا سا بھی ٹائم نہیں۔'' احمر انصاری بے حد سنجیدہ لہجے میں بول رہا تھا۔

''میرے پاس اس لئے کسی اور کام کے لئے وقت نہیں ہوتا، کیونکہ میں آپ کی طرح شوقیہ جاب نہیں کرتی، یہ جاب، یہ کام میری ضرورت ہیں، مجھے تنخواہ ملتی ہے، وقت کی پابندی کرنا اور آفس کے رولز کے مطابق چلنا میری مجبوری ہے، کیونکہ میں اگر ٹھیک سے کام نہیں کروں گی تو مجھے تنخواہ نہیں ملے گی اور تنخواہ نہ ملی تو میری مجبوریاں حل نہیں ہوں گی، اس لئے میں چاہتی ہوں کہ کوئی بھی میری زندگی اور میری جاب ٹائمنگ میں مداخلت نہ کرے۔'' اروی کا لہجہ بے انتہا سخت تھا، وہ حد سے زیادہ اموشنل ہو گئی تھی، اسے بار بار لوگوں کا اس کی کمٹی ہوئی ذات کو کریدنا اور بکھیرنا بہت برا لگتا تھا، وہ چڑ جاتی تھی، احمر انصاری پل بھر کے لئے کچھ کہہ ہی نہ سکا تھا، کیونکہ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی، شوقیہ جاب کرنے اور مجبوری کے تحت کام کرنے میں بڑا فرق تھا۔ احمر انصاری کام نہ بھی کرتا تو اس کی صحت پہ کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، وہ جاب سے ہاتھ دھو کر بھی ریلیکس رہتا جبکہ اروی جاب سے ہاتھ دھو بیٹھتی تو یقیناً اس کے گھر والوں کو فاقے کرنا پڑ جاتے......اسی لئے اس کام کی فکر اور وقت کی قدر کرنا پڑتی تھی۔

''ایم سوری مس اروی، میں اس خیال سے ہرگز نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ آپ کو سب سے الگ تھلگ دیکھتا ہوں تو دل میں بے اختیار یہ خواہش ابھرتی ہے کہ آپ بھی سب کے ساتھ ہنسیں بولیں، سب کے ساتھ مل کر بیٹھیں، انجوائے کریں اور یہ اداسی اور تنہائی کا حصار توڑ دیں۔''

''پلیز احمر صاحب میں اس وقت کسی بھی طویل بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔'' اس نے احمر انصاری کی بات درمیان میں ہی کاٹ کر اپنی بات واضح کی تھی، جس کو سمجھتے ہوئے وہ سر ہلا کر خاموشی سے پلٹ کر باہر نکل گیا تھا اور وہ کوئی بھی بات خود پہ طاری کئے بنا فوراً سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ اور شام پانچ بجے آفس سے سیلری لے کر نکلی تو بھابی کی تھمائی ہوئی لسٹ دیکھی تھی جن پہ کچھ دوائیاں اور کچھ نائٹ کریمز تھیں، جو وہ اپنے چہرے کو تر و تازہ رکھنے کے لئے رات سونے سے پہلے استعمال کرتی تھیں۔ اس نے گھر کی سمت رخ کرنے کی بجائے مارکیٹ کی سمت رخ کیا تھا، بھابی کی مطلوبہ اشیاء لینے کے بعد بھائی کے لئے فروٹ لیا۔ جوس، بسکٹ اور چاکلیٹ سونیا کے لئے، لئے تھے، سارہ کی چپل نہیں تھی اس کے لئے چپل پسند کی اور بھائی کی پسندیدہ ڈش بنانے کے لئے قیمہ بھی بنوالیا تھا، ذہن میں جو ضروری کام تھے وہ نپٹا لئے تھے، البتہ باقی رقم سے ابھی بجلی، گیس اور سونیا کی فیس کے بل بھی جمع کروانا تھے، انہی کا حساب کتاب کرتی سارا سامان اٹھائے وہ کسی ٹیکسی یا رکشا کے انتظار میں سڑک پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے، شام کا سیاہ آنچل مزید سیاہ رنگ میں رنگتا جا رہا تھا اور سورج کا سنہری جسم افق کی گود میں چھپ کر گہری نیند لینے کا تمنائی ہو رہا تھا اور اس کی یہ تمنا ماحول میں عجیب سی افسردگی کا رس گھول رہی تھی، اداسی پوری فضا میں رچی تھی۔ لوگ پنچھیوں کی طرح اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے، سڑک کا کشادہ سینہ گاڑیوں کے ٹائروں سے دھڑک رہا تھا۔ ہر ایک کو سب سے پہلے آگے نکلنے کی اور اپنے گھر جانے کی جلدی تھی، کئی رنگین، شوخ مزاج رومینٹک مرد جاتے جاتے سگنل کے قریب کھڑے بچے سے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لئے پھولوں کے گجرے بھی لیتے جا رہے تھے اور وہ بچہ مسکراتے ہوئے خوشی خوشی پھول بیچ رہا تھا، صرف اس احساس سے کہ آج وہ بھی اچھی کمائی کر کے گھر جائے گا، اس کے گھر والوں کی ضرورت بھی پوری ہو گی اور اس پھول بیچنے والے بچے کی خوشی دیکھ کر اروی کے دل میں اک گہری ہوک اٹھی تھی اور جسم کا رواں کھڑا ہو گیا تھا، صرف اتنی ہی سوچ سے کہ ''گھر والوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنا آپ بھی ''بیچ'' دیتا

ہے، اپنا جسم، اپنے احساسات اور اپنے جذبات بھی پیسوں میں تول دیتا ہے، کبھی کبھی اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اور کبھی کبھی گھر والوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے...... اور وہ بچہ تو محض پھول ہی بیچ رہا تھا۔" اروی اس بات کو سوچتے ہوئے کانپ اٹھی تھی، اس کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، دل بے انتہا گھبرایا تھا اور اپنی غیر ہوتی حالت کو سنبھالتی وہ قریب رکنے والی گاڑی سے اچانک ڈر کے پیچھے ہٹی تھی۔

"آؤ میں ڈراپ کر دیتا ہوں...... کافی دیر ہو چکی ہے۔" عارفین کی بھاری آواز کافی قریب سے ابھری تھی، وہ اپنی سوچ اور موجودہ ماحول سے چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئی تھی، وہ گاڑی کا شیشہ فولڈ کر رہا تھا۔

"نو تھینکس سر میں چلی جاؤں گی۔" اس نے بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

"ٹائم بہت ہو چکا ہے اور اس اسٹاپ پہ رش بھی بہت ہے، تمہیں دیر ہو جائے گی۔" عارفین نے اصرار کیا تھا، وہ چند لمحے ہی سہی اسے اپنے پاس اپنے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔

"ایم سوری سر، میں عارضی سہارے نہیں اپنانا چاہتی، اللہ حافظ......" وہ کہہ کر اس طرف بڑھ گئی جس طرف سے مخصوص ہارن دیتی لوگوں سے کھچا کھچ بھری بس آ رہی تھی اور پھر عارفین کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس پر ہجوم بس اور دھکم پیل میں سوار ہو گئی تھی، عارفین کا خون غصے اور اذیت کے احساس سے جل کر سیاہ ہو گیا تھا اس نے تلملا کر اسٹیئرنگ پہ مکا دے مارا تھا۔

"میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ سب آزاد ہو گئے اور...... میں...... میں قید میں آ گیا؟" بے بسی نے جیسے اس کے غصے، اس کی سوچ کو مفلوج کر ڈالا تھا۔ گھر آ کر ہمیشہ کی طرح وہ تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پہ ڈھے گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس اذیت، اس بے بسی کو دل کی دیواروں پہ نقش ہوتا محسوس کرتا اچانک قریب ہی سے حانی کے رونے کی آواز سنائی دی تھی اور وہ ساری تھکن اور ساری کوفت بھلا کر فوراً سیدھا ہوا تھا۔

"ارے...... نئیں...... نئیں یار رونا نئیں...... شاباش نئیں رونا۔" اس نے فوراً کاٹ میں سوئے حانی کو اٹھا لیا تھا، وہ بیدار ہونے کے بعد رونے کا اسٹارٹ لے چکا تھا اور اسے چپ کروانا بے حد مشکل کام تھا، مگر آج وہ باپ کی صورت دیکھ کر خود بخود ہی خاموش ہو گیا تھا، چھ ماہ کا حانی عارفین شیرازی کے شب و روز کا مرکز تھا، وہ اپنے بیٹے کی ذرا سی تکلیف پہ تڑپ اٹھتا

تھا، خود تھکن ہونے کے باوجود وہ اس کی ہر چیز کا دھیان رکھتا تھا، اس کی بھرپور نیند اس کے صاف ستھرے کپڑے اس کے فیڈر اور نپل کی صفائی، اس کے پیمپرز اور نیپی...... وغیرہ بھی وہ ملازمہ سے پوری توجہ سے کرواتا تھا، تاکہ وہ کسی بھی چیز سے ڈسٹرب نہ ہو...... کبھی جو حانی آفس سے واپسی پہ روتا ہوا ملتا تو پھر عارفین کا سارا غصہ زوئلہ پہ ہوتا تھا یا پھر اپنی ماں رابعہ شیرازی ...... مگر زوئلہ کو رابعہ شیرازی کی...... سپورٹ حاصل تھی، اسی لئے وہ عارفین کے غصے کو کافی لائٹ لیتی تھی، اسے حانی کی بالکل پرواہ نہیں تھی، البتہ کبھی کبھار اگر وہ موڈ میں ہوتی تو خوب پیار محبت کا منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ آج تک حانی کو باپ کی محبت ہی میسر آئی تھی، وہ چھ ماہ کا معصوم بچہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی ماں کے وجود اور ماں کی محبت سے محروم تھا۔ اور اسی چیز پہ عارفین کا خون پہروں جلتا تھا اور اپنی بے بسی پہ وہ اکثر بپھر بھی جاتا تھا، مگر ماں کے ساتھ بدمزگی پیدا کرنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کئی بار اپنے آپ کو انتہائی قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا، حانی کی پیدائش سے پہلے وہ اتنا بے بس نہیں تھا جتنا اب ہو گیا تھا اور نہ ہی اسے اس طرح جلنے کڑھنے کی عادت تھی، جیسے اب ہو چکی تھی...... لیکن پھر بھی گزارا تو کرنا ہی تھا۔

"عذرا حانی کا فیڈر لے کر آؤ اسے بھوک لگی ہے۔" عارفین نے ملازمہ کو آواز دی تھی، آج بی بی جان واپس گاؤں جا چکی تھیں اور بابا جان بھی ان کے ساتھ ہی گئے تھے، لیکن ان کی آمد اکثر و بیشتر ہوتی رہتی تھی، پہلے بی بی جان صرف ڈاکٹر سے چیک اپ کے لئے شہر آتی تھیں، لیکن اب وہ حانی سے ملنے کے لئے بھی آ جاتی تھیں۔

"زوئلہ کہاں ہے؟" عذرا سے حانی کا فیڈر لے کر وہ اپنی بیگم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"جی وہ اوپر بیڈروم میں آرام کر رہی ہیں۔" عذرا نے آہستگی سے بتایا تھا۔

"اس وقت وہ گھر پہ ہے؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"جی رات کو انہوں نے بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ کسی شو میں شرکت کے لئے جانا ہے اس لئے آرام کر رہی ہیں۔" عذرا نے اس کے آرام کا جواز بھی بیان کر دیا تھا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا تھا، گویا اس وقت اس گھر کی بیگمات گھر پہ ہی تھیں...... وہ تھوڑی دیر بعد حانی کو ساتھ لئے اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا۔ جہاں زوئلہ اپنے آرام دہ نائٹ ڈریس میں ملبوس ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے ہاتھوں پہ کلینزنگ ملک سے مساج کرتی نظر آئی تھی۔

"ہائے عارفین! آپ کب آئے آفس سے؟" زوئلہ اسے دیکھ کر دور سے ہی ہاتھ ہلا

کر چکی تھی۔

''تم میرے آنے جانے کی ٹائمنگ سے اچھی طرح واقف ہو۔'' عارفین کا لہجہ سرد تھا۔

''کبھی کبھی نجانے کیوں'' آپ لیٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے پوچھ رہی تھی۔''

زوئلہ کا لہجہ البتہ بہت سے معنی لئے ہوئے تھا، عارفین کے وجود میں غصے کی ایک تیز لہر اُٹھی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا دروازے پہ دستک دے کر رابعہ شیرازی اندر داخل ہوئی تھیں۔

''زوئلہ بیٹا تم کتنے بجے گھر سے نکل رہی ہو؟'' وہ زوئلہ کی طرف متوجہ تھیں، عارفین حانی کو بیڈ پہ لٹا کر اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔

''ٹھیک آٹھ بجے نکلوں گی ہال میں پہنچتے ہوئے نو، ساڑھے نو بج جائیں گے اور شو دس بجے شروع ہو گا۔'' وہ دونوں آپس میں ٹائم مقرر کر رہی تھیں اور عارفین ان کو اگنور کئے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

''او کے ٹھیک ہے پھر میں بھی تب تک تیار ہو جاتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے مڑیں اور عارفین کو حانی کی طرف متوجہ دیکھ کر ٹھہر گئی تھیں۔

''بہت پیار ہے تمہیں اپنے بیٹے سے؟'' ان کا انداز استہزائیہ تھا، وہ ضبط کر گیا تھا۔

''اولاد جانوروں کو بھی بہت پیاری ہوتی ہے مما جان میں تو پھر ایک انسان ہوں۔'' اس نے پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا، وہ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا طنز با آسانی دیکھ چکی تھیں۔

''لیکن حد سے زیادہ پیار ہمیشہ بگاڑ پیدا کرتا ہے، چاہے کسی سے بھی ہو.....'' انہوں نے اپنی بے کار سی منطق پیش کی تھی۔

''اگر چھ ماہ کا بچہ میرے پیار سے بگڑ سکتا ہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ میرے پیار سے اس کا بگڑ جانا بھی میرے لئے خوشی کا باعث ہو گا، میں اپنے بیٹے کو اپنے باپ سے محروم نہیں کر سکتا۔''

''اونہہ! یہ وہی بچہ ہے عارفین جس کے پیدا ہونے پہ تمہیں اختلاف تھا، تم کو اس کے ذکر پہ بھی اعتراض ہوتا تھا، تم انکاری تھے اس سے، لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اب..... اب اتنی جان کیوں چھڑکتے ہو؟ کیا وجہ ہے اتنے پیار کی؟'' انہوں نے جیسے اپنا طنز آزمایا تھا۔

''اختلاف مجھے اس کے وجود سے نہیں آپ کے کرتوت.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا، اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اور لب سختی سے بھینچ رکھے تھے۔

''اوہ کم آن مام! آپ پلیز کن باتوں میں پڑ گئی ہیں، جلدی سے تیار ہو جائیں میں ابھی آ رہی ہوں۔'' زوئلہ نے ماں، بیٹے کے بیچ آ کر بات کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ رابعہ شیرازی عارفین کی ادھوری بات کا زہر پیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں، اس وقت سچ مچ ان کے پاس جھگڑا فساد کرنے کا ٹائم نہیں تھا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ بھی ہر بات پہ غصہ کرنے لگے ہیں آج کل، پلیز کول ڈاؤن.....'' زوئلہ نے عارفین کا بازو پکڑ کر اسے بیڈ پہ بٹھایا تھا۔ اور عارفین نے نفرت سے زوئلہ کو دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا تھا۔

''بات انہوں نے شروع کی تھی میں نے نہیں۔'' وہ غضب ناک ہوا تھا۔

''تو اس میں اتنا غصہ کرنے والی کون سی بات ہے، وہ مما ہیں ہماری، کیا وہ ہم سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتیں؟'' زوئلہ کو رابعہ شیرازی سے محبت کا اُبال اٹھا تھا۔

''ہرگز نہیں! وہ مجھ سے کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتیں، انہوں نے میرے ساتھ میرے جذبات کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے اس کے بعد کچھ بھی کہنے سننے کی گنجائش نہیں نکلتی، میں جو کچھ ان کے لئے کر چکا ہوں وہی بہت ہے، مزید کوئی بھی پیار محبت نہیں جتا سکتا ان سے، وہ ماں نہیں ایک مفاد پرست عورت ہیں، انہوں نے ہمیشہ میری ذات کو کیش کیا ہے، بلکہ انہوں نے تو میری اولاد کو بھی نہیں بخشا۔'' وہ اس وقت خاصا زہر خند ہو رہا تھا، زوئلہ نے کچھ کہنا چاہا تھا، مگر پھر خاموش ہو کر اپنا دامن بچا لیا تھا، وہ مزید کچھ کہہ کر اس کے غصے کو ہوا نہیں دے سکتی تھی، ٹائم کافی کم تھا اس کے پاس اور ابھی اس نے تیار بھی ہونا تھا، وہ چپکے سے اُٹھ کر واش روم میں گھس گئی تھی۔

❁.....❁.....❁

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' مغرب کی نماز ادا کر کے وہ کمرے سے باہر نکلی تو بہروز بھائی کو صحن میں بیٹھے دیکھ کر قریب آ گئی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے بیٹا بہت بہتر ہوں، تم سناؤ کام زیادہ تو نہیں ہوتا؟'' وہ بہت ہی پُر شفقت سے لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ چکے تھے۔

''نہیں کام تو روزانہ ہی معمول کے مطابق ہوتا ہے اور ویسے بھی اتنے سے کام سے بھلا تھکن کیسی؟'' اروی ان کی تسلی کے لئے مسکرائی تھی، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہ اکثر اس کے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں، انہیں یہی فکر ہوتی تھی کہ وہ اکیلی نازک سی لڑکی اس گھر کا بوجھ

اٹھاتے اٹھاتے تھک جائے گی، آج کل کے مہنگائی کے دور میں مرد گھروں کا بوجھ اٹھاتے
ہوئے ہار جاتے تھے، وہ تو پھر نازک اندام لڑکی تھی، جس کا جسم بھی نازک تھا اور جذبات بھی
نازک تھے، بس حوصلہ اور ہمت مضبوط تھی۔

"بیٹا تھکن بھی ہو ہی جاتی ہے، تمہاری جو عمر سہیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور خوشگوار خواب
دیکھنے کی تھی وہ تم نے میری بیماری کا علاج کرنے اور گھر کا بوجھ اٹھانے میں لگا رکھی ہے، اپنا آپ بھلا
کر سب کا خیال رکھتی ہو یہ صرف تمہارا حوصلہ اور ہمت ہے، ورنہ ایسا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں
جب کام کرتا تھا تو واپسی پہ اتنا تھک جاتا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر ٹھیک سے بات بھی
نہیں کر پاتا تھا، بس یہی کوشش ہوتی تھی کہ تھوڑا آرام کر لوں۔ مگر تمہیں میں نے آج تک ایسا
کرتے نہیں دیکھا، تم سب کو ان کے حصے کا ٹائم دیتی ہو، چاہے وہ سونیا اور عمر ہو، چاہے امی جان یا پھر
میں خود......" وہ آج کافی باریک بینی سے اروی کی خوبیاں جانچ رہے تھے، اروی کا سر جھک گیا تھا۔

"بھائی میں دراصل یہ چاہتی ہوں کہ گھر میں کوئی یہ محسوس نہ کرے کہ آپ بیمار ہیں،
میں سب کو یہ احساس دلانا چاہتی ہوں کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں، آپ کی موجودگی، آپ کی صحت،
آپ کی تسلی میرے لئے بہت اہم ہیں۔" وہ ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کچھ روہانسی ہو گئی تھی۔

"بیٹا میں مر بھی جاؤں تو تمہارا یہ احسان نہیں اتار سکتا۔" وہ مشکور ہونے لگے تھے۔

"بھائی پلیز! آپ ایسا کہہ کر مجھے میری ہی نظروں میں بے قدر اور بے وقعت کیوں
کر رہے ہیں؟ اگر آپ کی نظروں میں میری کوئی اہمیت ہے تو اسے احسان کے لفظ استعمال کر کے
ختم نہ کیا کریں۔ اور میں نے کوئی پہاڑ نہیں کھودا، جس پہ آپ ہمیشہ شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ کر
دیتے ہیں اور ویسے بھی یہ گھر جتنا آپ کا ہے اتنا میرا بھی ہے، میرا اتنا ہی حق بنتا ہے جتنا آپ کا
تھا۔" اروی نے ان کے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور انہیں بھرپور تسلی دے رہی تھی۔

"بے شک ہزاروں لڑکیاں ہیں، مگر بیٹا میرے لئے تم تو اکیلی ہی ہو نا، جس نے
میرے لئے اتنی جدوجہد کی ہے، اتنی قربانی دی ہے۔"

"قربانی؟" اروی نے بُری طرح چونک کر بہروز بھائی کو دیکھا تھا، ان کے چہرے
پہ اروی کے لئے محبت ہی محبت تھی اور ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے وہ لفظ "قربانی"
مطلب اخذ کرتی۔

"اپنی آنکھوں کی نیندیں، اپنے خواب، اپنا آرام، اپنا سکھ چین اپنے آپ کی پروا

سب کچھ چھوڑ دینا، وہ بھی کسی اپنے کی خاطر...... قربانی ہی تو ہے بیٹا؟ اور اس سے بڑی قربانی
کیا ہو گی بھلا؟" بہروز بھائی بہت پژمردہ ہو رہے تھے۔ "آپ کو کیا پتہ بھائی میں نے قربانی کی
کون سی حد پار کی ہے؟ میں نے کسی قیامت کی قربانی دی ہے، آپ کو کیا خبر؟" یہ سوچ، یہ
احساس ذہن میں آتے ہی اروی کی آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی اور دل بیٹھے بیٹھے تپتی ریت پہ
جا گرا تھا، خون کی جگہ رگوں میں اذیت بہنے لگی تھی، اس سے اب وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔

"سارہ ادھر آؤ بھائی کے پاس بیٹھو، میرا شاید فون بج رہا ہے۔" اروی فوراً وہاں سے
اٹھ گئی تھی، اس کے دل میں ہوک اٹھ رہی تھی، دل بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

"آپ کو کیا خبر میرے بھائی، میں آپ کی زندگی کے عوض اپنی روح، اپنا جسم تک بیچ
چکی ہوں، زندہ لاش کا چلتا پھرتا ثبوت ہوں میں، میرا سینہ بغیر دل کے دھڑک رہا ہے، میری
سانسیں بغیر آکسیجن کے چل رہی ہیں، میری آنکھوں کا نور بک چکا ہے...... اور...... اور میں پھر
بھی زندہ لوگوں میں شمار ہوتی ہوں، پھر بھی میں جی رہی ہوں، میری ذات نہ جانے کس موڑ پہ
کھو گئی ہے، مجھ سے میرا اپنا آپ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے
پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ اس کے اندر کچھ تڑپ رہا تھا، کچھ جل رہا تھا، پیاسے صحراؤں سی
تشنگی اس کی ذات کے آنگن میں بکھر چکی تھی، وہ اپنی تڑپ، اپنی جلن، اپنی تشنہ لبی کا اظہار
کرنے سے قاصر تھی، بے بس تھی، اپنا دکھوں سے تار تار آنچل کسی کو نہیں دکھا سکتی تھی، کسی کے
سامنے اپنی قسمت کا رونا نہیں رو سکتی تھی، وہ ایسی اذیت کے جال میں جکڑی تھی جہاں سے رہائی
کا کوئی امکان ہی نہیں تھا اور وہ اس جال میں تنہا بے بسی سے پھڑ پھڑاتی رہ جاتی تھی، سب سے
چھپ کر روتی تھی اور ساتھ یہ بھی کوشش کرتی تھی کہ کوئی بھی اس کے آنسو نہ دیکھ پائے...... اگر
کوئی ہمدردی سے رونے کی وجہ پوچھ لیتا تو یقیناً وہ خود پہ ضبط کا پہرہ نہیں بٹھا سکتی تھی...... اب
بھی وہ اکیلی رو رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔

❁......❁......❁

حانی کے لئے خشک دودھ کے ڈبے "پیمپرز، نئے فیڈر، نئے کپڑے، ٹشوز کے بنڈل
اور بچوں کی ضرورت کی اور بھی دیگر اشیاء وغیرہ لے کر وہ سٹور سے نکل کر اپنی گاڑی کی سمت
بڑھ رہا تھا، جب قدم ٹھٹک کے رہ گئے تھے۔ کاٹن کے سادہ سے لائٹ پنک کلر کے سوٹ میں
ملبوس اپنے دھیان میں وہ کسی کا بازو تھامے برابر والے ہسپتال سے نکل رہی تھی...... اس نے ذرا

غور سے پہچاننے کی کوشش کی تو فوراً جان لیا کہ وہ کون ہیں؟

''السلام علیکم!'' اس نے قریب جا کر سلام کیا تھا اور اس کی آواز پہ اروی کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ عارفین شیرازی اس کے روبرو کھڑا تھا، لیکن سلام وہ اس کی امی کو کر رہا تھا۔

''ارے شیرازی صاحب کیسے ہیں آپ؟'' اروی کی امی بھی اسے پہچان گئی تھیں، سلام کا جواب دینے کے بعد اس کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

''اتنی اپنائیت بھی دے رہی ہیں اور ساتھ ایک فاصلہ بھی رکھ رہی ہیں، میں کیا سمجھوں اس کو؟'' عارفین نے اچٹتی نظر سے اروی کے چہرے پہ پھیلی ناگواری پل میں بھانپ لی تھی۔

''آپ کا کیا مطلب ہے بیٹا؟'' امی نے ناسمجھی سے استفسار کیا تھا۔

''میرا مطلب بہت واضح ہے، آپ پہلے بھی ایک ملاقات میں مجھے بیٹا کہہ چکی ہیں، اب بھی بیٹا کہہ رہی ہیں، جبکہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ماؤں کے لئے بیٹے ''آپ'' نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی مائیں ''شیرازی صاحب'' کہہ کر بلاتی ہیں ماؤں کے لئے بیٹے صرف بیٹے ہوتے ہیں۔'' عارفین کی وضاحت پر اروی کی امی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے اسے دیکھ رہی تھیں، لیکن اروی کی پیشانی پہ شکنوں کا اضافہ ہو گیا تھا، اسے عارفین شیرازی کا یہ لگاؤ، یہ انسیت بالکل اچھے نہیں لگ رہے تھے، اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

''امی چلیں؟'' اس نے اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں؟'' عارفین نے امی کو پیشکش کی۔

''نہیں ہم چلے جائیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' اروی نے اسے انکار کر دیا تھا، حالانکہ وہ امی کو مخاطب کر رہا تھا۔

''اس میں پریشانی والی کونسی بات ہے؟ ماں جی آپ ٹھہریں، میں گاڑی نکالتا ہوں۔'' عارفین ان کو مزید انکار کا موقع دیئے بنا فوراً پلٹ گیا تھا، لیکن امی اور اروی کی نگاہیں بیک وقت عارفین کے ہاتھوں میں پکڑے...... بیگ سے ٹکرائیں، جن میں بچگانہ استعمال اور ضروریات کی چیزیں تھیں جن کے بارے میں امی نے گاڑی میں بیٹھتے ہی استفسار کر دیا تھا۔

''یہ چیزیں کس کے لئے ہیں بیٹا؟ کہیں چوری چھپے باپ تو نہیں بن بیٹھے اور ہمیں بتایا بھی نہیں؟'' ان کا سوال اروی کے دل پہ اور عارفین کے اعصاب پہ اک برچھی سی چلا گیا تھا، وہ ان کو جواب دینے کے لئے الفاظ تلاشتا رہ گیا تھا۔ درحقیقت وہ اروی کے سامنے اس

سوال کا جواب دینے کی ہمت اپنے اندر...... مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔

''ارے بیٹا کہاں کھو گئے ہو؟''

''جی کہیں نہیں! آپ کو شاید پتہ نہیں چلا چھ ماہ پہلے ہمیں اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا تھا، اب تو ماشاء اللہ سات ماہ کا ہونے والا ہے، اس کی شاپنگ اور ضروریات کی چند چیزیں لینے کے لئے آیا ہوا تھا، ہر سنڈے کو اسی کے ساتھ بزی رہتا ہوں۔'' عارفین نے بہت ہمت کر کے کہہ ہی ڈالا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھتی اروی کے چہرے پہ گہرے کرب کا سایہ لہرا کے گزر گیا تھا جو امی سے تو پوشیدہ ہی رہا، مگر بیک ویو مرر سے دیکھتے عارفین سے مخفی نہیں رہ سکا تھا۔

''اچھا بیٹا یہ تو اللہ نے بڑا ہی کرم کیا ہے آپ لوگوں پہ، میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو آپ سب کو، مجھے تو سچ پتہ ہی نہیں چلا اور اس پگلی اروی نے بھی نہیں بتایا ورنہ میں مٹھائی لے کر ضرور آتی، آپ لوگوں کے بہت احسان ہیں ہم پہ، خاص طور پر زونلہ بی بی کے اور رابعہ بہن کے۔'' امی اور عارفین کی باتیں اروی کو بے حد ناگوار گزر رہی تھیں اور پھر عارفین موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر امی کی طبیعت اور بہروز بھائی کی صحت کے متعلق باتیں کرنے لگا تھا، اپنے گھر کے قریب آ کر گاڑی سے اترتے ہوئے اروی نے گہری نظروں سے عارفین شیرازی کے ''بیٹے'' کے شاپنگ بیگز دیکھے تھے، اس کی نظروں کا زخمی پن وہ با آسانی محسوس کر چکا تھا، جبھی اللہ حافظ کہتے ہی فوراً گاڑی ریورس کر کے پلٹ کے چلا گیا تھا۔

آفس سے واپسی پہ گھر میں قدم رکھا تو خلاف معمول خاصی چہل پہل کا احساس ہوا تھا اور پھر برآمدے میں کھیلتے سونیا اور گڈو کو دیکھ کر اس چہل پہل کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی، یعنی یسری آپی تشریف لائی ہوئی تھیں۔ اروی اپنے اور سارہ کے مشترکہ کمرے میں گئی۔ بیگ رکھا، چادر اتار کر دوپٹہ اوڑھا اور پھر سادہ چپل پہنتی ہوئی بہروز بھائی کے کمرے میں آ گئی جہاں یسری آپی اپنے دو بچوں کے ساتھ موجود تھیں، ان کا تیسرا بچہ گڈو باہر کھیل رہا تھا۔

''السلام علیکم آپی، کیسی ہیں؟'' اروی بہت عرصہ بعد بہن سے مل رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے، تم سناؤ گڑیا کیسی ہو؟'' یسری آپی اٹھ کر اروی سے گلے ملی تھیں۔

’’میں بھی ٹھیک ہوں، عظیم بھائی کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟‘‘ وہ یسریٰ کے شوہر کا پوچھ رہی تھی۔ ’’وہی چھوڑنے آئے تھے دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھا کر گئے ہیں۔ تمہارا بھی پوچھ رہے تھے امی سے۔‘‘ یسریٰ نے مسکرا کر بتایا تھا۔

’’لیکن اتنی جلدی چلے کیوں گئے وہ بھی آج رات رک جاتے؟‘‘

’’انہوں نے کسی ضروری کام سے لاہور جانا تھا، اس لئے جلدی چلے گئے، پرسوں آجائیں گے، تم سناؤ بہت کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی ہو؟‘‘ یسریٰ آپی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بہت محبت سے پوچھا تھا...... اروی بے ساختہ چپ سی ہوگئی تھی کہ میرے چہرے، میرے وجود پہ نہ جانے کیسی تھکن ہے جو ہر ایک کو پہلی نظر میں ہی نظر آجاتی ہے اور وہ اس تھکن کو باوجود کوشش کے چھپا نہیں پا رہی اور نہ ہی لفظوں میں بیان کر پا رہی ہو...... جامد چپ اور گہری تنہائی کے عالم میں وہ اپنی ہی ذات کی غلام گردشوں میں چکرا رہی تھی جہاں سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کیفیت سے نکالنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے بستر پہ لیٹی ہی تھی کہ وہ بھی اس کے پاس ہی آبیٹھیں۔ سارہ اپنے نوٹس وغیرہ بنانے میں مصروف تھی اور امی بھائی اور بھابی کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی یہ روٹین تب سے چلی آرہی تھی جب سے بہروز بھائی بیمار ہوئے تھے، وہ رات کو کچھ دیر ان کے پاس ضرور بیٹھتی تھی۔

’’اروی تم جانتی ہو مجھے آج بہروز بھائی نے بلایا ہے؟‘‘ انہوں نے ہلکی سی تمہید باندھی۔

’’کیوں خیریت ہے؟‘‘ اروی کو پریشانی ہوئی تھی۔

’’ہاں خیریت ہی ہے...... دراصل وہ چاہتے ہیں کہ تم اب اپنے گھر کی ہو جاؤ، کیونکہ شادی کے لئے یہی عمر موزوں ہوتی ہے۔‘‘ یسریٰ آپی نے اس کے استفسار پہ مزید کوئی تمہید باندھے بغیر سیدھی سیدھی بات کہہ ڈالی تھی، اور ان کی بات پہ اروی یک دم سناٹے میں آگئی تھی، اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی، دل و دماغ یک دم منہ کے بل گرے تھے اور رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار ایک جھٹکے سے رکی اور نبض بے دم ہو کر رہ گئی۔

’’شادی؟‘‘ وہ زیر لب بڑبڑائی تھی یہ لفظ اسے بچھو کی طرح زہریلا لگا تھا۔

’’ہاں بہروز بھائی کہتے ہیں کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں اور ایک دو لوگوں کو کام کے لئے بھی کہہ چکے ہیں، یقیناً ان کو کام مل جائے گا تب تک تمہاری بات طے ہو جائے گی اور بعد

میں شادی کی تیاری شروع کر لیں گے؟‘‘

’’لیکن آپی! ابھی تو وہ پوری طرح سے ٹھیک بھی نہیں ہوئے، وہ اتنی جلدی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اور ویسے بھی جب اتنا مشکل زمانہ ہم گزار چکے ہیں، تھوڑا وقت اور سہی، یقیناً اللہ بہتر حل نکالے گا۔ اتنا عرصہ علاج کروانے اور احتیاط کرنے کے بعد اب ہم اینڈ میں آکر ایسی جلد بازی کیوں کریں؟ ہماری زندگی کے سب کاموں سے زیادہ بھائی کی زندگی اور صحت ہمارے لئے بہت زیادہ اہم اور ضروری ہیں یسریٰ آپی۔‘‘ اروی بات کرتے ہوئے بمشکل اپنے اعصاب کنٹرول کر پائی تھی، ورنہ دل و دماغ کی سنگت بہت بے ربط ہو رہی تھی۔

’’تمہاری پریشانی بھی بالکل بجا ہے اروی، لیکن بہروز بھائی اپنی جگہ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں، آج کل کے دور میں اچھے پرپوزل کب ملتے ہیں اور ویسے بھی جرار تمہیں پسند کرتا ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ جرار کا نام سن کر وہ حیرت سے ہونقچکا رہ گئی تھی۔

’’ہاں یہ پرپوزل جرار اور بھابی کی مرضی سے آیا ہے، وہ بھی چاہتی ہیں کہ تم جرار کی دلہن بنو، اور کسی نہ کسی حد تک امی اور بہروز بھائی بھی اس رشتے پہ خوش ہیں، لیکن اس کے باوجود فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے، وہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے، مگر پھر بھی میں چاہوں گی کہ تم اس نہج پر سوچتے ہوئے سمجھداری سے کام لو، کیونکہ آج جو اچھے پرپوزل تمہارے نہ چاہنے کے باوجود آرہے ہیں، کل کو وقت ہاتھوں سے پھسل گیا تو یہی پرپوزل تمہارے چاہنے پر بھی نہیں آئیں گے......‘‘ یسریٰ آپی اپنے بڑے پن کا پورا پورا ثبوت دے رہی تھیں اور وہ زندگی کے ’’بے بس مقام‘‘ پہ کھڑی اپنے دماغ کو ماؤف ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ یسریٰ آپی فیصلے کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھما کر جا چکی تھیں...... اور وہ اک نئے امتحان کے لئے اپنی ہمتیں مجتمع کرنے لگی تھی، اس نے اپنا آپ آنسوؤں کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا، اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب زندگی کا دائرہ اس پہ مزید تنگ ہوتا جا رہا ہے، اب اس کے سامنے پل صراط ہے اور وہ پہلے ہی قدم پہ جھٹکا کھا کے ’’آگ اور اذیت‘‘ کے گہرے کنویں میں جا گرے گی اور سچ مچ وہ رات بھر اپنے آپ کو اسی کنویں میں تڑپتے ہوئے دیکھتی رہی، جہاں کوئی بھی اس کے کام نہیں آسکتا تھا، جہاں صرف اور صرف اچھے اعمال کا وجود کام کر سکتا تھا۔ لیکن اچھے اعمال کے لئے وہ اپنے گزشتہ حالات پہ نگاہ دوڑاتی تو یقیناً سہم جاتی، دل و دماغ پہ خوف سا طاری ہو جاتا تھا اور اب اپنے آپ کو مزید سزا دینے کے لئے تیار کرنے کا سوچتی...... اک ایسے

گناہ کے لئے جو اس نے کر کے بھی نہیں کیا تھا اور شاید یہی ''کر کے نہ کرنے'' کا دکھ ہی اس کو رات رات بھر رلاتا تھا، وہ اتنی با اعتماد، بہادر لڑکی اپنے ماضی کے سمندر میں اترتی تو بے حد کمزور پڑ جاتی تھی، وہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند ہو جاتی تھی، اسے پھر کچھ یاد نہیں رہتا تھا، آج بھی ایسا ہی ہوا تھا اس کی سوچ اور ماضی کا ساتھ فجر کی اذان کے وقت چھوٹا تھا، مؤذن کی آواز پہ......!

⊛......⊛......⊛

روئی روئی سرخ آنکھیں، سپاٹ چہرہ، سرد انداز، اور حرکتیں بہت نپی تلی سی تھیں جو کسی سنگین طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھیں...... آفس میں میٹنگ ہونے کی وجہ سے عارفین اس طوفان کا ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پا رہا تھا...... ڈیڑھ دو گھنٹے میٹنگ میں گزر گئے تھے، اس کے بعد اس کی کسی سے ملاقات کی اپائنٹمنٹ تھی، پھر لنچ ٹائم میں بھی موقع نہیں مل سکا تھا، مگر اندر ہی اندر اس کا اضطراب اور بے چینی بڑھتی رہی تھی، شام پانچ بجے کے قریب جب وہ سب سے آخری فائل کی تفصیلات لے کر روم میں آئی تو عارفین ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کئے بنا اپنی چیئر دھکیل کر اٹھ گیا تھا اور اروی سے پہلے وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا، لیکن پھر بھی وہ فائل کھول کر اسے کام کی ڈیٹیل بتانے لگی۔

''رشید صاحب کا کہنا ہے کہ کل آپ سائٹ پہ کام کریں گے اور تمام مزدوروں کے ساتھ آپ کو ایک میٹنگ رکھنا ہوگی، کیونکہ جیسا کام پہلے ہوتا تھا چند دنوں سے ویسا کام نہیں ہو رہا ہے...... اور یہ آفریدی برادرز کی مارکیٹ کا نقشہ تیار ہو چکا ہے، اگر آپ چاہیں تو اس میں......''

پلیز! پلیز اروی! میں یہ سب نہیں سننا چاہتا، مجھے وہ بتاؤ جو تمہارے اندر زہر گھول رہا ہے، جس کی اذیت تمہارے چہرے پہ تحریر ہے!'' اس نے جھنجلا کر کہتے ہوئے فائل اس کے ہاتھ سے لے کر دور اچھال دی تھی، اروی کا سر جھک گیا تھا، وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے گہری سانس لے کر رہ گئی تھی، اس نے شاید اپنے اور عارفین کے درمیان فاصلہ رکھنا چاہا، لیکن عارفین نے دونوں ہاتھوں سے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اس کے اتنے مضبوط شکنجے کے باعث وہ اپنی جگہ سے مزید ہلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

''اروی! میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے کوئی درجہ دے کر یا پھر اہم جان کر اپنا مسئلہ شیئر کرو...... میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک انسان ہونے کے ناطے اور انسانیت کے تحت ہی سہی پلیز اپنی پرابلم بتاؤ، اپنا مسئلہ شیئر کرو، کیوں خود پہ اتنے کڑے خول چڑھا رہی ہو؟ کیوں تنہا عذاب جھیل رہی ہو؟'' اس نے اروی کو سختی سے جھنجھوڑ ڈالا تھا اور وہ خود پہ ضبط کے پہرے

بٹھاتے بٹھاتے اپنے ضبط کے تمام بند توڑ بیٹھی تھی اور یہ اس کی بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ اگلے پل عارفین شیرازی کے سینے سے لگی، تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور اس کے اس بے بس و بے خود حرکت پہ عارفین اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا تھا، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اروی حیات کسی چھوٹی سی بات پہ اس قدر حوصلہ ہارنے والی نہیں، مسئلہ یقیناً اس کے اختیار سے باہر تھا...... چند لمحے یونہی گزر گئے، وہ دونوں خاموش تھے...... مگر ان دونوں کی کیفیات بول رہی تھیں...... اروی کے آنسو بول رہے تھے اپنا دکھ، اپنی بے بسی سنا رہے تھے اور عارفین کا دل بول رہا تھا وہ سینے سے لگے اروی کو چپ کرا رہا تھا اور اس کے آنسو اپنے اندر جذب کر رہا تھا، دونوں کی تسلی لینے اور دینے کا انداز بے زبان تھا، مگر پھر بھی بول رہا تھا۔ اروی کی ہچکیوں سے لرزتے جسم اور اک روانی سے بہتے آنسوؤں میں بہت شدت تھی اور کچھ ایسی شدت تھی کہ عارفین اسے روک نہیں پایا تھا...... جب وہ بہت زیادہ رو چکی تو پھر کافی دیر بعد اس کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اسے نرمی سے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔

''کسی نے کچھ کہا ہے؟'' بے حد مدھم اور بھاری آواز سے پوچھا گیا تھا۔

''بہروز...... بہروز بھائی میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' ہچکیوں کے درمیان اس نے عارفین شیرازی پہ بم پھوڑ دیا تھا۔

''میں شادی کے نام سے بھی نفرت کرتی ہوں...... میں...... میں کبھی شادی نہیں کروں گی، میں خودکشی کر لوں گی، مگر شادی نہیں......'' وہ پھر بے ربط الفاظ میں بولتے بولتے رو پڑی تھی اور عارفین بُری طرح چکرا گیا تھا، وہ بڑی مشکل سے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لایا تھا۔

''پلیز اروی! کنٹرول یور سیلف، ایسا کچھ نہیں ہو گا، میں...... میں کچھ حل سوچتا ہوں، پلیز تم اس طرح مت رو۔'' اس نے اپنے سینے میں منہ چھپائے روتی ہوئی اروی کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حلقے کا احساس دلاتے ہوئے جیسے اپنی ذات کی مضبوطی کا یقین دیا تھا، لیکن اروی کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے ہوتے ہوئے اچھے کی امید وہ کبھی نہیں کر سکتی تھی...... اس پہ آج تک جو بھی مشکل وقت آیا تھا اسے جھیلنا پڑا تھا، وہ مشکل وقت کبھی ٹلا نہیں تھا اور اس بار بھی اسے یقین تھا کہ وہ اس مشکل کے گرداب میں ضرور پھنسائی جائے گی۔

''مسٹر عارفین شیرازی آپ یہ بات جانتے ہیں کہ میں کبھی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی...... میں کبھی شادی کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتی...... اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں۔'' وہ عارفین شیرازی کی شرٹ دونوں مٹھیوں میں دبوچے بے حد

جذباتی ہو رہی تھی اور عارفین اس کے شانے سہلاتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر جیسے ہی وہ اس کے پرحدت لمس سے چونکی اسے کرنٹ چھو گیا تھا، وہ یک دم اِک جھٹکے سے اس کے سینے سے الگ ہوئی تھی۔

''اروی؟'' عارفین کو اس کی اسی بے مروتی پہ کافی تکلیف ہوئی تھی، اس نے ہاتھ بڑھا کر اروی کو خود سے قریب کرنا چاہا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے اپنے قریب کرتا، اچانک آفس روم کا دروازہ اک دھماکے سے کھل گیا تھا وہ دونوں چونک گئے تھے، سامنے دہلیز میں کھڑی زوئلہ شیرازی کافی خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھی اور دونوں کو بیک وقت اپنے غضب سے راکھ کر دینا چاہتی تھی، لیکن زوئلہ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اروی اپنے آنسو رگڑتی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

''اونہہ! تو آفس میں آج کل اس طرح گلچھرے اڑائے جا رہے ہیں؟'' اروی کو نخوت سے دیکھتے ہوئے وہ عارفین کے قریب آ گئی تھی۔

''زوئلہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔'' اسے زوئلہ کا شک نہ جانے کیوں بُرا لگا تھا کہ وہ صفائی دینے لگا۔

''جو میں سمجھ رہی ہوں وہ ویسا نہیں ہے تو پھر ''ایسا'' کیوں ہے؟'' زوئلہ نے استہزائیہ انداز میں عارفین کی سفید شرٹ کی سمت اشارہ کیا تھا، جہاں اروی اور عارفین کی تازہ ترین قربت کی تحریر رقم تھی، عارفین نے سر جھکا کر دیکھا تو خاموش ہو گیا تھا، اروی کے آنسو اس کی شرٹ کو زبان دے گئے تھے۔ جب ہی تو زوئلہ، عارفین کے کہے پہ نہیں، شرٹ کے کہے پہ یقین کر رہی تھی۔

''بولیں نا، ایسا کیوں ہے؟ کمرے کی تنہائی میں آپ کی صاف ستھری شرٹ کھڑے کھڑے کیسے بھیگ گئی ہے؟ حالانکہ اے سی بھی آن ہے۔'' زوئلہ چبا کر بولی تھی۔

''میں تمہیں ہر بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' عارفین کا انداز بھی سخت ہو چکا تھا۔

''آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کے پاس میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ آپ ہم سے چوری چھپے اس دو ٹکے کی لڑکی کے ساتھ آفس میں عیاشی کرتے پھر رہے ہیں، اسی لئے اسے نوکری سے نہیں نکالا، اسی لئے مجبوریوں کا بہانہ بنا رکھا ہے اور اسی لئے اس پہ دو حرف لعنت کے نہیں بھیجے۔''

''اسٹاپ اٹ...... جسٹ اسٹاپ اٹ زوئلہ!'' وہ یکدم دھاڑ اٹھا تھا۔

''تم اپنی حد سے بڑھ رہی ہو، آج تک اگر میں نے تمہارے کسی بھی معاملے میں انٹر فیئر نہیں کیا تو تم بھی ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔ تمہیں اپنی حد میں رہنا چاہئے ورنہ میرے سوئے ہوئے اعتراضات بھی بے دار ہو سکتے ہیں۔'' وہ یک دم غصے سے غرا کر بولا تھا لیکن زوئلہ پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے گھر آ کر بھی اس بات کا کافی فساد پھیلایا تھا۔ رابعہ شیرازی بھی زوئلہ کے چاہنے والوں میں سے تھیں۔ انہوں نے بھی توپوں کا رخ عارفین کی سمت موڑا تھا۔

''ابھی تک تمہارا دل نہیں بھرا اس مظلوم، بے چاری، غریب حسینہ سے؟'' رابعہ شیرازی کا لب و لہجہ زوئلہ سے بھی زیادہ ہتک آمیز تھا جس پہ عارفین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''بس بہت ہو گیا یہ فضول کا واویلا۔ آپ لوگوں نے حد کر ڈالی ہے۔ میری خاموشی اور میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں آپ سب۔ لیکن میری بات یاد رکھ لیں کہ آپ نے جو کچھ کرنا تھا، کر لیا۔ اب میری باری ہے۔ اب میں حد کروں گا اور آپ لوگ دیکھیں گے کیونکہ مجھے ایسا کرنے پہ آپ مجبور کر رہی ہیں۔''

وہ غصے سے کہتا پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا تھا اور رابعہ شیرازی خفگی سے زوئلہ کی سمت پلٹی تھیں۔

''کیا ضرورت تھی اسے اتنا غصہ دلانے کی......''

''لیکن مام! وہ اس لڑکی کے ساتھ کمرے میں......'' زوئلہ نے کچھ بولنا چاہا تھا۔

''اگر تم نے اس لڑکی کو عارفین کے ساتھ دیکھ ہی لیا تھا تو در گزر کر جاتیں، کبھی موقع ملتا تو ہم اس لڑکی کا دماغ ٹھکانے لگا دیتے۔ آخر تمہیں پتہ بھی ہے کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے لیکن سویٹ ہارٹ پسند کب تک چل سکتی ہے، کب تک وہ چوری چھپے اس کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے؟ آخر کار لوٹ کے تمہارے پاس ہی آئے گا۔ یہ صرف وقتی جذبات کا اثر ہے جو اسے اس کی قربت سے دور نہیں ہونے دے رہا اور تم جانتی ہو، جذبات کا دریا کتنی جلد اتر جاتا ہے۔'' رابعہ شیرازی نے اپنی لاڈلی چہیتی بھانجی کا کندھا تھپکا تھا اور زوئلہ مطمئن ہو گئی تھی۔

''پھر اب کیا کروں؟'' انداز میں تفکر تھا۔ رابعہ شیرازی بھانجی کے سوال پہ مسکرا دیں۔

''اب اس کے پاس جا کر بہت ''اچھے'' انداز میں سوری کرو اور اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرو۔ اگر وہ سچ مچ غصے میں آ کر کچھ کر بیٹھا تو پرابلم ہو جائے گی۔'' انہوں نے زوئلہ کو مشورہ دیا تھا اور وہ سر ہلا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

''اروی بیٹا...... ادھر آؤ میرے پاس۔'' بہروز بھائی نے رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی اروی کو اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ سارہ کے ساتھ مل کر برتن سمیٹ رہی تھی، بھائی کے بلانے پہ برتن کچن میں چھوڑ کر ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں نا۔'' اروی ان کی طرف سے فوراً ہی پریشان ہو جاتی تھی۔

''ہاں بیٹا! ٹھیک ہوں، اللہ کا بڑا کرم ہے۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کے شکر گزار ہوئے تھے۔

''آپ ہمیشہ اروی آپی کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں، کبھی مجھے بٹھایا آپ نے، کبھی میرا خیال آیا آپ کو؟'' سارہ کچن سے نکلتے ہوئے کافی نروٹھے پن سے بولی تھی اور بہروز بھائی اس اچانک شکوے پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے اور ساتھ ہی اسے بھی قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

''پگلی! کچھ باتیں صرف بڑوں سے کرنے کے لئے ہوتی ہیں، بچوں سے نہیں۔ تم ابھی بچی ہو اور بچی ہی رہو اور اس بچپنے میں فائدہ بھی ہے اور بھلا بھی۔ اور ویسے بھی جو بات میں اروی سے کرنا چاہتا ہوں، وہ تم سے کیسے کر سکتا ہوں؟ تم تو ہو ہی چھوٹی سی بچی۔'' انہوں نے بہت پیار سے کہتے ہوئے سارہ کو بازو کے حصار میں لے کر نرمی اور وضاحت سے سمجھایا تھا۔

''کالج میں پڑھتی ہوں اور ابھی بھی چھوٹی سی بچی ہوں؟'' اس نے خفگی سے کہا تھا اور اروی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''پہلے تم گرما گرم چائے لے کر آؤ نا پھر بات بھی بتاتے ہیں۔'' وہ اس کی شرارت سمجھ چکے تھے۔

''چائے تو میں لے آتی ہوں لیکن آپ کو یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ مجھے اس بات کا پتہ ہے۔'' سارہ معنی خیزی سے کہتے ہوئے اروی کو دیکھنے لگی تھی اور اروی اس کی ذو معنی بات کا مطلب سمجھ کر اپنی جگہ پہ سن سی بیٹھی رہ گئی تھی اور اس کی رنگت بھی پل میں متغیر ہوئی تھی۔

''کیا پتہ ہے بھئی؟ تمہیں کس نے بتایا؟'' بہروز بھائی مسکرا کر بولے تھے۔

''بھابی نے...... وہ کہہ رہی تھیں کہ اروی آپی کی بات جرار بھائی کے ساتھ طے ہونے والی ہے۔ باقی سب تو ٹھیک ہے، بس اروی آپی سے پوچھنا باقی ہے۔'' سارہ نے اروی

کے دل کو لرزا کے رکھ دیا تھا، وہ کچھ بھی دیکھے سنے بنا کھڑی ہو گئی تھی۔

''اروی! کہاں جا رہی ہو، بیٹھو بیٹا۔'' بہروز بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیا تھا لیکن اروی کا جسم برف کی مانند ٹھنڈا پڑ چکا تھا، اس کے لئے مشکل یہ تھی کہ بات کرنے والے بہروز بھائی خود تھے اور باپ اور بھائیوں کے سامنے اپنا اعتماد بحال رکھنا ایک مشرقی لڑکی کے لئے انتہائی مشکل امر تھا۔ چاہے وہ لڑکی بنیادی طور پر کتنی ہی پر اعتماد اور بولڈ کیوں نہ ہو۔

''دیکھو بیٹا! چند دن پہلے یسریٰ نے تم سے بات تو کی ہو گی تم اس بات کے متعلق......''

''بھائی! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' زندگی میں پہلی بار اروی نے بھائی کی بات سنے بغیر اپنی بات کہی تھی۔ اندر سے کچھ برا تو لگا تھا لیکن جو کچھ وہ کہنا چاہ رہے تھے، وہ اس سے بھی زیادہ برا تھا۔ لہٰذا اسے بہانا بنانا پڑا تھا۔ بہروز بھائی بات کرتے کرتے ٹھٹک گئے تھے۔ وہ اروی کے چہرے سے ہی اذیت کے آثار بھانپ گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ حقیقتاً کچھ ڈسٹرب ہے۔ ''ٹھیک ہے بیٹا! تم آرام کرو، بعد میں بات کر لیں گے۔'' بہروز بھائی ہمیشہ اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ ایک باپ کی طرح پیش آتے تھے۔ اروی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی اور بھابی نے تیز نظروں سے اروی کی پشت کو گھورا تھا، انہیں شوہر پہ بھی غصہ آیا تھا جنہوں نے بات کرتے کرتے بھی بات پوری نہیں کی تھی اور معاملہ پھر کسی وقت پہ ٹال دیا تھا جبکہ دوسری طرف جرار زور دیے جا رہا تھا۔

وہ صبح آفس جانے کے لئے تیار ہو کر نیچے آیا تو کافی عجلت میں تھا کیونکہ وہ خانی سے لاڈ پیار کرنے کے چکر میں آفس سے خاصا لیٹ ہو چکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت ناشتے کی ٹیبل پہ زویلہ شیرازی بھی موجود تھی۔ حالانکہ ان کا ناشتہ اس وقت نہیں، دوپہر کو لنچ ٹائم میں ہوتا تھا اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو صبح کے وقت دیکھتے تھے ورنہ اکثر ایک گھر میں رہنے کے باوجود ان لوگوں کی آپس میں ملاقات رات گئے یا پھر فجر سے ذرا پہلے ہوتی تھی، جب دنیا کے تمام ہنگاموں سے تھک ہار کر انہیں اپنے بیڈ رومز کی طلب ستاتی تھی۔

''گڈ مارننگ۔'' زویلہ نے چھوٹتے ہی اسے وش کیا تھا لیکن عارفین نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''صاحب! ناشتہ لگاؤں؟'' ملازمہ پہلے سے الرٹ کھڑی تھی۔

“ہوں۔” وہ آہستگی سے سر ہلا کر اپنے کف لنکس بند کرنے لگا تھا۔

“تم رہنے دو، میں چائے بناتی ہوں۔” زونلہ نے ملازمہ کے ہاتھ سے ٹی پاٹ تھام لیا۔

“عذرا چائے بناؤ۔” عارفین نے سختی سے کہا تو ملازمہ تذبذب میں پڑ گئی تھی جبکہ زونلہ ان دونوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کپ سیٹ کر کے رکھتے ہوئے چائے بنانے لگی تھی۔

“عذرا! میں جو کہہ رہا ہوں، وہ تمہیں سمجھ نہیں آ رہا۔” عارفین کو غصہ آیا تھا۔

“میں چائے بنا تو رہی ہوں آپ کے لیے۔”

“مگر میں ملازموں کے ہاتھ سے چائے پینے کا عادی ہوں۔” وہ ذرا تلخی سے بولا تھا۔

“آج میرے ہاتھ سے پی لیں۔” زونلہ ادا سے بولی تھی۔

“میں ذرا دیر کے لئے اپنی عادت میں خلل نہیں ڈال سکتا۔”

“عارفین! پلیز کیا ہوگیا ہے آپ کو؟” زونلہ کرسی دھکیل کر اٹھی اور اس کے قریب آتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنا چاہا تھا لیکن وہ ناگواری سے پیچھے ہوگیا تھا اور ملازمہ کے سامنے اپنی اس قدر انسلٹ پہ زونلہ کا رنگ بدل گیا تھا۔

“اپنی حد میں رہو زونلہ!” وہ چبا کر بولا تھا۔

“آپ مجھے حد بتا رہے ہیں، آپ کو پتہ تو ہے میاں بیوی میں کوئی حد نہیں ہوتی۔” زونلہ نے اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لئے کہا تھا۔

“جب میاں بیوی کی حدیں جدا ہو جائیں تو خود بخود ان کے درمیان حد بن جاتی ہے اور پھر اس حد میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔” عارفین نے اسے جتایا تھا۔

“عارفین! یہ کس لہجے میں بات کر رہے ہو تم، زونلہ تمہاری بیوی ہے ملازمہ نہیں۔” رابعہ شیرازی اپنے ڈھیلے ڈھالے نائٹ ڈریس میں ملبوس تیکھے لہجے میں کہتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی تھیں۔ گویا وہ بات سن چکی تھیں

“اونہہ..... بیوی..... میں آپ کو اتنا بتا دینا چاہتا ہوں مام کہ آپ کی زونلہ شیرازی اس وقت تک میری بیوی تھی جب تک وہ ”صرف“ میری بیوی تھی۔ آپ مجھے میری بیوی کا احساس دلانا چھوڑ دیں۔ جو جیسا ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔” وہ زونلہ پہ ایک کاٹ دار نظر ڈالتا ہوا اپنا بریف کیس لے کر پلٹ گیا تھا۔

“عارفین......عارفین......” رابعہ شیرازی پکارتی رہ گئیں مگر وہ نہیں رکا تھا اور زونلہ اپنی جگہ

پہ تلملائی ہوئی تھی، اسے رہ رہ کر اروی حیات پہ تاؤ آ رہا تھا جو بیٹھے بٹھائے گلے کا پھندا بن گئی تھی۔

“سر! آج آپ سائٹ کا وزٹ کریں گے، بہت سے ورکرز آپ سے میٹنگ کی ڈیمانڈ کر رہے ہیں۔” اروی نے اندر آتے ہی آج کا اہم کام بتانا شروع کیا تھا۔ یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ وہ سن بھی رہا ہے یا نہیں۔

“سر..... مسز ہمدانی والا پراجیکٹ بھی آج کل آپ کی توجہ چاہتا ہے۔ منیجر صاحب بتا رہے تھے کہ مسز ہمدانی کو میٹریل پہ تھوڑا اعتراض ہوا تھا، شاید وہ آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتی ہیں۔” اس نے دوسرا اہم کام بھی بتایا تھا لیکن اس بار چونک گئی تھی کیونکہ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی اور اسی خاموشی سے ذرا ٹھٹک کر اس نے نظریں اٹھا کر عارفین کی سمت دیکھا تھا، وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے مسلسل چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی خوبصورت پلکیں (جن کی خوبصورتی کا اعتراف وہ خود بھی کرتی تھی) بس ایک ہی جگہ ساکت ہوئی لگ رہی تھیں اور آنکھیں کسی پتھر کا سا احساس لئے ہوئے تھیں اور خود وہ اتنا خاموش تھا کہ اروی کو اس کی حالت سے ذرا سا خوف محسوس ہوا تھا اور وہ بے ساختہ ہی اسے مخاطب کرنے پہ مجبور ہوگئی تھی۔

“سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟” آج بہت عرصہ بعد اس کے لہجے میں پہلے والی اروی بولی تھی لیکن دوسری طرف اس کا انداز ہنوز تھا جس پہ اسے مزید تشویش ہوئی تھی۔

“سر! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟” اس نے آگے بڑھ کر عارفین کے بازو کو چھوا تھا اور اس کا لمس عارفین کی رگ و جاں میں گہرے سکون کی مانند اترا تھا۔

“میں بہت تھک گیا ہوں اروی!” اس کی تھکن اس کے انداز سے نہیں، اس کے ایک ایک حرف سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اروی کا ہاتھ اس کے بازو پہ..... رکا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی مگر عارفین نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اپنی پتھر آنکھوں پہ رکھ لیا تھا۔

“میں بہت تھکا ہوا ہوں اروی! بہت بے سکون ہو چکا ہوں میں، بہت کمزور پڑ گیا ہوں۔ میرے پاس رہو، مجھے سکون دو اروی! پلیز مجھے سمجھو، مجھے اپنا بن کے چاہو یا پھر مجھے چاہنے دو۔” اس کا لہجہ عجیب تھکا تھکا گمبھیر اور بہکا سا تھا۔ اروی کا ہاتھ لرز اٹھا، وہ غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

“سر! پلیز.....” اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"پلیز اروی! کچھ مت کہو، مجھے کچھ لمحے سکون سے جینے دو۔ بس کچھ لمحے۔" عارفین کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اس کا اثر اروی کے اردگرد حصار کھینچنے لگا تھا مگر وہ اس حصار میں آنا نہیں چاہتی تھی گو کہ پہلے بھی ان دونوں کے درمیان بہت سے کمزور لمحے آئے تھے اور ان کمزور لمحوں میں بہت کچھ ہوا تھا مگر اب وہ کوئی بھی کمزور لمحہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی ایسا کچھ چاہتی تھی مگر عارفین سکون کے ان لمحوں کو دُہرانا چاہتا تھا بقول اس کے کہ وہ کچھ دیر جینا چاہتا تھا۔ اس نے اروی کے نازک نرم دودھیا ہاتھ کو آنکھوں سے ہٹا کر اپنے ہونٹوں پہ رکھ لیا تھا اور اروی، عارفین کے ہونٹوں کا لمس اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی دہکا...... گیا تھا وہ گنگ سی ہو گئی تھی اسے عارفین سے اس حرکت کی ہرگز امید نہیں تھی اسے یقین نہیں آیا تھا کہ زندگی کے اس تلخ مقام پہ آ کر بھی وہ ایسا کچھ کرے گا۔

"سر....." وہ حیرت زدہ سی کھڑی تھی اور عارفین کی اس قدر بے خود جسارت پہ ابھی پریشان ہو رہی تھی کہ اس نے اروی کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا تھا وہ اس کے ہاتھوں کو کبھی آنکھوں پہ سجا رہا تھا کبھی رخساروں پہ اور کبھی ہونٹوں پہ اور اروی اس کی دیوانگی پہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی وہ شدت جذبات سے اپنی بے قراری اور بے چینی کا ٹھیک سے اظہار بھی نہیں کر پا رہا تھا اس نے اپنے اعصاب یکجا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا لئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر وہاں سے چلی جاتی عارفین نے اس کو اک جھٹکے سے کھینچ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا تھا اور اروی اس کے ایسے اچانک حملے پہ لڑکھڑا کے رہ گئی تھی۔

"مجھے میری باتوں کا جواب دے کر جاؤ اروی حیات! مجھے بتاؤ میں زندگی جینے کے لئے سکون کہاں سے تلاش کروں؟ تھک چکا ہوں میں۔ میری برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں، میں سب کچھ کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔" عارفین افسردگی کے خول سے نکل کر اب جھنجھلاہٹ اور غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

"سر آپ کی باتوں کا جواب سیدھا سا ہے آپ اپنی زندگی جینے کے لئے سکون اپنی بیوی اور بچے میں تلاش کریں، اپنی تھکن اپنی بیوی سے شیئر کریں اور بھول جائیں کہ آپ میرے گھر والوں سے مل کر کچھ کلیئر کریں گے جب تک میں نہیں چاہوں گی کچھ نہیں ہو گا ورنہ آپ کی برداشت کی حد نہیں میری برداشت کی حد ختم ہو جائے گی اور آپ مجھے کمزور سمجھ کر اپنے قریب لانے کی یا پھر تنہائی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کیا کریں ورنہ میں ریزائن بھی دے سکتی ہوں چاہے میری کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہوئی۔" وہ غصے اور سختی سے کہتی ہوئی عارفین کے ہاتھ اپنے

بازوؤں سے جھٹک کر باہر نکل گئی تھی اور عارفین نے ایک زوردار مکا اپنی ٹیبل پہ دے مارا تھا اور کرسٹل ٹیبل چکنا چور ہو کر دور تک بکھر گئی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اک اک چیز تہس نہس کر دے اس کے اندر بہت سا غبار جمع تھا۔

وہ اس قدر ڈسٹرب تھا کہ حانی کو ساتھ لے کر گاؤں چلا آیا تھا اور اس کی اچانک آمد پہ بابا جان اور بی بی جان خوشی سے نہال ہو گئے تھے۔

"میں صدقے جاواں میرے دونوں پتر اک ساتھ آئے نے۔" بی بی جان نے فوری ان دونوں کا صدقہ دیا تھا۔

"جاؤ خانم مہر النساء کو بھی بتاؤ کہ عارفین آیا ہے اپنے بیٹے کے ساتھ۔" انہوں نے ملازمہ کو بھیجا عارفین بی بی جان کے پاس بیٹھا تھا اور بابا جان حانی کے ساتھ کھیلنے میں لگے تھے۔

"زوئلہ کہاں تھی، اسے بھی اپنے ساتھ لے آتے بیٹا!" بابا جان نے حانی سے دھیان ہٹا کر عارفین کی تھکن کو جانچا۔

"وہ ایک جگہ رہنے والی عورت ہوتی تو شاید ساتھ لے ہی آتا، گھر پہ نہیں تھی اسی لئے نہیں لایا۔" اس کی بات کا مفہوم وہ دونوں سمجھ چکے تھے۔

"کیسے ہو عارفین بیٹا؟" مہر النساء کی خوبصورت دھیمی آواز پہ عارفین نے چونک کر سر اٹھایا تھا سفید بڑے سے دوپٹے میں اپنے آپ کو ڈھانپے رابعہ شیرازی کی ہم عمر مہر النساء بہت سادہ اور بہت پاکیزہ لگ رہی تھیں "کاش یہ میری ماں ہوتیں" اس نے آج تک جتنی بار مہر النساء کو دیکھا تھا اس کے دل میں یہ کاش ضرور پیدا ہوا تھا اور ساتھ ہی اپنے باپ کی بدقسمتی پہ تاسف بھی ہونے لگتا تھا جن کا نصیب مہر النساء کو چھوڑ کر رابعہ شیرازی سے جڑ گیا تھا۔

"عارفین....." اسے یک ٹک دیکھتے پا کر انہوں نے نرمی سے اسے دوبارہ مخاطب کیا تھا۔

"جی..... جی السلام علیکم آنٹی۔" اس نے چونکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر انہیں سلام کیا تھا۔

"والسلام بیٹا" کیسے ہو اور آج ادھر آنے کا خیال کیسے آ گیا؟" وہ بی بی جان کے برابر بیٹھ گئیں۔

"بس فرصت ہی نہیں ملتی تھی آج دل کچھ بوجھل سا ہو رہا تھا تو سوچا بی بی جان اور بابا جان سے مل کر ان کی کچھ دعائیں ہی لے لوں۔"

"زوہلہ اور رابعہ باجی کہاں ہیں؟ کیسی ہیں وہ؟" وہ بہت نرمی سے اور اپنائیت سے پوچھ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہیں وہ سب بھی۔" وہ مختصر کہہ پایا تھا۔

"اور حانی؟"

"حانی وہ بابا جان کے پاس ہے۔" عارفین نے بابا جان کی طرف اشارہ کیا جو حانی کو بہلانے کی خاطر ایک طرف رکھے پنجرے کے پاس لے گئے تھے جن میں رنگ برنگ آسٹریلین طوطے قید تھے اور حانی ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"ارے حانی بھی آیا ہے؟" مہرالنساء کے چہرے پہ خوشی کا رنگ بکھرا تھا اور وہ بے اختیار حانی کے پاس چلی گئیں اور اٹھا کر ساتھ لے آئی تھیں۔

"بالکل تم پر گیا ہے سارے نین نقوش باپ کے چرائے ہیں اس نے۔" مہرالنساء کی بات پہ عارفین مسکرا دیا تھا اور ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر چند لمحوں کے لئے وہ سارا ڈیپریشن بھول گیا تھا۔

۞......۞......۞

"ہیلو اروی کیسی ہو ڈیئر؟" آج سنڈے تھا وہ گھر پہ تھی اور اپنے چھوٹے چھوٹے کام نپٹا رہی تھی۔

جب پتہ چلا کہ جرار اپنی بہن (ثمینہ بھابی) سے ملنے آیا ہوا ہے اروی سر جھکا کر نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گئی تھی اور بہت اطمینان سے وہ بہت دیر تک شاور لینے کے بعد وہ باہر نکلی تو بھی وہ یہیں تھا، اروی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جرار اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا وہ اپنے بال خشک کر کے دوپٹہ اوڑھتی ہوئی باہر نکلی ہی تھی کہ اچانک بھابی کے کمرے سے وہ بھی باہر آ گیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں۔" وہ کہہ کے کچن کی طرف پلٹی تھی۔

"منگنی کا کب تک ارادہ ہے؟" وہ کافی دیدہ دلیری سے پوچھ رہا تھا۔

"کس کی منگنی؟"

"تمہاری اور میری!" اس نے کندھے اچکائے۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ سے انگیج منٹ کرنے والی ہوں؟" اروی کا لہجہ

"تمہارے گھر والوں نے۔" جرار نے ٹھنک کر جواب دیا تھا۔

"گھر والوں سے مراد ثمینہ بھابی نے؟"

"ہاں۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔

"سوری جرار صاحب ابھی میری گھر والوں سے اس ٹاپک پہ کوئی بات نہیں ہوئی لہٰذا آپ میری طرف سے دل میں کوئی بھی امید مت رکھیں..... اول تو میں نے آپ کے بارے میں سوچا ہی نہیں اور اگر سوچ بھی لیا تو آپ بخوبی جانتے ہیں میرا جواب انکار میں ہو گا اور میرے انکار کی وجہ مت پوچھئے گا بلکہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیجئے گا کہ آپ میں عورت کی عزت کرنے کی کتنی صلاحیت ہے؟" اروی کچھ بھی خیال کئے بغیر شروع ہو گئی تھی۔

"اروی پلیز وہ سب کچھ ایک نادانی تھا اب میں سب چھوڑ چکا ہوں۔" جرار نے کھلے سے انداز میں کہا تھا۔

"آپ نے شاید چھوڑ دیا ہو لیکن مجھے ابھی تک یاد ہے سب۔" اروی کا لہجہ سخت تھا۔

"تم پلیز میرے بارے میں ایک بار سوچو تو سہی، میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔" جرار نے یقین دلایا۔

"بدکردار انسان کے ساتھ کوئی خوش نہیں رہ سکتا جرار صاحب۔" اروی کے جواب پہ جرار کے لب بھینچ گئے تھے اور وہ اروی کو سر تا پا دیکھتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا مگر ثمینہ بھابی کو پتنگے لگ گئے تھے۔

"ایسی کونسی بدکرداری دیکھ لی تم نے میرے بھائی کی جو اس پہ اتنا گرم ہو رہی ہو؟"

"یہ سوال آپ اپنے بھائی سے کیجئے گا جس نے جان بوجھ کر میرے لئے پرپوزل بھیجا..... میں اس طرح انکار نہیں کرنا چاہتی تھی مگر آج اس نے خود مجھے بولنے پہ اکسایا ہے۔" اروی کا غصہ بھی عروج پہ تھا وہ بھابی کو جواب دے کر اندر چلی گئی تھی جبکہ بھابی پورے گھر میں تپتی پھر رہی تھیں اور بہروز بھائی سب سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

۞......۞......۞

دو روز بعد وہ آفس آیا تو موڈ پہلے سے کافی فریش تھا بی جان اور بابا جان جیسے اپنوں سے اپنائیت اور محبت ملی تو دل کا کافی بوجھ ہلکا ہو گیا تھا لیکن دوسری طرف بوجھ کچھ بڑھا ہوا لگ رہا تھا اروی کا چہرہ پہلے سے زیادہ سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ آج کے کاموں کی ترتیب میں

پہلا کام سائٹ پہ جانے کا تھا لہٰذا اس نے اروی کو چلنے کا سگنل دیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس کے ساتھ جانے سے کتراتی مگر اس وقت اس کے لئے یہ سہولت تھی کہ مینجر صاحب اور کمپنی کا ڈرائیور بھی ساتھ جا رہا تھا وہ لوگ آگے پیچھے چلتے ہوئے نیچے آئے تو احمر انصاری نے روک لیا۔

''ایکسیوز می سر!'' عارفین کے قدم تھم گئے تھے۔

''سر فرائیڈے کو میری سسٹر کی انگیج منٹ ہے ہم نے اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور جاننے والوں کو انوائٹ کیا ہے پلیز اگر آپ بھی شرکت کریں گے تو ہمیں خوشی ہوگی۔'' احمر نے انویٹیشن کارڈ عارفین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''انشاء اللہ ضرور شامل ہوں گے۔'' اس نے ہامی بھری تھی۔

''اور مس اروی یہ آپ کے لئے۔'' اس نے دوسرا کارڈ اروی کی سمت بڑھایا تھا۔

دن بھر کام کے دوران ٹائم کا پتہ ہی نہیں چلا ابھی وہ مزید آگے بڑھ رہے تھے جب عارفین کے پرسنل سیل پہ کال آئی۔

''کیا؟ حانی بیڈ سے گر گیا؟'' عارفین جیسے چیخ اٹھا تھا اور اروی یکدم لڑکھڑا گئی تھی اس کے ہاتھ سے منرل واٹر کی بوتل چھوٹ کر نیچے جا گری تھی۔

''تم اس کا خون روکنے کی کوشش کرو اور ابھی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ میں ابھی آ رہا ہوں۔'' عارفین تیز تیز بولتا واپسی کے لئے پلٹ گیا تھا۔

''سر پلیز میں بھی آ رہی ہوں...... پلیز سر رکیں۔'' وہ بمشکل اینٹوں اور پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی اس کے پیچھے بھاگی تھی وہ لوگ اس وقت سیکنڈ فلور پہ تھے جہاں سے اترنا بھی ذرا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ سیڑھیوں کا کام زیر تعمیر تھا۔ ڈرائیور کو ہٹا کر ڈرائیونگ سیٹ وہ خود سنبھال چکا تھا گاڑی اسٹارٹ ہونے سے پہلے وہ بھی اس کے برابر آ بیٹھی تھی اور پھر سیکنڈوں میں عارفین گاڑی مین روڈ پہ لے آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے فون کر کے ملازمہ کو ہاسپٹل کا بتایا...... عارفین کا ایک ڈرائیور اور گاڑی ہمہ وقت گھر پہ موجود رہتے تھے کہ ایمرجنسی میں کسی کو بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

''سر حانی...... حانی کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ وہ ہوش میں تو ہے نا؟'' عارفین نے ابھی کال بند ہی کی تھی کہ اروی نے اس کا بازو تھام کے بہت بے قراری سے پوچھا تھا اور عارفین اس کے زار و قطار بہتے آنسوؤں کو اور بے قرار لہجے کو دیکھ کر تھم سا گیا تھا...... اروی کے اندر کیا چیز تڑپ رہی تھی؟ یہ جان کر وہ جیسے خاک ہو گیا تھا۔ کیونکہ عارفین سے زیادہ وہ تڑپی تھی

اروی کا دل اس کی آنکھوں میں آ بسا تھا اور مچل مچل کر رو رہا تھا وہ اتنی مضبوط لڑکی پل میں بکھر گئی تھی ''محض ایک چوٹ پہ۔'' عارفین کو اس کی بے قراری پہ کافی اذیت کا احساس ہوا تھا لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔

''ڈونٹ وری معمولی سی چوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گا!'' اس نے اپنے بازو پہ رکھے اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھپکا تھا۔

''آپ کے لئے معمولی سی چوٹ ہے مگر......'' اروی کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پھر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی اس کا یہ رونا ہاسپٹل پہنچنے تک جاری رہا تھا......

گاڑی سے اترتے ہی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اندر گئے تھے عارفین اپنی مطلوبہ جگہ پہ پہنچا تو قدم تھم گئے تھے جبکہ اروی کے بے قرار قدم پتھر کے ہو گئے تھے...... سامنے ہی زوئلہ شیرازی حانی کو گود میں لیے اس کے زخم پہ پٹی کروا رہی تھی اور قریب ہی ان کی ملازمہ عذرا کھڑی تھی عذرا روتے بلکتے حانی کو لے کر ہاسپٹل جا رہی تھی جب گیٹ سے اندر داخل ہوتی زوئلہ گاڑی سے اتر آئی تھی اور پھر عذرا کے ساتھ اسے ہاسپٹل لے آئی تھی...... حانی کی نڈھال سسکیاں اروی کے قدموں سے لپٹ رہی تھیں مگر اروی کے قدم واپس مڑ چکے تھے عارفین نے حانی کو دیکھ کر اروی کو دیکھا وہ منظر سے ہٹ چکی تھی اس کی ساری بے قراری اور سارے آنسو اپنی اپنی جگہ پہ برف ہو گئے تھے سینے کے اندر دل کی جگہ پھر سے پتھر آ گرا تھا اور اس پتھر کی نارمل سی بے رنگ اور بے رونق دھڑکنیں پھر سے چل نکلی تھیں۔ کچھ دیر والی اروی ہاسپٹل کے اس دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی رہ گئی تھی جہاں وائٹ کلر کی نیکر اور شرٹ میں ملبوس چھوٹا سا حانی نڈھال ہو جانے کے بعد مرہم پٹی کروا رہا تھا اس کی ماں اس کے پاس تھی، اس کا باپ اس کے پاس تھا پھر وہاں اروی کا کیا کام؟ بہت دیر بعد وہ لوگ حانی کو لے کر باہر نکلے تو عارفین کی نظریں اروی کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں نہیں تھی۔

❂ ...... ❂ ...... ❂

دوسرے روز بھی اروی کی حالت کچھ ایسی ہی تھی لیکن اب کی بار عارفین کی طبیعت میں بے چینی گھلی تھی۔ وہ اروی کی خاموشی اس کی چپ اس کے سپاٹ چہرے سے بہت بے چین ہو گیا تھا وہ اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن آج پتہ نہیں کیا چکر تھا کہ اسے بہت سے لوگوں سے ملنا پڑ گیا تھا اور ابھی وہ سب سے فارغ ہوا ہی تھا کہ رابعہ شیرازی آفس چلی آئیں......!

''عارفین کہاں ہے؟'' انہوں نے اروی کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی اپنے روم میں ہیں۔" اس نے رابعہ شیرازی سے نظر ملائے بغیر جواب دیا تھا اور ٹیبل سے فائل اٹھا کر اس میں مصروف ہو گئی۔ وہ اروئی پہ ایک سلگتی ہوئی نظر ڈال کر عارفین کے کمرے میں آ گئیں۔ اور وہ جو اروئی کو بلانے کا ارادہ رکھتا تھا رابعہ شیرازی کو دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

"بیٹھیے۔" اس نے مروتاً انہیں مخاطب کر کے کہا تھا ورنہ بہت دنوں سے ان ماں بیٹے کی آپس میں بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

"مجھے دو لاکھ روپے کی ارجنٹ ضرورت ہے۔" انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اپنی آمد کی وجہ بتائی تھی۔

"کیش یا چیک؟" رابعہ شیرازی کی توقع کے خلاف اس نے بغیر کچھ پوچھے ہی کہہ دیا تھا۔

"کیش......"

"او کے، آپ میری پی اے سے رابطہ کر لیں، وہ آپ کو ابھی کیش ڈیلیور کروا دے گی۔"

"مجھے تمہاری پی اے کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن یہ کام وہی کر سکتی ہے۔" عارفین کو رابعہ شیرازی کے انکار پہ غصہ آیا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو آخر، میں جا کر اس سے روپے مانگوں؟" رابعہ شیرازی بھی غصے میں آ گئیں۔

"وہ انسان ہے جانور نہیں ہے مما جان۔"

"وہ تمہاری رکھیل ہے اور میں...... اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتی، چاہے وہ رقم میرے سگے بیٹے کی ہی کیوں نہ ہو۔" انہوں نے ایک آگ کا شعلہ تھا جو عارفین کے جسم پہ لگا دیا تھا، جواباً وہ دھاڑ اٹھا تھا۔

"آپ کی بھانجی جو آج کل ہر مرد کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے جس نے طوائفوں کو بھی مات دے دی ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ مما! آپ نے آج اروئی کے لئے یہ لفظ کہا ہے، آئندہ ایسا کچھ کہا تو ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ آپ کی جگہ اس وقت کوئی اور ہوتا تو میں نہ جانے کیا حشر کر ڈالتا۔" عارفین کا چہرہ غیض و غضب سے سرخ پڑ گیا تھا اور آنکھیں بھی لہو رنگ ہو گئی تھیں۔

"ہونہہ...... یہ جو تم لوگوں نے آفس میں عشق و عاشقی کا کاروبار کھول رکھا ہے نا، میں اسے خوب سمجھتی ہوں۔ بند کرو اس چکر کو۔ کچھ دے دلا کر فارغ کرو اسے ورنہ میں ایسے

لوگوں سے نپٹنا خوب جانتی ہوں۔ مجھے اس کے گھر جانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" انہوں نے عارفین کو دھمکی دی تھی۔

"آپ اگر اس کے گھر جا سکتی ہیں تو معاملہ بابا جان تک بھی جا سکتا ہے مما جان! اور پھر یہاں سے کون فارغ ہو گا، آپ یہ بھی خوب جانتی ہوں گی۔" عارفین کی دھمکی بھی کچھ کم نہیں تھی، رابعہ شیرازی ذرا ٹھٹک گئی تھی۔ بس بابا جان کے نام کے سامنے ہی تو وہ کمزور پڑ جاتی تھیں کیونکہ اصل اختیار بابا جان کے پاس تھا۔ وہ جو چاہتے کر سکتے تھے اور اب کی بار تو ان کے ہاتھ سے عارفین بھی نکل چکا تھا۔

احمر انصاری نے آج پھر بطور خاص فون کر کے اسے آنے کی تاکید کی تھی اور وہ انکار کرتے کرتے پھر چپ ہو گئی تھی اور احمر اس کی خاموشی سے مطمئن ہو گیا تھا اور مجبوراً اروئی کو آج شام احمر انصاری کی سسٹر کی انگیج منٹ پارٹی میں جانے کے لئے کچھ سوچنا پڑا تھا اور اس سوچنے میں سب سے پہلے چھٹی لینے کا خیال آیا تھا کیونکہ مقررہ وقت سے پہلے چھٹی لے کر اسے مارکیٹ جا کر احمر کی سسٹر کے لئے کوئی گفٹ لینا تھا، اسی لئے اس نے عارفین سے چھٹی کی درخواست کی تھی۔

"کیا بہت ضروری کام سے جانا ہے آپ کو؟" عارفین نے استفسار کیا تھا۔

"جی سر......"

"او کے، آپ جا سکتی ہیں۔" عارفین نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اجازت دے دی تھی۔ اروئی جلدی جان چھوٹ جانے پہ شکر ادا کرتی باہر نکل آئی تھی، اس کا رُخ مارکیٹ کی طرف تھا۔ روڈ پہ آ کر اس نے رکشہ روکا اور مطلوبہ جگہ بتائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مارکیٹ پہنچ چکی تھی۔ وہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتی اس کی قیمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ بہت دکانوں کے چکر کاٹنے کے بعد اسے ایک نفیس سا سوٹ پسند آیا تھا اور بمشکل جوڑ توڑ کرتے ہوئے اس نے وہ سوٹ خریدا اور پھر اسے گفٹ کی شکل میں پیک کروا لیا تھا۔

"اگر آپ کو مارکیٹ ہی آنا تھا تو مجھے بھی بتا دیتیں، میں بھی ساتھ ہی آ جاتا۔" وہ شاپ سے باہر نکل رہی تھی، جب عارفین ٹکرا گیا تھا۔ چونکہ وہ بھی انوائٹ تھا، اس لئے اروئی کی طرح گھر جانے سے پہلے اس نے بھی گفٹ لینے کا ہی سوچا تھا۔

"کیا میری ہیلپ کر سکتی ہیں؟" عارفین کی نظریں اروئی کے چہرے پہ ثبت تھیں۔

"آپ اس کام میں کافی ٹرینڈ ہیں، آپ کو ہیلپ کی کیا ضرورت؟" اروی نے طنزیہ کہا۔

"میں نے آج تک "اپنی بیوی" کے علاوہ کبھی کسی کے لئے کچھ نہیں خریدا، اسی لئے کسی پسند ناپسند کا قطعی اندازہ نہیں ہے۔" عارفین نے دلچسپی سے کہا تھا۔

"جو شخص اپنی بیوی کے لئے خرید سکتا ہے، وہ کسی کے لئے بھی خرید سکتا ہے۔" اروی بے وجہ ہی طنزیہ ہو رہی تھی، اسے عارفین کا معصوم بننا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"جو "چیزیں" میں اپنی بیوی کے لئے خریدتا ہوں وہ "چیزیں" کسی اور کے لئے کیسے خرید سکتا ہوں مس اروی؟" اروی کی تکرار دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی عارفین ذومعنی بات کہہ گیا تھا اور حسب توقع اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ شرم سے سرخ ہوا ہے یا غصے سے؟

"آپ اپنی حد سے بڑھ رہے ہیں سر......" وہ دبے لہجے میں بولی تھی۔

"میری حد کو آپ ہی تو کرید رہی ہیں۔ بار بار میری بیوی کا مقابلہ دوسروں سے کر رہی ہیں۔ اب میں یہ بھی نہ بتاؤں کہ میں نے آج تک اپنی بیوی کے لئے "کیا کچھ" خریدا ہے؟" عارفین نے اروی کی بولتی بند کر ڈالی تھی۔

"آیئے پلیز، میری تھوڑی سی ہیلپ کروا دیجئے۔" عارفین نے اروی کا ہاتھ تھامتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

"اروی! کیسی ہو ڈیئر......" عارفین کے عقب سے نکل کر کوئی سامنے آ گیا تھا۔

"جرار......" اروی کا رنگ متغیر ہو گیا تھا جبکہ جرار، عارفین کے ہاتھ میں دبے اروی کے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس پہ اروی بُری طرح چکرا گئی تھی لیکن عارفین نے اس کا ہاتھ پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔

"لگتا ہے کافی بزی ہو؟" جرار نے تمسخرانہ لہجے میں کہا تھا۔

"او کے پھر کبھی ملاقات ہو گی، بائے۔" وہ خباثت سے مسکراتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن اروی کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

"اروی! پلیز سنبھالو اپنے آپ کو، وہ انسان تھا کوئی بھوت نہیں تھا جو تمہیں کھا جائے گا۔"

"وہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ انتہائی ذلیل شخص ہے وہ۔" اروی اپنا ہاتھ چھڑاتی تیزی سے پلٹی تھی۔

"لیکن کچھ بتاؤ تو سہی، کون تھا وہ؟" عارفین اُلجھ رہا تھا۔

"میری بھابی کا بھائی ہے وہ، اسی نے میرے لئے پرپوزل بھیجا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔" اروی اسے مختصر بتاتی وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ وہ ضرور کوئی فساد پیدا کرے گا۔

بہت عجلت میں وہ گھر پہنچی تھی لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو اروی کو مزید پریشان کرتا، البتہ بھابی کی نظریں اسے سرتاپا کھوج رہی تھیں۔ چبھتی ہوئی، کھوجتی ہوئی نظریں اروی کو کچھ نہ کچھ باور کروا ہی چکی تھیں۔

"تھوڑی دیر پہلے جرار کا فون آیا تھا، بتا رہا تھا اروی کو مارکیٹ میں دیکھا ہے۔ شاید کوئی شاپنگ کر رہی تھی؟" بھابی نے گزرتے گزرتے بھی طنز کا تیر چھوڑ ہی دیا تھا۔ اروی پانی پینے کی غرض سے صحن میں چارپائی پہ امی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جب بھابی کے چھوڑے ہوئے تیر پہ اندر سے گھبرا گئی تھی۔ امی نے نارمل سے انداز میں سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

"جی وہ ہمارے آفس کے ایک کولیگ ہیں، ان کی بہن کی آج انگیج منٹ ہے، انہوں نے مجھے بھی انوائٹ کیا تھا، اس لئے ان کی بہن کے لئے گفٹ لینے گئی تھی۔" آج پہلی بار گھر والوں کے سوال میں اسے شک کی بو آئی تھی اور یہ شک پیدا کرنے والا جرار تھا۔

"تمہارے ساتھ شاپنگ کرنے والا دوسرا کون تھا؟" بھابی نے مزید استفسار کیا۔

اروی "چور" تو پہلے ہی تھی، اب اسے اپنی چوری پکڑے جانے کا خدشہ ہو گیا تھا۔

"میرے ساتھ شاپنگ کرنے والا اور کوئی نہیں تھا، وہ تو میں شاپنگ کر کے باہر نکل رہی تھی جب ہماری کمپنی کے باس بھی وہیں شاپنگ کرنے آ گئے۔ وہ بھی آج کی پارٹی کے لئے ہی گفٹ خریدنے آئے تھے۔"

"اوہ...... ورکرز اور باس ایک ہی شاپنگ سنٹر سے شاپنگ کرتے ہیں؟" بھابی کو بات بڑھانے کا بہانہ مل گیا تھا اور وہ اچھی خاصی بات بڑھا رہی تھیں۔

"ایسی بات نہیں ہے، وہ شاپنگ سنٹر ہمارے آفس سے ذرا قریب ہے، اس لئے اکثر سب ہی وہاں ہی جاتے ہیں۔" اروی نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت دینے پہ مجبور تھی۔

"جاؤ بیٹا، منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ، سارہ چائے بنا رہی ہے، تم بھی چائے لے لو۔"

امی نے اروٰی کو باتوں میں الجھنے سے بچالیا تھا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ ثمینہ اسی طرح بات کو طول دیتی رہے گی۔ سارہ بھی کچن میں کھڑی بھابی کی بحث سن کر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ اروٰی اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نہا کر اپنے آپ کو تازہ دم کیا تھا اور پھر چائے پینے بیٹھ گئی تھی۔

''آپی! کیا پارٹی بہت بڑی ہے؟'' سارہ نے نہ جانے کیوں پوچھا تھا اور اروٰی نہ جانے کیا سمجھی تھی۔

''کیوں، کیا تم بھی جانا چاہتی ہو؟'' اروٰی نے کپ ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں، بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' سارہ نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

''ارے یار! اگر جانا چاہتی ہو تو چلو میرے ساتھ بلکہ اٹھو شاور لے کر دوسرے کپڑے پہنو، گرمی کافی ہے اس لئے نہا کر فریش ہو جاؤ گی۔'' اروٰی نے سارہ کے کندھے پہ تھپکی دے کر اسے چلنے کا کہا تھا۔ دراصل اندر سے اروٰی بھی اپنے لئے کوئی سہارا چاہ رہی تھی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جرار کی وجہ سے اسے جس شک کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ رات کے وقت اکیلے پارٹی میں جا کر اس شک کو پختہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

❁....❁....❁

''اللہ اس طرح بھی مرادیں پوری کرتا ہے، مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔'' اروٰی کو دیکھ کر احمر انصاری کی نظریں سارہ کے چہرے پہ ٹھہر گئی تھیں۔ اروٰی اس کی بات پہ چونک گئی تھی اور سارہ کی نگاہیں جھک گئیں کیونکہ احمر انصاری..... اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''لگتا ہے ہم لوگ ذرا جلدی آگئے ہیں۔'' اروٰی نے بات نظر انداز کر ڈالی تھی۔

''ارے نہیں نہیں، آپ لوگ مقررہ وقت پہ ہی آئے ہیں۔ اندر آئیے، بہت سے لوگ آپ کے آنے سے پہلے ہی آچکے ہیں۔'' احمر نے فوراً اروٰی کی بات کی تردید کی تھی اور ان دونوں بہنوں کو لے کر اندر آگیا تھا۔ فنکشن میں موجود بہت سے لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تھا جن میں عارفین شیرازی بھی شامل تھا۔ اروٰی کے ساتھ دوسری لڑکی کون تھی، عارفین کو زیادہ غور نہیں کرنا پڑا تھا، وہ اس کے ساتھ سارہ کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

''مام! ان سے ملیئے، یہ میری کولیگ اروٰی حیات...... اور یہ ان کی چھوٹی بہن ہیں سارہ حیات.....'' احمر نے بطور خاص سٹیج کے قریب جا کر ان کا تعارف کروایا تھا اور احمر کی مام ان کا تعارف سنتے ہی نیچے اتر آئی تھیں۔ انہوں نے اروٰی اور سارہ کو باقاعدہ گلے لگا کر ان کے

رخساروں پہ پیار کیا تھا۔

''ماشاءاللہ دونوں بہنیں ہی بہت پیاری ہیں، کسی ایک کا انتخاب تو سچ مچ بہت مشکل کام ہے۔'' وہ مسکرا کر بولیں تو اروٰی ایک بار پھر چونک اٹھی تھی۔ اس نے فوراً احمر کی سمت دیکھا جو بے دھیانی میں سارہ کی سمت دیکھ رہا تھا اور پھر اروٰی کو کچھ نہ کچھ معاملہ سمجھ آ ہی گیا تھا اور احمر انصاری کی اپنے آگے پیچھے پھرنے والی گتھی بھی سلجھ گئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اروٰی کو ایک پل میں ہی بہت ہی اچھا سا احساس ہونے لگا تھا۔

''آئیے میں آپ کو اپنی سسٹر سے ملواتا ہوں۔'' وہ ان دونوں بہنوں کو ساتھ لے کر سٹیج پہ آگیا تھا۔ خوبصورت نفیس سے...... لہنگے میں قیمتی جیولری پہنے، لائٹ میک اپ کے ساتھ دلہن بنی بیٹھی احمر کی سسٹر ان دونوں بہنوں کو دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئی تھی اور اس وقت ایسی ہی خوشی اروٰی کے چہرے سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔

''مس اروٰی! آپ کو مسز وقار یاد کر رہی ہیں۔'' احمر کی اطلاع پر اروٰی نے ٹھٹک کر اس کی نظروں کی تعاقب میں دیکھا تھا۔ مسز وقار نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلایا تھا۔

''سارہ! تم فاریہ کے پاس بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' اروٰی اسے احمر کی سسٹر کے پاس بٹھا کر خود نیچے آگئی تھی۔

''ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟'' مسز وقار عارفین کی کولیگ تھیں، کافی عرصہ عارفین نے ان کے ساتھ پراجیکٹ پہ کام کیا تھا، جب ہی اروٰی سے ہیلو ہائے تھی۔ وہ ذاتی طور پر اروٰی کو کافی پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ خاصی محنتی لڑکی تھی۔

''آج آپ مسٹر عارفین کے ساتھ نظر نہیں آرہیں، کیا جاب چھوڑ دی ہے؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ احمر صاحب نے مجھے ذاتی طور پر انوائٹ کیا تھا، اس لئے میں اپنے گھر سے اپنی سسٹر کے ساتھ آئی ہوں۔'' اروٰی نے وضاحت دی۔

''ویسے یار! اگر تم کبھی بھی عارفین کی جاب چھوڑو تو اگلی جاب کے لئے مجھے مت بھولنا۔ میں تمہیں اپنا پی اے رکھ کر خوشی اور ریلیکس فیل کروں گی۔'' مسز وقار کی آفر پہ اروٰی کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ یعنی وہ عارفین کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور ہو سکتی ہے۔ اس سوچ نے اسے بہت اطمینان بخشا تھا۔

''انشاءاللہ مجھے بھی آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔'' اروٰی نے ہامی بھرلی تھی۔

''مسز وقار! بزنس میں غداری تو چل جاتی ہے لیکن رشتوں میں ایسا کوئی کام پھوٹ ڈال دیتا ہے۔ آپ میرے ورکرز کی چین توڑ رہی ہیں۔'' عارفین نے قریب آتے ہوئے مسز وقار سے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

''اگر تم اپنے ورکرز کے لئے بہت اچھے باس ثابت ہو رہے ہو تو میری کوشش کے باوجود یہ چین کبھی نہیں ٹوٹے گی اور اگر تمہارے ورکرز کو تم سے شکایت ہے تو وہ چین توڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگائیں گے۔'' مسز وقار نے سو فیصد سچ کہا تھا۔

''آپ میرے جس ورکر کو توڑ رہی ہیں، وہ تو پہلے ہی شکایتوں سے بھرا پڑا ہے۔'' عارفین نے مسکرا کر اروی کے چہرے کو نظروں کی زد میں رکھا تھا، وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔

''اچھا، وہ کیوں؟'' انہوں نے حیرانی اور دلچسپی سے پوچھا تھا۔

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے جسے شکایت ہے۔'' عارفین نے اروی کو جان بوجھ کر اپنی بات میں گھسیٹا تھا۔

''کیوں اروی! عارفین سچ کہہ رہا ہے کیا؟ تمہیں اس کی جاب سے شکایت ہے کوئی؟'' ان کے استفسار پہ اروی جز بز سی ہو گئی تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک ورکر ہمیشہ ایک ہی جگہ کام کرنے کا پابند تو نہیں ہے نا؟ وہ جب چاہے جہاں چاہے جاب کر سکتا ہے۔'' اروی نے مسز وقار سے بات کرتے ہوئے عارفین کو بھی سنا دیا تھا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن جہاں تک میرا خیال ہے عارفین ایک بہت اچھا باس ہے، وہ کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے یقین سے کہا تھا اور اروی کے لبوں پہ طنزیہ مسکان اُمڈ آئی تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر عارفین چپ ہو گیا تھا، اس سے پہلے کہ ان لوگوں میں مزید کوئی بحث ہوتی، لڑکے والے رنگ پہنانے کے لئے آ گئے تھے، ان کے آتے ہی فنکشن میں رونق آ گئی تھی۔ عارفین کی ملاقات سارہ سے بھی ہوئی تھی۔ سارہ عارفین سے مل کر ہمیشہ امپریس اور کنفیوز سی ہو جاتی تھی، اس کی پرسنالٹی ہی کچھ ایسی بارعب تھی کہ بہت سے لوگ بات کرتے کرتے خود ہی گڑبڑا جاتے تھے۔ یہ تو صرف اروی کی خود اعتماد شخصیت تھی جو وہ اس کے سامنے ٹھہر جاتی تھی ورنہ کئی ایسی لڑکیاں بھی ملتی تھیں جو بات ہی نہیں کر پاتی تھیں اور سارہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو چکا تھا، دو بار کنفیوز ہو چکی تھی۔

''کیا میں اتنا خوفناک ہوں کہ آپ سے بات کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ڈر جاتی ہیں؟'' عارفین نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تھا۔

''نن ...... نہیں سر ...... ایسی بات نہیں ہے۔'' سارہ فوراً گھبرا کے بولی تھی۔ احمر اور عارفین بیک وقت مسکرائے تھے۔

''میں صرف مس اروی حیات کا ''سر'' ہوں، آپ مجھے بھائی کہہ کر بلائیں گی تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔'' عارفین نے اسے ''سر'' کہنے پہ ٹوک دیا تھا اور اروی نے انتہائی سرد نظروں سے عارفین کو دیکھا تھا جو سارہ کے ساتھ بہت اپنائیت اور محبت سے باتیں کر رہا تھا اور سارہ حیران ہو رہی تھی۔

اس کا بے تکلف سا انداز دیکھ کر سارہ کو کچھ حوصلہ ہوا تھا اور پھر تھوڑی بہت گفتگو کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ اگرچہ اروی کو ایسی کوئی بھی بے تکلفی یا اپنائیت ہرگز گوارا نہیں تھی لیکن وہ اس طرح منع بھی تو نہیں کر سکتی۔ نہ عارفین کو، نہ سارہ کو۔ واپسی پہ عارفین انہیں ڈراپ کرنے کی آفر دینے ہی والا تھا جب احمر انصاری کی مام نے احمر کو اجازت دی کہ وہ اروی اور سارہ کو خود جا کر ڈراپ کر آئے اور احمر نے بخوشی ان کا یہ حکم مانا تھا، مجبوراً عارفین کو چپ ہونا پڑا تھا اور اروی بھی کچھ نہ کہہ سکی تھی، انہیں احمر کے ساتھ جانا پڑا تھا۔

''امی! کیا بات ہے، آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟'' بھائی کا سوجا ہوا چہرہ، امی کی پریشان صورت، سارہ کی چپ اور بہروز بھائی کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اروی کو بے حد گھبراہٹ تھی۔

''جرار آیا تھا اپنا رشتہ قبول کرنے پہ زور دے رہا تھا لیکن تمہارے بھائی نے انکار کر دیا جس پہ وہ تمہارے کردار پر کیچڑ اچھالنے لگا اور پھر دونوں کی بات تو تو، میں میں تک چلی گئی اور اس فساد میں تمہاری بھابی صاحبہ پیش پیش تھیں۔'' امی نے جیسے ہی وجہ بتائی، اروی کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور جسم میں عجیب سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔

گویا نوبت وہاں تک پہنچ ہی گئی تھی جہاں تک پہنچنے سے اروی ہمیشہ سے ڈرتی آئی تھی۔

''ب ...... بھائی نے کیا کہا تھا؟'' لاکھ کوشش کے باوجود بھی اروی کا لہجہ لڑکھڑا ہی گیا تھا۔

''اس نے تو بس یہی کہا تھا کہ اگر اروی اس رشتے کو پسند نہیں کرتی تو ہم اس کی شادی ہرگز نہیں کریں گے اور وہ دل سے ہر امید نکال دے مگر جرار تو نہ جانے کب سے بھرا بیٹھا

تھا، وہ تو نہ جانے کیا کیا کہنا شروع ہو گیا تھا، اس نے ذرا لحاظ نہیں کیا، تب ہی بہروز نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا اور پھر ہم سب نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ بہروز تو تھا ہی بیمار، وہ بھلا کتنا لڑ جھگڑ سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے سنبھالا ہے اسے اور وہ ذلیل الٹا دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ کہتا ہے، اب آپ کی بیٹی کے کردار کا کوئی ثبوت لے کر آؤں گا۔''

امی اپنی ہی پریشانی میں سب کچھ بتاتی چلی گئیں اور اروی کا جسم بے جان ہوتا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی جائے پناہ نہیں تھی جہاں جا کر وہ ہر پریشانی، ہر خدشے، ہر الزام سے چھپ کر بیٹھ جاتی اور اپنے گھر والوں کے لئے وہی اروی رہتی جیسی وہ اسے سمجھتے اور دیکھتے تھے لیکن کہتے ہیں کہ کسی کے کردار پہ اگر ایک داغ آ جائے تو رفتہ رفتہ وہ بہت سے داغوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اروی کو اپنا آپ بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ کسی نے اس کے ایک داغ پہ انگلی اٹھائی تھی اور یقیناً رفتہ رفتہ اس کے دوسرے داغ بھی ہزاروں انگلیوں کی زد میں آنے والے تھے۔ اس کا کردار اچھالا جانے والا تھا اور وہ آگے بڑھ کے لوگوں کو روک بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک حد تک لوگ سچے تھے اور وہ غلط تھی اور ایک حد تک وہ سچی تھی اور لوگ غلط تھے۔

❁......❁......❁

''سر! میں یہ جاب چھوڑنا چاہتی ہوں۔'' عارفین ٹیبل پہ اروی کا ریزائن دیکھ کر چونک گیا تھا، تب ہی اسے بلا کر باقاعدہ استفسار کیا تھا اور جواباً اس نے مختصر کہہ کر چہرہ جھکا لیا تھا۔

''کیوں اروی؟'' وہ بے چین سا ہو کر اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''آپ کے پاس ''کیوں'' کا کوئی حق نہیں سر۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔

''سارے حق میرے پاس ہی تو ہیں اروی! کیوں انکار کرتی ہو میری ذات سے۔'' وہ بے بسی سے بولا تھا۔

''جس انسان کے پاس اپنی ذات کا کوئی مان نہ ہو، وہ دوسروں کو بھلا کیا دے گا؟'' اروی اسی تلخی سے مسکرائی تھی۔

''میں تم سے ریزائن کی وجہ پوچھ رہا ہوں۔''

''میں کہیں اور جاب کرنے والی ہوں۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

''کیوں، کیا تمہیں یہاں جاب کا اچھا پیکج نہیں مل رہا؟ کیا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟'' عارفین نے فوراً پوچھا تھا۔

''صرف جاب کے لئے پرکشش پیکج ہی کافی نہیں ہوتا سر! عزت کا بھرپور پیکج بھی ملنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ مجھے عزت کی ضرورت ہے جو فی الحال آپ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے خطرے میں نظر آ رہی ہے۔'' اروی کا انداز بہت تھکا تھکا سا اور لہجہ تلخی کی آمیزش لئے ہوئے تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب صرف اتنا سا ہے سر! کہ آپ میرے کردار کا داغ بنتے جا رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ یہ داغ پختہ ہو جائے، میں آپ سے دور ہٹ جانا چاہتی ہوں۔ بہت عرصہ ہوا میں آپ کے گھر والوں کی کاٹ دار نظروں کو سہہ رہی ہوں مگر سر! اب میرے گھر والے مجھے اپنی کاٹ دار نظروں کا نشانہ بنائیں، میں یہ ہرگز نہیں سہہ سکتی۔ اب بہت کمزور ہو گئی ہوں، تھک گئی ہوں، اب کچھ سہہ نہیں پاؤں گی، مر جاؤں گی اب تو......'' اروی نے آنکھوں کے کنارے تک آئے آنسو بڑی مشکل سے پیچھے دھکیلے تھے۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو اروی! کیا ہو گیا ہے تمہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' عارفین نے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، زندہ ہوں، جی رہی ہوں اور کیا چاہئے بھلا۔'' اس نے عارفین کے ہاتھ کندھوں سے ہٹا دیئے تھے۔

''کیوں اکیلی پریشانیوں کا بوجھ اٹھا رہی ہو، پلیز مجھے بتاؤ، مجھ سے شیئر کرو، کیا مسئلہ ہے آخر؟''

''فی الحال تو میرا مسئلہ آپ ہیں اور میں اس مسئلے سے دور جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے عارفین کو سرتاپا دیکھا تھا، بے حد تلخ نظروں سے۔

''پلیز اروی! اپنی ضد چھوڑ دو۔ مجھے سب کے سامنے فاصلے کی یہ دیوار گرانے دو، مجھے بتانے دو سب کو کہ اروی حیات اکیلی نہیں ہے، عارفین شیرازی سرتاپا اس کا ہے اور اس کے ساتھ ہے۔''

''اونہہ......آپ میرے ساتھ نہیں ہیں تو لوگ مجھ پہ کیچڑ اچھالنے لگے ہیں اور اگر آپ میرے ساتھ ہوں گے تو یقیناً لوگ سنگسار کر دیں گے مجھے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''اُف خدایا......میں کیا کروں؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر چیئر پہ بیٹھ گیا تھا۔

''آپ میرے ریزائن لیٹر پہ سائن کر دیں بس۔'' وہ ابھی بھی اپنے فیصلے پہ قائم تھی۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"جی سر! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" وہ دوٹوک بولی تھی۔

"او کے، ایز یو وِش۔" اس نے فارم کھول کر اس پہ سائن کر دیئے تھے اور اروٰی اپنی ذات سے ایک بوجھ ہٹنے کا سکون لئے وہاں سے نکل آئی تھی۔

"ایسا کیوں کیا تم نے؟ عارفین، اس کی ماں اور اس کی بیوی اتنے اچھے لوگ تھے بیٹا! کیوں ان کی جاب چھوڑ دی۔" امی کو سچ مچ اروٰی کے فیصلے پہ افسوس ہوا تھا۔

"امی! مسز وقار ان لوگوں سے زیادہ اچھی ہیں اور انشاء اللہ ہمارا وقت بھی اچھا گزرے گا، یہ جاب انہوں نے خود آفر کی تھی۔"

"لیکن بیٹا! لوگوں کی باتوں میں آ کر جذباتی فیصلے کر لینا عقل مندی تو نہیں ہے نا؟ وہ خبیث جو کہتا ہے، اسے کہنے دو، تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" امی کو رہ رہ کر عارفین جیسا اچھا باس یاد آ رہا تھا جنہوں نے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

"بس امی! جو ہو گیا، اچھا ہو گیا۔ آپ آئندہ کے لئے بہتری کی دعا کریں۔" اروٰی اب عارفین کے ذکر سے بھی دامن چھڑا رہی تھی لیکن امی کو بہت دیر تک اس کے جاب چھوڑنے پہ افسوس ہوتا رہا تھا۔

"ہاں جی، اپنے آپ کو پاک صاف دکھانے کے لئے دامن جھاڑنا ہی پڑتا ہے۔" بھابی کسی سے فون پہ بات کر رہی تھیں لیکن باتوں اور نظروں کا مرکز اروٰی ہی لگ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں میری جان! جھوٹ کب تک چھپ سکتا ہے بھلا؟" وہ یا تو جرار سے بات کر رہی تھی یا پھر فون پہ بات کرنے کا ناٹک کر رہی تھیں لیکن جو بھی تھا، نشانہ بہرحال اروٰی کی ذات ہی تھی۔

"آپی! میں نے آپ کے لئے شربت رکھا ہے، آپ جلدی سے ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔" سارہ نے بھابی کی باتوں کے پیشِ نظر اروٰی کو وہاں سے اٹھا لیا تھا۔

"ہوں، آ رہی ہوں۔" وہ اپنے کو حوصلہ دیتی پھر سے ریلیکس ہونے کی کوشش کرتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

گھر میں عجیب بدمزگی کا عالم تھا، سب ہی ایک دوسرے سے خفا خفا اور نظریں

چرائے ہوئے پھر رہے تھے اور اس ساری سچویشن میں اروٰی اپنے آپ کو ہی قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس چکر، کس مصیبت میں پھنسی ہے اور اب اس کا انجام کیا ہوگا؟ اور انجام سوچ سوچ کے ہی اسے خوف آ رہا تھا، دل ڈوب سا رہا تھا۔

"زوئلہ...... زوئلہ...... کہاں گم ہو سویٹ ہارٹ۔" رابعہ شیرازی سیڑھیوں سے ہی اسے پکارتی آ رہی تھیں۔

"زوئلہ تمہارے لئے گڈ نیوز ہے ڈیئر۔" وہ اس کے بیڈروم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ زوئلہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلی تھی۔ بالوں کو خشک کرتے کرتے ان کے قریب آ گئی تھی۔

"مبارک ہو سویٹ ہارٹ، وہ جادوگرنی عارفین کی جاب چھوڑ کر چلی گئی ہے، اس نے کہیں اور جاب کر لی ہے۔" رابعہ شیرازی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں بتایا تھا اور زوئلہ خوشی سے چیخ اٹھی تھی۔

"رئیلی مام! آئی...... آئی کانٹ بلیو اٹ؟" زوئلہ نے تولیہ پھینک کر رابعہ شیرازی کو کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"آف کورس ڈیئر...... آف کورس......" وہ دونوں ہی بے پناہ خوش تھیں، انہیں صحیح معنوں میں آج اپنی کامیابی کی خوشی اور احساس ہو رہا تھا، گویا وہ اپنے پلان میں آج پوری طرح سے کامیاب ہو چکی تھیں۔ اب عارفین بھی ان کا تھا اور حانی بھی ان کا تھا۔ اب بابا جان کے دباؤ میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان کے سر پہ لٹکنے والی "اروٰی" نام کی سولی ہٹ چکی تھی۔ اب انہیں کسی چیز کا کوئی خدشہ نہیں تھا، اب عارفین کے پاس زوئلہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا، اب کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس پہ وہ کھل کر راج کر سکتی تھیں، ان کا یہ خدشہ ختم ہو چکا تھا کہ کہیں عارفین زوئلہ کو ڈائیورس نہ دے دے۔ اب وہ آزاد تھیں۔

"اف تھینک گاڈ...... مام! مجھے تو سچ مچ عارفین کے تیور دیکھ کر ڈر لگنے لگا تھا، میں سوچتی تھی اگر اس کمینی نے یہ مطالبہ رکھ دیا کہ زوئلہ کو طلاق دے دو تو پھر میرا کیا بنے گا؟ نام نہاد محبت اور پسند کے آگے وقتی طور پر مرد مجبور ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ اگر عارفین بھی مجبور ہو جاتے تو......؟ اف اچھا ہوا وہ ان کی نظروں سے تو دور ہوئی نا۔" زوئلہ زور و شور سے اپنے خیالات کا اظہار کافی خوشی سے کر رہی تھی۔

"ضروری نہیں جو نظروں سے دور ہو، وہ "دل" سے بھی دور ہو جائے۔" عارفین کی بھاری آواز زوئلہ کے عقب سے ابھری تھی اور اس کی بات کے مفہوم کو جان کر زوئلہ اور رابعہ شیرازی ایک بار پھر چکرا گئی تھیں۔ وہ دونوں پہ ایک سرد اور طنزیہ نظر ڈال کر آگے بڑھ کر اپنا بریف کیس رکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" رابعہ شیرازی اپنے تیکھے لہجے پہ اتر آئی تھیں۔

"آپ بہت ذہین اور سمجھ دار ہیں مما جان! میرا مطلب سمجھ چکی ہیں۔" عارفین اپنی ٹائی کی ناٹ کھولتے ہوئے بہت ریلیکس انداز میں بولا تھا۔

"لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔" وہ بضد ہوئیں۔

"تو سُن لیں مما جان! اروئی میرے آفس سے گئی ہے، میرے دل سے یا میری زندگی سے تو نہیں گئی۔ یہ بھول ہے آپ کی کہ وہ میری نظروں سے اُوجھل ہو گئی ہے۔ وہ ہر لحہ ہر آن میرے سامنے میرے پاس ہے اور اس کی مثال آپ کے سامنے ہے۔" اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے دروازے کی سمت اشارہ کیا تھا اور وہ دروازے کی سمت دیکھ کر تپ گئی تھی اور رابعہ شیرازی ایک بار پھر اپنا ٹیمپر لوز کر گئی تھیں۔

"اس گھٹیا بکاؤ لڑکی میں آخر کیا رکھا ہے جو تم ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے؟" عارفین ملازمہ کے ہاتھوں سے حانی کو اٹھا کر ان کی سمت پلٹا تھا۔

"اس لڑکی میں وہ کچھ ہے جو اس گھر کی دونوں عورتوں میں "ہرگز نہیں" ہے، اسی لئے اس کا پیچھا چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔" اس نے کھڑے کھڑے دونوں پہ وار کیا تھا اور دونوں تلملا گئی تھیں۔

"شٹ اپ۔ اپنی زبان کو لگام دو، تم اپنی ماں کے ساتھ اب یہ لینگویج استعمال کرو گے؟"

"اونہہ...... میری ماں...... لوگوں کے جذبات کا سودا کرنے والی عورت میری ماں ہے، مجھے افسوس ہے اپنی قسمت پر اور اپنے ہونے پر۔" اس نے نفرت سے سر جھٹکا تھا اور حانی کو بیڈ پہ بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

"میں جانتی ہوں تم کس کی زبان بول رہے ہو، تم چند دن پہلے گاؤں گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ تمہیں خوب پٹیاں پڑھا کر بھیجیں گے۔ پہلے ایک تھی جادو کرنے والی، اب دوسری بھی مل گئی ہے۔ میرے لئے تو تم ایسا کھو گئے ہی۔" رابعہ شیرازی اب دوسری ڈگر پہ

چل نکلی تھیں، بہت عرصہ سے انہوں نے "گاؤں والی جادوگرنی" کا پیچھا چھوڑ کے شہر والی جادوگرنی (اروئی) کا پیچھا لیا ہوا تھا لیکن آج وہ دونوں بیک وقت یاد آ گئی تھیں۔ لیکن عارفین نے جواباً کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ جھک کر حانی کو پیار کرنے لگا تھا اور رابعہ شیرازی اس کی بے نیازی پہ دھڑام سے دروازہ بند کر کے چلی گئی تھیں۔

❁......❁......❁

اروئی کو مسز وقار کی کمپنی میں کام کرتے ہوئے پورے دو ماہ ہو چکے تھے، انہوں نے سچ مچ اروئی کو عارفین کی جاب سے زیادہ اچھا پیکج دیا تھا۔ وہ حقیقتاً ان کے ساتھ کام کر کے خاصی مطمئن تھی اور ان کا ہر کام کافی توجہ اور ایمانداری سے سرانجام دے رہی تھی۔ اسے عارفین کی جاب چھوڑنے پہ کوئی ملال نہیں تھا۔ بس اتنا ہوتا تھا کہ رات کو بستر پہ لیٹتی تو اپنا وہ "دل" شدت سے یاد آ جاتا تھا جو وہ عارفین کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس دل کی تڑپ، اس دل کی لگن، اس دل کی چاہ جاگ اٹھتی تھی اور پھر اروئی کے لئے بستر بھی کانٹوں بھری سیج بن جاتا تھا اور اپنی دھڑکنیں مسلسل شور کے سوا اور کچھ نہیں لگتی تھیں۔ رات کو اس کی حالت ماہی بے آب کی مانند ہوتی تھی اور صبح پھر وہ زندہ انسانوں جیسے چلتی پھرتی سب کے لئے متفکر ہوتی نظر آتی تھی۔ گھر اور آفس کی ذمہ داریاں دن بھر کچھ سوچنے ہی کب دیتی تھیں بھلا؟

"اروئی کس سوچ میں گم ہو بھئی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" مسز وقار اس کے کیبن میں آئیں تو اروئی کو گم سم دیکھ کر ٹھہر گئی تھیں۔

"جج...... جی...... میں ٹھیک ہوں۔" وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"اوکے تو پھر اسلام آباد جانے کی تیاری پکی ہے نا؟"

"آف کورس میڈم! یہ تو میری جاب ہے، جانا تو ہے۔" اروئی نے کندھے اچکائے۔

"ٹھیک ہی پھر تم اس وقت گھر جاؤ اور فریش ہو کر آ جاؤ، تب تک ہماری فلائٹ کا ٹائم ہو جائے گا۔" مسز وقار خود بھی اپنے گھر جا رہی تھیں اور جاتے جاتے اروئی کو ہدایت کرنا بھی نہیں بھولی تھیں۔

"اوکے میڈم! میں جا رہی ہوں۔" اروئی کو اب آفس کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت حاصل تھی، اس لئے وہ آسانی سے آتی جاتی تھی۔

❁......❁......❁

اسلام آباد میں یہ ایک ایسی میٹنگ تھی جس میں مسز وقار کے علاوہ ملک کے کئی اور نامور آرکیٹیکچر اور بلڈرز گروپ بھی شامل تھے جن میں عارفین شیرازی کا نام بھی سرفہرست تھا لیکن اروٰی نے اپنی بے دھیانی اور مصروفیات میں اس بات پہ دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ جہاں وہ جا رہی ہے یا پھر جہاں اور بہت سے لوگ بھی ہوں گے وہاں عارفین شیرازی بھی ہوگا۔

شام پانچ بجے وہ مسز وقار کے ساتھ اسلام آباد پہنچی تھی، ان لوگوں کا قیام ایک فائیو سٹار ہوٹل میں تھا۔ کراچی اور لاہور سے آنے والے وفد کا قیام بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ کچھ لوگ تھرڈ فلور پہ ٹھہرے ہوئے تھے، کچھ سیکنڈ فلور پہ اور کچھ کا قیام گراؤنڈ فلور پہ تھا۔ سب کے لئے دو دو کمروں کی بکنگ تھی، ایک ان کے لئے اور ایک ان کے پی اے اور سیکرٹری وغیرہ کے لئے۔

مسز وقار کے کمرے کے بالکل سامنے والا کمرہ اروٰی کے لئے ریزرو تھا، ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی اسی ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے ان کا سامان بیڈ رومز میں پہنچا دیا تھا اور ان کو کمروں کی چابیاں بھی سونپ دی تھیں۔ وہ لوگ ایک گھنٹہ ریسٹ کرنے کی غرض سے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ ایک گھنٹہ ریسٹ کرنے اور فریش ہونے کے بعد وہ لوگ میٹنگ ہال میں پہنچے تھے۔ وہیں پہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ مسز وقار کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اوپر چلی گئی تھیں جبکہ اروٰی نارمل سے انداز میں سیڑھیاں چڑھتی ڈیزائنز کی فائل دیکھتی یہ بھی نہ جان سکی کہ کوئی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا ہے۔ چونکی تو وہ تب جب اس کے ہاتھ سے پھسلنے والا سی ڈیز کا البم کسی دوسرے ہاتھ نے بڑی تیزی سے تھام لیا تھا۔ اس ہاتھ کی مضبوطی اور کلائی پہ بندھی گھڑی اروٰی کو چونکا کے رکھ گئی تھی۔ اس نے کرنٹ کھا کے اس کی شکل دیکھی تھی۔

عارفین بہت ترسی ہوئی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عارفین کی نظریں بہت بے تابی سے اروٰی کے ایک ایک نقوش کو اپنے ہونٹوں سے چھو رہی تھیں۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دواڑھائی ماہ بعد دیکھ رہے تھے ورنہ تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا ہی گیپ آتا تھا۔

''کیسی ہو تم؟'' عارفین نے سی ڈیز کا البم اس کی سمت بڑھاتے ہوئے جس تشنہ سے انداز میں پوچھا تھا، اروٰی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے احساس کو محسوس کر گئی تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ اس کے ہاتھ سے البم لے کر دو لفظ میں بات ختم کر کے وہاں سے چلی گئی تھی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

''سر! چلیں؟'' عارفین کے پی اے نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا پھر میٹنگ ہال میں بھی سب کا دھیان دیوار پہ آن ہونے والے پروجیکٹر کی طرف تھا لیکن عارفین کی نظریں مسز وقار کو مشورے دیتی اور گائیڈ کرتی اروٰی حیات کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ میٹنگ ہال میں اندھیرا تھا، صرف پروجیکٹر کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بار بار بدلتے سین اس روشنی کو بھی بار بار بدل رہے تھے۔ آج کی اس تین گھنٹے کی میٹنگ میں کل بہت سے بلڈرز گروپ کو فائدہ ہونے والا تھا کیونکہ اسی میٹنگ کے تھرو ان کو نئے اور مضبوط ترین پاورفل کانٹریکٹ ملنے والے تھے۔ پورے تین گھنٹے کے بعد یہ میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچی تھی اور اگلی میٹنگ کل صبح بارہ بجے کے ٹائم پہ فکس کی گئی تھی۔ رات گئے وہ لوگ کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں واپس پہنچے تھے، سب ہی لوگ صبح سے تھکے ہوئے تھے، اس لئے جلدی سو گئے تھے۔

رات دو بجے کا وقت تھا، اروٰی کو سوئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوا تھا، وہ بے حد گہری نیند میں تھی جب دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ گہری نیند کی وجہ سے اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ پہلے پوچھ لے کہ دستک دینے والا کون ہے؟ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

''سر! آپ......'' عارفین کو اپنے سامنے دیکھ کر اروٰی کی نیند بھک سے اُڑ گئی تھی اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''ہاں میں، بہت دیر سے اپنے آپ کو روک رہا تھا کہ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں لیکن آج اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ کر دل چاہ رہا ہے تم سے بہت سی باتیں کروں اور تمہیں اپنا حال سناؤں۔'' عارفین اندر قدم رکھتے ہوئے بولا اور پھر دروازہ بند کر کے اروٰی کو بازو سے تھام کے صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔ وہ ہکا بکا سی حیرت سے گنگ ہو کے رہ گئی تھی۔

''لیکن سر......اس......اس......وقت......آپ......مم......میرے کمرے میں......''

اروٰی کے الفاظ بے ربط سے ہو گئے تھے۔

''اس وقت کے علاوہ فرصت بھی تو نہیں ہے تمہارے پاس۔ تم نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے، میرے پاس رہنا میرے سامنے آنا چھوڑ دیا ہے۔ خود بھی اکیلی ہو گئی ہو اور مجھے بھی اکیلا کر دیا ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اروٰی! پلیز ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا، کچھ احساس کرو میرا اور......اور محسوس کرو اپنے دل کی تڑپ کو۔'' عارفین ہمیشہ اروٰی کے سامنے اپنے کیس لڑتے لڑتے تھک سا جاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کی نظروں میں وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار تھا۔

"میں نے اپنے سینے میں دل ہی نہیں چھوڑا تو تڑپ کیسے محسوس کروں، کیسے سمجھوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور میں کیا چاہتی ہوں؟" وہ اپنا بازو چھڑا کے اس کے قریب سے اُٹھ گئی تھی۔

"تم بس دوسروں کی پروا میں نہ اپنا کچھ کرو گی اور نہ میرا کچھ ہونے دو گی۔"

وہ آج اس سے کافی خفگی بھرے شکوہ کناں لہجے میں بول رہا تھا۔

"میرا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب مزید کچھ کہنے اور کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔"

"لیکن اروی! تم یہ بھی تو سوچو، تم اپنی لاپروائی میں تین زندگیاں نظرانداز کر رہی ہو، تین زندگیوں کو اپنی سرد مہری کی بھینٹ چڑھا رہی ہو۔" عارفین نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کا رخ اپنی سمت موڑا تھا۔

"میں نے آج تک تیسری زندگی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ اگر کبھی سوچ لوں تو پھر کسی اور کے بارے میں "ہرگز نہیں" سوچوں گی۔ اس تیسری زندگی نے ہی تو میرے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہے۔ مجھے پتھر بنا دیا ہے اس کی تڑپ نے۔" بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، تھوڑی دیر پہلے وہ اس تیسری زندگی کو یاد کرتے ہوئے ہی سوئی تھی اور اب اسی کا ذکر عارفین کے منہ سے سن کر اس کا دل بھر آیا تھا اور آنکھوں کے کناروں پہ سسکتے آنسو ایسے بے ساختہ تھے کہ وہ روک بھی نہ پائی تھی۔

"اروی! میں تمہاری ہمت، تمہارا حوصلہ بڑھانے کو بات کرتا ہوں اور تم ہارے ہوئے لوگوں کی طرح آنسوؤں کو سہارا بنا لیتی ہو۔" عارفین نے اس کے آنسو پونچھے جو قطار در قطار بہتے چلے آ رہے تھے۔

"مجھ سے زیادہ ہارا ہوا اور کون ہوگا، میں نے ہی تو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہارا ہے۔ اپنا دل بیچا ہے، اپنا جسم بیچا ہے، اپنی ذات کا مان بیچا ہے میں نے۔ میں ایک بکی ہوئی ذات ہوں۔" وہ اتنے دنوں بعد زخم کریدے جانے پہ کچھ بکھر سی گئی تھی اور اس کو سنبھالتے سنبھالتے عارفین نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا تھا اور اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں وہ ٹوٹ کے روئی تھی۔ اس کے تمام حوصلے اور ہمتیں بھی ٹوٹ کے بکھرے تھے، اس کی ہچکیاں عارفین کے سینے میں اتر رہی تھیں۔

رات کے اس خاموش پہر وہ دونوں ایک دوسرے کی قربت میں بکھرے ایک

دوسرے کو سمیٹ رہے تھے۔ جہاں اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، وہیں عارفین کی دھڑکنیں اسے تھپک تھپک کر چپ کرا رہی تھیں۔ اسے دونوں بانہوں میں بھرے وہ بار بار اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں کی حدت بخش رہا تھا۔ عارفین کی انگلیاں اروی کے بالوں کو سہلا رہی تھیں اور کئی بامعنی اور بے نام سے خاموش لفظ ان دونوں کے درمیان گفتگو کا دائرہ کھینچ چکے تھے اور اس دائرے کے اثر میں یہ بات بہت پیچھے چلی گئی تھی کہ ان کی "حد" کہاں تک مقرر تھی اور مقررہ حد سے بڑھنا ان کے لئے ٹھیک بھی تھا یا نہیں؟ عارفین "ایسی" نیت سے بالکل نہیں آیا تھا مگر پھر بھی قربت ہی کچھ ایسی بن گئی تھی کہ وہ اروی سے "دور" نہیں رہ سکا تھا اور اپنی تنہائی اپنے دکھ پہ روتی اروی اسے روک ہی نہ پائی تھی اور وہ دونوں قربت کی دبیز گہری وادی میں اترتے چلے گئے تھے۔

دل و دماغ اور جسم کے تعلقات ایک ہی روپ ایک ہی سانچے میں ڈھل چکے تھے۔

یہاں پہ آ کر دماغ، دل اور دل جسم سے انکاری نہیں تھا بلکہ جو کچھ بھی تھا سب ٹھیک تھا یا پھر یہ کہ وہ "حق دار" تھے اس کے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

فجر کی اذان پہ اروی کی آنکھ کھل گئی تھی، اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر آس پاس کے ماحول کو سمجھنا چاہا تھا۔ شاید اسے ماحول کو سمجھنے میں کچھ اور دیر لگتی مگر قریب سوئے عارفین کے گرم جسم کی حدت اور سانسوں کے ارتعاش نے اسے بہت جلد سب کچھ سمجھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ یکدم اٹھنے لگی مگر عارفین کا بازو اس کے سینے پہ دراز تھا جب ہی اسے اٹھنے میں ٹائم لگ گیا تھا۔

"سر! پلیز مجھے اٹھنے دیں۔" اس نے آہستگی سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"ہوں، اٹھ جاؤ۔" وہ ایک بار زور سے اسے بانہوں میں بھینچ کر چھوڑتے ہوئے بولا تھا۔

"اروی بمشکل اپنے ریشمی گھنے بال سمیٹتی ہوئی بیڈ سے اٹھی تھی اور فوراً ہی باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ شاور لینے کے بعد وہ باہر نکلی تھی، اس کا ارادہ بال خشک کر کے وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا تھا، اسی لئے وہ پہلے بال سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اتنے میں اروی کے موبائل پہ فجر کی نماز کے لئے سیٹ الارم بج اٹھا تھا۔ اروی الارم بند کرنے کی غرض سے بیڈ سائیڈ کی طرف آئی تھی اور سائیڈ ٹیبل پہ دھرے موبائل سے الارم آف کر دیا تھا اور پھر موبائل واپس رکھتے رکھتے اس کی نظر عارفین کے موبائل پہ جا پڑی تھی۔ نہ جانے کس احساس کے تحت اس نے عارفین کا موبائل اٹھا لیا تھا۔ موبائل کے وال پیپر پہ حانی کی خوبصورت معصوم سی تصویر جگمگا رہی تھی۔ اروی کی

انگلیاں لرزتے ہوئے اس کے چہرے کو چھونے کی حسرت میں موبائل کی سکرین کو چھو رہی تھیں۔

"حانی......" اس کی آواز سرگوشی نما تھی لیکن لہجے میں بہت کچھ سمٹا ہوا تھا۔ بہت سے لمحے یونہی سرک گئے۔ وہ اور بھی کچھ دیر اسے دیکھتی رہتی لیکن دروازے پہ ہونے والی تیز اور زوردار دستک نے اسے دہلا کے رکھ دیا تھا۔ عارفین کا موبائل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا تھا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اروی کو پریشانی ہوئی تھی اور اتنی زوردار دستک پہ عارفین کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اٹھنے لگا مگر اروی نے اسے روک دیا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ صورتحال کی سنگینی سمجھتی تھی، اسے پتہ تھا کہ میرے کمرے میں عارفین شیرازی کا موجود ہونا کسی ویٹر کو بھی شک وشبہات میں ڈال سکتا ہے، اسی لئے اس نے عارفین کو روک کر خود باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ہول سے جھانک کر دیکھا، سامنے ہوٹل کا ویٹر کھڑا تھا۔ اروی نے مطمئن ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔

"جی کہیئے؟" اس نے اس وقت ویٹر کے آنے پہ حیرانی ظاہر کی تھی۔

"کہنے ہی تو آیا ہوں میڈم اروی حیات......" ویٹر کو سائیڈ پہ دھکیل کر جرار یکدم سامنے آیا تھا۔ اروی جرار کو دیکھ کر چکرا گئی تھی۔

"جرار......تم......" اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا اور جرار کچھ بھی سنے بغیر اروی کو دھکا دے کر اندر گھستا چلا گیا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

"عارفین شیرازی اپنی سابقہ پی اے اروی حیات کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔" کسی اخبار کے صحافی نے باآواز بلند اپنے اخبار کے لئے جملہ (سرخی) ترتیب دیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، کیا بے ہودگی ہے؟" عارفین نے یکدم اروی کو اپنے بازو کی اوٹ میں لیتے ہوئے ایک صحافی کے کیمرے کا نشانہ بننے سے بچایا تھا اور اس صحافی پہ کافی گرم ہوا تھا۔

"مسٹر شیرازی رات کے اس پہر آپ مس اروی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے، کیا پہلے بھی آپ لوگوں میں "ایسے ہی تعلقات" تھے؟ اگر آپ لوگ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے تو مس اروی حیات نے آپ کی جاب کیوں چھوڑی تھی؟"

بہت سے لوگ طرح طرح کے سوال کر رہے تھے اور اپنی سالوں سے سینت سینت کر رکھی عزت میڈیا والوں کی بھینٹ چڑھتے دیکھ کر اروی کے حواس کھونے لگے تھے۔ جرار

میڈیا والوں کو بڑھ چڑھ کے جوابات دے رہا تھا جبکہ اروی اور عارفین اپنا کوئی بھی اسٹیٹ منٹ ریکارڈ کروانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اروی کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے، وہ یکدم بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین بوس ہوئی تھی۔ لوگوں کا اتنا ہجوم دیکھ کر یہی لگ رہا تھا جیسے پورا اسلام آباد ایک جگہ ہی جمع ہو گیا تھا اور لوگوں کے انتہائی بے ہودہ کمنٹس سن کر عارفین کا خون کھول اُٹھا تھا۔ وہ یکدم دھاڑا تھا۔ اس کی دھاڑ بہت بلند تھی۔ اس نے بے ہوش پڑی اروی کو اٹھا کر بیڈ پہ ڈالتے ہوئے دل میں ایک فیصلہ کیا اور پھر سب کو خاموش کروا دیا تھا۔

"اروی حیات میری بیوی ہے۔ لہٰذا آپ لوگ اپنی زبان بند رکھیں اور یہاں سے دفع ہو جائیں۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کے بولا تھا اور وہاں موجود پورا ہجوم چونک گیا۔ تمام نیوز پیپرز اور نیوز چینلز والوں......میں ہلچل مچ گئی تھی اور ان لوگوں کی عزت کو داؤ پہ لگانے والا جرار، عارفین کے بیان پہ ہکا بکا رہ گیا تھا اور باہر شور کی آواز سن کر آنے والی مسز وقار بھی عارفین کی بات پہ حیران ہو گئی تھیں۔

"آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں اور اپنے کرتوت چھپانے کے لئے نکاح کا بہانا کر رہے ہیں۔" جرار یکدم تیزی سے سامنے آیا تھا۔ عارفین کا دل چاہا ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پہ دے مارے لیکن وہ اتنے لوگوں کے سامنے ایسی جذباتی حرکت بالکل نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ ان سب لوگوں کو رفتہ رفتہ پیچھے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا تھا اور ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ وہ لوگ اروی کو گندی نظروں اور بے ہودہ باتوں سے زیادہ تار تار نہ کریں۔

"کوئی بھی شریف لڑکی کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح رنگ رلیاں نہیں منا سکتی۔
اروی حیات رات کے اس پہر اگر میرے ساتھ ایک کمرے میں نظر آ رہی ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ میری بیوی ہے، ہم دونوں کا نکاح ہو چکا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں، ہم جب چاہے جہاں چاہے ایک ساتھ نظر آ سکتے ہیں۔" عارفین نے جرار کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا ثبوت ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں، نکاح کب ہوا تھا؟ کیا آپ کے گھر والے اس نکاح کے بارے میں جانتے ہیں؟" کیا اروی حیات کے گھر والوں کو پتہ ہے؟ آپ کا نکاح کس شہر میں ہوا تھا؟" ہر طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور عارفین ہوٹل کی راہداری میں کھڑا نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا، صرف اس لئے

کہ اروئی کے کردار پہ بدچلنی اور بدکاری کا داغ نہ آنے پائے۔

"ہمارا نکاح دو سال پہلے کراچی میں ہوا تھا، اس نکاح کے بارے میں میرے گھر والوں کو پتہ ہے اور ثبوت کے طور پر میں اپنے نکاح نامے کی فوٹو کاپی آپ لوگوں کو دکھا سکتا ہوں جو فی الحال میرے روم میں بریف کیس میں رکھی ہے۔" عارفین کا لہجہ مضبوط دوٹوک اور سچا کھرا تھا۔

"عارفین شیرازی جھوٹ بول رہا ہے۔" جرار زور سے چیخا تھا۔

"یہ اپنے ناجائز تعلقات کو جان بوجھ کر جائز تعلقات کا رنگ دے رہا ہے۔"

"شٹ اپ...... تم اپنی زبان بند رکھو، تم سے تو میں بعد میں نپٹوں گا۔" عارفین نے چبا کر کہا اور جرار کو انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی۔

"منیجر صاحب ہٹائیں ان سب کو ورنہ میں اس ہوٹل کے خلاف کیس کر دوں گا۔ آپ لوگ دوسروں کی پرائیویسی میں اس طرح انٹرفیئر کرتے ہیں؟" بالآخر وہ ہوٹل کے منیجر پہ چڑھ دوڑا تھا اور منیجر سچ مچ اپنے ہوٹل کی ریپوٹیشن خراب ہو جانے کے ڈر سے دباؤ میں آ گیا تھا اور فوراً ہی سیکیورٹی گارڈز طلب کیے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بمشکل وہاں سے ہجوم ہٹایا گیا تھا اور عارفین تیزی سے اندر اروئی کے پاس آیا وہ ابھی تک ہوش و خرد سے بیگانہ پڑی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو کال کی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ٹریٹ منٹ کے بعد وہ ہوش میں آئی تھی۔ تب تک رات ڈھل چکی تھی اور دن پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو چکا تھا اور ساتھ ہی اروئی کے سوئے ہوئے ذہن میں جھماکے ہونے لگے تھے۔

"اب کیسی طبیعت ہے اروئی؟" مسز وقار نے نرمی سے پوچھا تھا لیکن اروئی، عارفین کو سامنے دیکھ کر پھر سے حواس کھونے لگی تھی۔

"مم...... مجھے گھر جانا ہے......" اروئی کو یوں لگ رہا تھا، اگر ایک پل بھی وہ گھر سے دور رہی تو ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گی۔

"او کے، چلی جانا لیکن پہلے اپنے آپ کو سنبھالو، اپنی حالت دیکھو۔" پریشان چہرہ اور بھیگی آنکھیں اسے عجیب سا روپ دے رہے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں بس مجھے گھر جانے دیں، ورنہ...... ورنہ بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ پلیز میم...... مجھے گھر پہنچا دیں۔" وہ مسز وقار کے سامنے التجاءً کہہ رہی تھی۔ انہوں نے گردن موڑ کر عارفین کو دیکھا، وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر اروئی کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"دیکھو اروئی! جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے، تم ذرا تحمل سے سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ میں خود تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں گا اور تمہارے گھر والوں کو ساری بات تفصیل سے سمجھاؤں گا۔ تم پلیز حوصلے سے کام لو اور......"

"مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی، جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا ہے، میں ہمیشہ آپ سے کہتی تھی کہ مجھ سے دور رہیں ورنہ میں بدنام ہو جاؤں گی لیکن آپ نے کبھی میری بات سنی ہی نہیں۔ آپ نے میری عزت دوسروں کی بھینٹ چڑھا کر دم لیا ہے۔ اب میرے گھر والے کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے میرے بارے میں۔" وہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی۔

"اروئی! کچھ نہیں ہو گا، میں...... تمہارے ساتھ ہوں، میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔" عارفین نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ ڈالا لیکن اروئی نے یکدم ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

"میں کس منہ سے گھر جاؤں گی، کوئی میرا اعتبار نہیں کرے گا، کوئی میرا سچ نہیں سنے گا۔ میں سب کی نظروں میں بے اعتبار ہو گئی ہوں صرف آپ کی وجہ سے۔" وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی اور اس کی حالت کے پیش نظر عارفین نے کراچی کے دو ٹکٹ کنفرم کروا لئے تھے لیکن اروئی اس کے ساتھ جانے کا سن کر مزید بپھر گئی تھی، اسے پتہ تھا وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلیں گے میڈیا والے پھر سے مکھیوں کی طرح اکٹھے ہو جائیں گے، لہٰذا وہ ضد کر کے عارفین کی بجائے اکیلی ہی واپس آئی تھی لیکن اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ جن پہ مان ہو، وہی سب سے پہلے مان توڑتے ہیں۔

***

"دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ مرے مرے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن امی نے دو ہنٹر مارتے ہوئے اسے صحن سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

"امی......" اروئی کی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"مر گئی تمہاری امی، قتل کر دیا تم نے ہم سب کو، زندہ درگور کر دیا ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا ہم کو۔ آج جگہ جگہ ہمارے گھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خاک ڈالی ہے تم نے مرے ہوئے باپ کی عزت اور نام پہ۔" امی کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"امی! پلیز میری بات تو سن لیں، پہلے مجھ سے تو کچھ پوچھ لیں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"تم سے کیا پوچھوں، یہی کہ تو اتنا عرصہ اس شخص کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی

ہے، ہمیں دھوکہ دیتی رہی ہے، اپنی حرام کی کمائی ہماری رگوں میں اتارتی رہی ہے، ایک شادی شدہ مرد کی......"

"پلیز امی پلیز اللہ کے لئے ایسا کچھ مت کہیں، پہلے میری بات تو سن لیں۔ پلیز امی! ایسا کچھ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"اچھا...... اچھا ابھی بھی ہم ہی سمجھ رہے ہیں، گویا ہمارا ہی قصور ہے؟ واہ کتنی دیدہ دلیری ہے میڈم کی؟" ثمینہ بھابی لپک کے میدان میں آئی تھیں۔

"بھابی پلیز میرا کسی کے ساتھ کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ ہمارا نکاح ہوا تھا، ہم نے شادی کی تھی۔" اروی کے صفائی دینے پہ ثمینہ بھابی تمسخرانہ انداز میں قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں۔

"یعنی چوری چوری نکاح بھی کر لیا اور ہمیں بتایا بھی نہیں؟ لگتا ہے بڑی جلدی تھی تمہیں شادی کی۔" انہوں نے مزید طنز کے تیر چھوڑے تھے، اروی چپ سی ہو گئی۔

"اونہہ...... خود نیک پاک باز بی بی دوسروں کے شوہروں کے ساتھ زنا کا کھیل کھیلتی پھر رہی ہے اور الزام دے رہی تھی میرے بھائی کو۔ اگر اتنا ہی شوق تھا کسی کے ساتھ ہوٹلوں میں...... گلچھرے اڑانے کا تو جرار کو بتا دیتی، وہ آئے روز تمہیں ساتھ لئے پھرتا۔ ویسے کتنے عرصے سے دل بہلا رہی ہو عارفین شیرازی کا؟" بھابی کے تیز نوکیلے جملے نے اس کا کلیجہ چھلنی کر ڈالا تھا، اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں کی سمت دیکھا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی بے غیرت اولاد پہ جس نے پورے خاندان کا منہ کالا کر دیا ہے۔" امی کہہ کے رخ موڑ گئی تھیں۔

"پلیز امی! ایک بار یہ تو دیکھ لیں کہ میرا قصور کہاں ہے؟" وہ لپک کے ماں کے سامنے آئی تھی۔

"ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔" انہوں نے یکدم پورے زور سے تھپڑ اس کے چہرے پہ دے مارا تھا۔ بھابی کے سینے میں پھوار برسی تھی۔

"ثمینہ...... سارہ...... اسے کہو ہمارے گھر سے اپنا گندہ غلیظ وجود لے کر نکل جائے۔" امی آخری بار سفاکی سے کہتی ہوئیں اندر کمرے میں بند ہو گئیں۔ اروی نے سب سے مایوس ہو کر آخری بار بہروز بھائی کے کندھے کا سہارا لیا تھا۔

"بھائی...... آپ...... آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں، آپ...... آپ تو مجھ سے منہ نہ

موڑیں...... آپ تو مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتے ہیں نا؟ بھائی میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھ پہ شک نہ کریں، میں بدچلن، بدکردار نہیں ہوں۔ میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ عارفین شیرازی میرا شوہر ہے، نکاح کیا ہے اس نے مجھ سے۔" وہ روتے ہوئے ان کا کندھا پکڑے کہہ رہی تھی۔

"کاش...... یہ سب سننے سے پہلے میں مر جاتا، کاش میں اس وقت ہی مر گیا ہوتا جب موت میرے سر پہ لٹک رہی تھی، میں یہ دن دیکھنے کے لئے کیوں زندہ بچ گیا۔" بہروز بھائی اروی کا ہاتھ کندھے سے ہٹاتے ہوئے رو پڑے تھے اور اروی اُن کی بات سن کر ساکت ہو گئی تھی، اس کی ساری امیدیں پانی میں بہہ گئی تھیں، اس کے سارے مان شیشے کی طرح ٹوٹ گئے تھے، اس کا سارا یقین ریت کی مانند بکھر گیا تھا، وہ اتنے سارے اپنوں میں تنہا رہ گئی تھی، وہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح کھڑی تھی، اس کے بھائی نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔ اس کی بہن اس سے دور خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی، اس کی ماں اس سے منہ پھیر کر اندر چلی گئی تھی اور اس کی بھابی اسے دھکا دے کر گھر سے نکالنے کے لئے تیار کھڑی تھی اور اب اتنا کچھ ہونے اور اتنا کچھ سننے کے بعد اس گھر میں اس کے لئے کیا بچا تھا؟ نفرت، حقارت اور بے رخی...... کیا وہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اس گھر میں رہ سکتی تھی؟ ان لوگوں کے ساتھ پہلے کی طرح جی سکتی تھی؟ ہرگز نہیں...... گیا وقت کبھی لوٹ کے نہیں آتا، اسی طرح کسی کی نظروں سے گرنے والا گر کر سنبھل نہیں پاتا، سو اروی حیات بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی بلکہ اگر وہ رہنا چاہتی بھی تو اسے اس گھر میں کوئی بھی رکھنے پہ آمادہ نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا اسے یہ گھر چھوڑنا ہی تھا اور اس نے یہ گھر چھوڑ دیا تھا، وہ چپکے سے سسکیاں بھرتی پلٹ پلٹ کر اپنے گھر کو اور گھر کے مکینوں کو دیکھتی اس آس پہ دہلیز پار کر گئی کہ شاید اسے کوئی روک لے، شاید اس کا کوئی اپنا اس کا احساس کر بیٹھے مگر اس کی آس بھی اس طرح ٹوٹی تھی جیسے اس کا مان ٹوٹا تھا، نہ کسی نے اسے پکارا، نہ کسی نے اسے روکا تھا، وہ بہت خاموشی سے اپنے گھر اور گلی سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔

نہ جانے کب سے وہ پیدل چل رہی تھی اور نہ جانے کب سے اس کا راستہ، اس کی مسافتیں طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھیں، وہ ایک قدم بڑھتی تھی اور دس قدم پیچھے سرک جانے کا احساس ہوتا تھا۔ دکھ، بے بسی، تنہائی اور اذیت کے رنگ میں ڈھلی شام گہری ہوتی جا رہی تھی، اس کائنات کے کتنے ہی پنکھ پکھیرو اپنے اپنے گھروں کو اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ

رہے تھے اور ایک وہ تھی جو گھر سے ہی دور جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ ابھی تک اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔ بس قدم اٹھ رہے تھے اور وہ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ کہاں پہنچی اسے خود اندازہ نہ ہو سکا تھا لیکن چوکیدار اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔

''سوری میم! صاحب تو گھر پہ نہیں ہیں۔'' اسے عارفین کے در پہ دستک دینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ''کب آئیں گے؟'' اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ سوال پوچھتی، بس سوالیہ نظروں سے دیکھ پائی تھی اور چوکیدار کا جواب سن کر مزید بے بس ہو گئی تھی۔

''کچھ پتہ نہیں میم! کب آئیں گے۔ میرا تو خیال ہے کام ختم کر کے ہی آئیں گے۔ آپ کو جو کام ہے بتا دو، میں بتا دوں گا صاحب کو۔'' چوکیدار نے کافی عزت سے کہا تھا۔

''نہیں، کوئی کام نہیں ہے مجھے۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی دوپٹے سے چہرہ پونچھتی واپس مڑی، اتنے میں بے حد قریب ہی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔

''اوہ مس اروی حیات آئی ہیں؟'' زونیلہ اور رابعہ شیرازی اسے دیکھتے ہی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔ اروی کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ یعنی ابھی اور اذیت کا بوجھ سہارنا تھا۔

''کیوں آئی ہو یہاں؟'' رابعہ شیرازی غرائی تھیں۔ ''مم...... میں ایک بار سر سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اروی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ان لوگوں کی بمباری کا سامنا یا پھر مقابلہ کر پاتی۔

''بے غیرت لڑکی تمہیں اتنی بھی شرم نہیں کہ جس شخص کے ساتھ پورے میڈیا کے سامنے رنگے ہاتھوں رنگ رلیاں مناتی اور منہ کالا کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو، کم از کم ایک دو دن اس شخص سے دور رہو۔ نہ جانے کس بے غیرت خاندان سے ہو۔ کیا تمہارے بھائی نے تمہیں حرام کرنے کے لئے پھر سے آزاد چھوڑ دیا ہے۔؟ تمہاری اس شریف عزت دار ماں نے بھی تمہیں عزت اور غیرت کا درس نہیں دیا؟ ہونہہ کنگال خاندان کی بکاؤ لڑکی۔ آخر پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتی میرے بیٹے کا۔ اتنا کچھ پہلے لوٹ چکی ہو، اب کیا باقی ہے؟ عارفین کے ساتھ ہوٹل میں رات گزارنے کا کتنا معاوضہ لیا تھا کل رات؟ اگر اور پیسے کی ضرورت ہے تو آج کی رات ہمارے اس چوکیدار یا ڈرائیور کے ساتھ گزار لینا، پیسہ میں دے دوں گی۔ تمہارا بھی کام بن جائے گا اور ان بے چاروں کا بھی۔ وہ بھی چھڑے چھانٹ گھوم رہے ہیں۔'' اروی پتھر کا بت تھی اور رابعہ شیرازی شعلے اُگلتی آگ کی بھٹی بنی ہوئی تھیں۔ وہ سو غلیظ الفاظ بول چکی تھیں اور وہ ایک گہری قیامت خیز چپ لئے کھڑی تھی۔

''آج تو میں تمہیں نظر انداز کر رہی ہوں مگر آئندہ تم شیرازی ہاؤس کے آس پاس

بھی نظر آئیں تو اچھا نہیں ہو گا۔ ہونہہ منحوس نے اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب دینا پڑ رہے ہیں۔'' وہ بکتی جھکتی ہوئیں پھر سے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ چوکیدار نے ان کے اندر جانے کے لئے گیٹ کھول دیا تھا اور اروی کسی روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی روڈ پہ آ گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں کو گھسیٹتی بہت ہی آہستہ روی سے چل رہی تھی لیکن اتنا سب کچھ سہنے کے بعد وہ بھلا اور کتنا چل سکتی تھی۔ اپنی تذلیل، اپنی ہتک اور اپنا دکھ سوچتے ہوئے وہ بُری طرح چکرا گئی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ لہرا کر سڑک کے بیچوں بیچ آ گری تھی اور انتہائی قریب آ جانے والی گاڑی کے بمشکل بریک لگے تھے اور پھر اس گاڑی سے ایک بے حد معزز اور پردہ دار خاتون بڑی تیزی سے باہر نکلی تھیں جنہوں نے اروی کا سر قریب بیٹھتے ہوئے اپنی گود میں رکھ لیا تھا لیکن اس کا جسم بے جان سا ہو رہا تھا، لہٰذا اپنے ڈرائیور اور اپنی ایک خاص ملازمہ کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئی تھیں اور کچھ دور ہی عارفین اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے ہارن دے رہا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا تو وہ فوراً ہی گاڑی اندر لے آیا تھا، یہ جانے بغیر کہ باہر کچھ فاصلے پہ اروی کو سڑک پہ بے ہوش چھوڑ آیا ہے اور اسے کون کہاں لے گیا ہے؟ یہ بھی خبر نہیں ہوئی تھی؟

وہ بہت دیر بعد ہوش میں آئی تھی لیکن ہوش میں آنے کے بعد وہ نہ جانے کتنی دیر خاموش پڑی یک ٹک ہسپتال کی چھت کو دیکھے گئی تھی اور ساتھ ہی ساکت نظروں سے آنسوؤں کا پانی بہتا رہا۔ رخسار بھیگے ہوئے تھے، پلکیں جڑی ہوئی تھیں، ہونٹ خاموش تھے اور زبان گنگ تھی لیکن پھر بھی آنکھوں کا پانی ایک جھیل بنا رہا تھا جس میں اروی کے دکھ اس کی کم مائیگی صاف شفاف منظر کی طرح نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا، تم اتنی دیر سے روئے جا رہی ہو، کیا کوئی نقصان ہو گیا ہے تمہارا؟'' وہ خاتون بالآخر خود ہی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھیں۔

''میرا نقصان......؟'' اس نے اس لفظ کو دہراتے ہوئے اپنے دل میں جھانکا تھا جو پہلے ہی نقصان زدہ تھا جس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا جو خالی تھا بالکل خالی۔ خالی ہاتھ، خالی دامن، خالی دل اور خالی ذہن۔ نقصان کی دیواریں اس کے آس پاس سر بلند کھڑی تھیں اور وہ نقصان میں بال بال ڈوبا ہوا تھا۔

"بولو نا بیٹا! کیا بات ہے، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" انہوں نے دوبارہ پوچھتے ہوئے اروی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیشانی پہ آئے بال پیچھے ہٹائے تھے۔

"کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟" اروی زیرِ لب بڑبڑائی تھی اور سوچ کے ساتھ ساتھ احساسات بھی بہت پیچھے چلے گئے تھے۔ زبان سے وہ کچھ نہیں بول پائی تھی مگر ایک روانی سے بہتے آنسو خود غم کی داستان بنے ہوئے تھے۔ اروی کا نقصان ایسا تھا جو وہ کسی کو سنا نہیں سکتی تھی، بس سوچ سوچ کر خود رو سکتی تھی، تڑپ سکتی تھی لیکن بیان نہیں کر سکتی تھی۔

سُر میں، رت میں، ڈھول، تاشوں میں بٹ گئے
ہم جیسے لوگ کھیل تماشوں میں بٹ گئے
پھول سے چوٹ کھائی تو پتھر بنے جمیل
پتھر بنے تو سنگ تراشوں میں بٹ گئے!

⊛......⊛......⊛

"بھائی پلیز پانچ منٹ، میں بس اسکارف لے لوں۔" بہروز بھائی کو بائیک سٹارٹ کرتے دیکھ کر اروی تیزی سے چائے کا کپ رکھ کر اندر کو بھاگی تھی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ بہروز بھائی کو دروازے میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے سے کتنی چڑ اور کتنی کوفت ہوتی ہے۔

"جلدی کرو اروی......" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ وہ فوراً ہی باہر نکل آئی تھی۔ امی نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اروی کے بیٹھتے ہی انہوں نے بائیک آگے بڑھا لی تھی۔

"پتہ نہیں بی بی کا یہ پڑھنا پڑھانا کب تک جاری رہے گا؟ بھابی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی سونیا کو فیڈر پلانے لگیں۔

"دیکھو ثمینہ! صبح صبح ہی ان کے گھر سے نکلتے ہی شروع نہ ہو جایا کرو۔ اپنے بھائی، اپنے ماں جائے کی کمائی پہ پڑھ رہی ہیں، تمہارے یا تمہارے گھر والوں کی کمائی پہ نہیں۔" امی نے کبھی بھی یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ اپنی بہو کے ساتھ روایتی ساس جیسا سلوک کریں لیکن ان کی بہو نہ جانے کیوں روایتی بہو بننے کے چکروں میں ہی رہتی تھی۔

"میرے شوہر کی کمائی تو ہے نا؟" وہ تنک کے بولی تھیں۔

"تمہارا شوہر بعد میں پہلے وہ ان کا بھائی ہے۔" امی نے بھی برجستہ جواب دیا تھا۔

"بھائی تو ہے، کیا اپنے بچوں کا باپ نہیں ہے؟ کل سے کہہ رہی ہوں سونیا کا نیا فیڈر

اور پمپر لانے...... ہیں لیکن انہیں خبر ہی نہیں ہے، ابھی کوئی بہن کہہ دے گی کہ مجھے فلاں کتاب چاہئے، مجھے فلاں فیس دینی ہے تو فوراً اس چیز کے پیچھے لگ جائیں گے۔"

"ثمینہ کیوں ذرا ذرا سی بات پہ لڑائی جھگڑے کے بہانے ڈھونڈتی ہو، تم نے اسے کل ان چیزوں کا کہا تھا اور مجھے پتہ ہے آج وہ واپسی پہ سب کچھ لے آئے گا۔" امی نے غصہ چھوڑ کر افسوس بھرے انداز میں کہا تھا لیکن ثمینہ بھابی کوئی بھی نوٹس لئے بغیر اندر چلی گئی تھیں۔

⊛......⊛......⊛

"صاحب جی! آپ کے بابا جان آئے ہیں، نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" عارفین گہری پرسکون نیند سو رہا تھا، جب ملازمہ کے دستک دے کر جگانے پہ فوراً اٹھ گیا تھا۔

"اوہ آج سنڈے ہے، بابا جان نے اپنے آنے کا بتایا بھی تھا لیکن پھر بھی یاد نہیں رہا۔" وہ ملازمہ کی موجودگی میں ہی بڑبڑاتا ہوا اپنے آپ کو سرزنش کرتا باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ ملازمہ پلٹ کر واپس چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ عجلت میں تیار ہو کر نیچے آ گیا تھا۔ بابا جان لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"السلام علیکم بابا جان!" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑے جاندار سے انداز میں سلام کیا تھا۔

"والسلام بیٹا...... آؤ آؤ...... ڈسٹرب تو نہیں کیا ہم نے؟" وہ اخبار رول کر کے ایک سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بہت محبت پاش لہجے میں بولے تھے۔

"ارے نہیں بابا جان! ڈسٹربنس کیسی۔ مجھے پتہ تھا آج آپ آنے والے ہیں لیکن کام کے دوران کچھ تھکن ہو گئی تھی، اس لئے گہری نیند آئی تھی اور صبح اٹھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔" وہ بابا جان سے مل کر ان کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں یار! یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یار! بیوی کے ہوتے ہوئے نہ تو بندے کو تھکن ہو سکتی ہے اور نہ گہری نیند آ سکتی ہے۔" بابا جان نے پہلی بار شاید اس کے ساتھ ایسا ذومعنی مذاق کیا تھا جس کو سمجھ کر عارفین یکدم قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"واہ گریٹ بابا جان! لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ بیوی آپ کے پاس ہو۔"

"کیوں، کہاں ہے زوئلہ؟" بابا جان نے چونک کر پوچھا تھا۔

"اس کے چچا زاد کزن کی شادی ہے، وہ مما کے ساتھ اسلام آباد گئی ہے۔" عارفین

نے کندھے اچکائے کیونکہ وہ کبھی کسی اور طرح کی باریکیوں میں نہیں گیا تھا یا پھر زونلہ جو ہے، جیسی ہے، وہ اسے ویسے ہی دیکھتا تھا۔ کبھی کھوجنے اور پرکھنے کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

''تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے عارفین!'' اب کی بار بابا جان کا لہجہ کچھ دھیما اور ٹھہرا ہوا تھا اور لہجے میں ایک حسرت بسی ہوئی تھی۔

''تقریباً پانچ سال ہو گئے ہیں۔'' عارفین نے بھی کچھ ٹھہر کر ہی جواب دیا تھا کیونکہ وہ ان کے سوال کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔

''عارفین! تم جوان ہو، تم دنیا کے ہنگاموں میں مصروف ہو، تم جاننے والوں اور ملنے والوں میں گم ہو لیکن ایک وقت وہ بھی آئے گا جب تم جوان نہیں رہو گے، جب دنیا کے ہنگاموں سے بے زار ہو جاؤ گے، جب ملنے ملانے والے آنکھیں پھیر لیں گے، تب تمہیں صرف ایک چیز کی کمی کا احساس ہو گا اولاد کا۔ اولاد انسان کا سرمایہ ہوتی ہے، پوری زندگی کی جمع پونجی...... اور تم جانتے ہو انسان کا سرمایہ پھر جمع پونجی مشکل وقت میں ہی کام آتی ہیں اور اگر کام نہ بھی آئے، دل کو تو سکون دے ہی سکتی ہے نا؟ اور پھر سب سے بڑھ کر جو اہم چیز ہے کہ تمہاری اولاد تمہارا نام زندہ رکھتی ہے، تمہاری نسل قائم رہتی ہے۔ بیٹا میری اولاد میرا بیٹا نہیں بن سکا لیکن مجھے اپنی جمع پونجی پہ ابھی بھی بڑا مان ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ نہیں تم تو ہو۔ تم تو میرے ہی بنو گے نا؟ اور تمہارے حوالے سے بس یہی خواہش ہے کہ تم جلد سے جلد صاحب اولاد ہو جاؤ۔ بیٹا اللہ کے لئے اپنا نہیں تو ہمارا ہی کچھ خیال کر لو، ہم اپنے ویران گلشن میں بہار چاہتے ہیں اور اس بہار کی بنیاد تم رکھ سکتے ہو صرف تم۔ بیٹا! ہم زندگی میں بہت سے دکھ بہت سے دھچکے سہہ چکے ہیں، اب کچھ اور سہنے کی ہمت اور سکت نہیں ہے۔ تمہاری بیوی آج کل کی ماڈرن بیوی ہے، وہ کبھی بھی خود سے اس چیز کی کمی کا اظہار کرے گی نہ ہی احساس کرے گی۔ ہماری خوشیوں اور اپنی نسل اور نام کے متعلق تمہیں خود سوچنا ہو گا، اگر وہ بیمار ہے تو اس کا کسی ماہر لیڈی ڈاکٹر سے علاج کرواؤ اور اگر ٹھیک ہے تو اسے اس چیز کی طرف مائل کرو۔'' بابا جان اور بی بی جان اکثر اپنی یہ خواہش ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کرتے رہتے تھے لیکن عارفین نے کبھی خاص طور پر اس چیز کی طرف دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب اسے کچھ عرصہ سے سچ مچ ان کی خواہش ان کی بات کا احساس ذرا گہرائی سے ہونے لگا تھا اور اس نے زونلہ سے ذکر بھی کیا تھا مگر زونلہ نے بات ٹال دی اور زونلہ اکثر بے حد اہم کام بھی اگنور کر جاتی تھی، صرف اپنی (خالہ) رابعہ شیرازی کی شہہ پہ......

کیونکہ اسے پتہ تھا کہ میرے اچھے برے کی پشت پناہی کرنے کے لئے وہ موجود ہیں۔

''جی بابا جان! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن سب سے پہلے تو اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی اور میری خواہش پوری کرے اور ہماری دعا قبول کرے۔'' عارفین نے انہیں تسلی دی تھی اور وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

''جیتے رہو بیٹا! اللہ تمہارا نام و نشان سلامت رکھے، آباد رکھے۔'' انہوں نے اس کے کندھے پہ تھپکی دی تھی۔

''خیر آپ سنائیں لنچ میں کیا لیں گے۔'' عارفین نے ٹائم دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آج ہم دادا، پوتا لنچ باہر کریں گے۔'' بابا جان نے خوشگوار موڈ میں کہا تھا۔

''اوہ لگتا ہے آج بی بی جان نے بہت اچھے موڈ میں رخصت کیا تھا آپ کو۔'' اس نے چھیڑا تھا ان کو، جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے۔ کھڑے ہو گئے تھے اور عارفین بھی ان کے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔

''بی بی جان اور مہر النساء آنٹی کیسی ہیں؟'' اس نے گاڑی نکالتے ہوئے سب کا حال چال پوچھا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے تمہاری بی بی جان تو ٹھیک ہیں لیکن مہر النساء بہت دنوں سے بیمار ہے۔ پہلے بخار ہو گیا پھر کمزور اور نقاہت کی وجہ سے اس کا بی پی لو رہنے لگا ہے اور بے چاری کی دونوں بچیاں ماں کے لئے بے حد پریشان ہیں۔ اللہ ان کے بھی نیک نصیب کرے۔ مہر النساء بیٹیوں کی طرف سے بھی بہت فکر مند رہتی ہے، ہم نے تو بہت کوشش کی تھی لیکن......'' بابا جان ادھوری بات چھوڑتے ہوئے چپ سے ہو گئے تھے اور عارفین بھی خاموش ہو گیا۔ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بابا جان کی خواہش کیا تھی؟ وہ شروع سے ہی عارفین کی شادی مہر النساء کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے لیکن رابعہ شیرازی کو مہر النساء کی بیٹی کا سن کر آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے نے عارفین کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر شادی کی حامی نہ بھرے۔ اس کی شادی اس کی خالہ زاد کزن زونلہ کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ زونلہ اچھی تھی، خوبصورت تھی، ماڈرن اور پڑھی لکھی تھی لیکن اس سب کے باوجود ان دونوں میں انڈرسٹینڈنگ نہیں تھی۔ کوئی ہلچل مچانے والا، کوئی بے چین کرنے والا جذبہ نہیں تھا وہ صرف کزن تھے اور کزن سے آگے کچھ نہیں تھے لیکن رابعہ شیرازی انہیں کزن کے رشتے سے بہت آگے لے آئی تھیں۔ انہوں نے عارفین سے اور بابا جان سے کچھ

بھی پوچھے بغیر اس کی انگیج منٹ کا اعلان کر دیا تھا اور وہ لوگ بس دیکھتے رہ گئے تھے۔ مہمانوں کو بھی انوائٹ کیا جا چکا تھا، لہٰذا عارفین کے اعتراض کرنے کے یا کچھ کہنے کے تمام چانسز ختم ہو چکے تھے۔ البتہ بابا جان اور رابعہ شیرازی آپس میں خوب گرم ہوئے تھے۔

''ہمارے پوتے کی شادی تم ہم سے پوچھے بغیر ہم سے اجازت لئے بغیر کیسے طے کر سکتی ہو؟'' بابا جان کی آواز غصے سے لرز رہی تھی اور آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔

''وہ آپ کا پوتا ہی نہیں، میرا بیٹا بھی ہے۔ میں اس کی زندگی کے حوالے سے جو چاہے طے کر سکتی ہوں۔'' رابعہ شیرازی کا لہجہ بھی کافی گرمی لئے ہوئے تھا، آواز بہت بلند تھی۔

''کس چیز کے بل بوتے پہ ایسا کر سکتی ہو؟ ہم اگر چاہیں تو ابھی کھڑے کھڑے تمہیں تمہاری اوقات دکھا سکتے ہیں۔ تم اگر ابھی تک ہماری بہو کے نام سے پہچانی جا رہی ہو تو صرف اس کی وجہ سے...... ہمیں اپنے پوتے کی وجہ سے تمہیں برداشت کرنا پڑ رہا ہے، ہم صرف اپنے بیٹے کی اولاد کی خاطر تمہیں جھیل رہے ہیں ورنہ تم نے کونسا سکون دیا تھا ہمارے بیٹے کو جو تم ہمیں بھی دو گی؟'' بابا جان نہ جانے کب سے بھرے بیٹھے تھے فوراً غصے میں سب کچھ کہہ گئے تھے۔ رابعہ شیرازی پل میں ٹھٹکی تھیں لیکن پل میں سنبھل بھی گئی تھیں۔

''آپ کا بیٹا کہیں مر کھپ گیا ہے تو اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں؟ اور آپ مجھے جھیلنے کا احسان مت کریں، میں آج بھی یہ گھر چھوڑ کر جا سکتی ہوں۔ آپ اپنا پوتا اپنے پاس رکھیں۔'' رابعہ شیرازی ہمیشہ جیسے ایموشنل ہتھیاروں پہ اتر آئی تھیں اور عارفین گھبرا گیا تھا۔ وہ بچپن سے باپ کی گمنامی کا صدمہ سہتا آ رہا تھا۔ اب ماں کی ناراضی نہیں سہہ سکتا تھا، لہٰذا بابا جان کو ٹھنڈا کرنے کے بعد رابعہ شیرازی کو جانے سے روکا تھا، چونکہ مہمان وغیرہ انوائٹڈ تھے۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں، اس لئے بابا جان کی خفگی کے باوجود انگیج منٹ ہو گئی تھی اور تین ماہ بعد شادی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ رابعہ شیرازی نے شادی اور انگیج منٹ میں سب کو انوائٹ کیا تھا، سوائے مہر النساء کے۔ مہر النساء رابعہ شیرازی کے سینے میں گولی کی طرح لگتی تھیں، ان کا نام ہی رابعہ شیرازی کو آگ لگا کے رکھ جاتا تھا۔ حالانکہ مہر النساء نے کبھی اس کے بارے میں بُرا نہیں سوچا تھا، وہ ہمیشہ انہیں ''رابعہ باجی'' یا پھر ''رابعہ بہن'' ہی کہہ کر بلاتی تھیں لیکن ''رابعہ بہن'' ہر لمحے انگارے چبائے رکھتی تھیں اور دونوں کی شخصیت کا موازنہ کرتے کرتے عارفین پہ ادراک ہوا تھا کہ مہر النساء آنٹی کے سامنے اس کی ماں کچھ بھی نہیں ہے۔

''کہاں کھوئے ہو پتر جی! ہم ہوٹل آ چکے ہیں۔'' بابا جان نے عارفین کو کسی سوچ میں محو دیکھ کر متوجہ کیا تھا۔

''جی بابا جان! آیئے۔'' وہ چونکتے ہوئے فوراً ہی حواسوں میں لوٹ آیا تھا اور بابا جان کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے باتوں کے دوران اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کیا کچھ سوچ رہا تھا؟

❖......❖......❖

''بہروز تم سے بات کرنا تھی بیٹا۔'' بہروز بھائی نہا کر باہر نکلے تو امی نے انہیں پاس بلا لیا تھا۔

''جی امی! کہیئے کیا بات کرنا تھی؟'' وہ اپنی قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے امی کے قریب ہی برآمدے میں رکھی کرسی پہ بیٹھ گئے تھے۔

''وہ یسری کے سسرال والے شادی کرنا چاہ رہے ہیں، نکاح تو پہلے ہی ہو چکا ہے، اس لئے ہم زیادہ انکار بھی نہیں کر سکتے، بُرا لگے گا اس طرح۔'' امی شش و پنج میں مبتلا تھیں لیکن بہروز بھائی ریلیکس ہی تھے۔

''انکار کرنا بھی کیوں ہے امی! ہم ابھی سے شادی کی تیاریاں شروع کر لیتے ہیں۔''

''لیکن بیٹا شادی کے لیے اتنی رقم؟'' وہ جس چیز کے لیے فکر مند تھیں، انہوں نے کہہ ہی دیا تھا، انہیں پتا تھا ان کا صرف ایک ہی بیٹا ہے اور اس پہ پورے گھر کے ساتھ ساتھ تین بہنوں کا بھی بوجھ ہے اور اب تو بہنوں کے ساتھ اس کی اپنی بیٹی بھی اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر چکی تھی۔

''امی سب کچھ بھول کر صرف اللہ پہ بھروسہ رکھیں، وہ سب اچھا کرے گا۔ آپ رقم کی فکر نہ کریں، میں کافی عرصہ سے یسری کے لئے کچھ نہ کچھ بچا رہا تھا۔ کل ہی آپ کو بینک سے وہ رقم لا دوں گا، اگر اور ضرورت پڑی تو اپنے باس سے کچھ رقم ایڈوانس لے لوں گا۔ یسری کے فرض سے فارغ ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ اروی کے لئے سوچنا شروع کر دوں گا۔ باری باری سب کو ان کا لکھا مل ہی جائے گا۔'' بہروز بھائی نے امی کی پریشانی بیٹھے بیٹھے حل کر ڈالی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اپنے اتنے اچھے سعادت مند اور سمجھ دار بیٹے کا ماتھا چوم لیا تھا اور پھر اگلے ہی روز انہوں نے رقم لا کر ماں کے ہاتھ پہ رکھ دی تھی۔ شادی کے لئے چھوٹے موٹے جہیز اور ضروری اشیاء کی شاپنگ شروع ہو گئی تھی۔ یسری تو شرمائی شرمائی رہتی تھی، البتہ اروی اور سارہ

خوب انجوائے کر رہی تھیں۔ انہوں نے رفتہ رفتہ سب کچھ کمپلیٹ کرلیا تھا۔ بس اپنی شاپنگ رہ گئی اور وہ بھی اس لئے رہ گئی تھی کہ وہ لوگ فرصت سے یہ کام کرنا چاہتی تھیں۔

''میں فی الحال بچے نہیں چاہتی۔'' عارفین نے پہلے بار اس چیز کا واضح اظہار کیا تھا۔ لیکن زوئلہ نے فوراً انکار تھما دیا تھا۔

''لیکن میں چاہتا ہوں ہماری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں زوئلہ اور کتنا انتظار کروں، کیا تمہیں خود اس کمی کا احساس نہیں ہوتا؟'' عارفین، زوئلہ کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''کمی کیسی عارفین! تم اپنی زندگی میں خوش ہو، مگن ہو، میں اپنی زندگی میں خوش ہوں۔ پھر کمی کس چیز کی ہوئی بھلا؟ یہ بچوں کے لئے تو زندگی پڑی ہے، ابھی سے کیوں اپنا اتنا خوبصورت فگر خراب کرلوں؟'' زوئلہ نے اپنے سراپے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں فگر خراب ہونے کی فکر ہے، لیکن ہماری زندگی خراب ہونے کی فکر نہیں ہے؟ اولاد انسان کے لئے نام ہوتی ہے، نشان ہوتی ہے، آئندہ کی نسل اور اپنے دل کے لئے سکون ہوتی ہے...... کہتے ہیں عورت ماں بننے کے بعد ہی مکمل عورت بنتی ہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہاری ذات بھی مکمل ہو؟'' عارفین آج دلائل سے پیش آ رہا تھا۔

''یہ بس دقیانوسی باتیں ہیں، میں نہیں مانتی ان چیزوں کو آج کل کے دور میں کوئی چیز ضروری نہیں ہے، بس انسان کی اپنی ذات ہی اپنے لئے کافی ہے۔'' زوئلہ کی بات پہ عارفین چند لمحے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا تھا۔ ''میں ڈاکٹر فائزہ سے کل کے لئے ٹائم لے چکا ہوں، تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' وہ اس کو بتا کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا، لیکن زوئلہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

''مام دیکھئے نا عارفین کیا کہہ رہے ہیں؟'' زوئلہ رابعہ شیرازی کے بازو سے جا لگی تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے عارفین؟'' انہوں نے لاڈ سے بھانجی کے بال سنوارے۔

''یہ ڈاکٹر سے ٹائم لے کر آئے ہیں، انہیں بچوں کی ضرورت ہے۔ لیکن مام میں ابھی سے بچے نہیں چاہتی، میری ساری خوبصورتی ماند پڑ جائے گی، میرا فگر بھی خراب ہو جائے گا، پلیز مام؟''

''زوئلہ تم خوامخواہ بات کو بڑھا رہی ہو۔'' عارفین کو غصہ آیا تھا۔

''عارفین میری جان کیوں اتنے روڈ ہو رہے ہو؟ وہ اگر بچے نہیں چاہتی تو تم بھی

ضد نہ کرو۔''

''مام آپ بھی اس بات کو گہرائی سے نہیں لے رہیں؟ کم از کم آپ کو تو کچھ سوچنا چاہئے؟'' عارفین کو سچ مچ ماں کے انداز اور لاپروائی پہ حیرت ہوئی تھی، ورنہ بہت سی مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بیٹے کی اولاد کے لئے منتیں، مرادیں مانتے ہوئے نہیں تھکتیں، بلکہ پوتے، پوتی کی خواہش میں سکون سے سوتی بھی نہیں ہیں، جبکہ رابعہ شیرازی......؟ وہ سچ مچ صرف رابعہ شیرازی ہی تھیں، نہ وہ کسی کی بیوی تھیں، نہ وہ کسی کی ماں تھیں، نہ وہ کسی کی بہو، بیٹی تھیں، وہ صرف ''رابعہ شیرازی'' تھیں، اپنی ذات کے لئے اپنے آپ کے لئے بس۔

''تمہاری ماں اور تمہاری بیوی چاہے کچھ بھی نہ سوچیں، لیکن ہم نے بہت کچھ سوچ لیا ہے بیٹا۔'' بابا جان جو ریلنگ کے قریب کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے، بہت پراسرار سے انداز میں کہتے نیچے اتر آئے تھے۔

''کیا مطلب ہے بابا جان؟'' عارفین چونک گیا تھا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے بیٹا تمہاری بیوی اگر تمہیں اولاد جیسی خوشی دیتی ہے تو ٹھیک، ورنہ بچوں کے لئے تمہیں دوسری شادی کرنا ہوگی اور تمہاری دوسری شادی ہم خود کروائیں گے اپنی مرضی سے۔'' بابا جان نے کھڑے کھڑے حقیقتاً ان لوگوں پہ بم پھوڑ دیا تھا، رابعہ شیرازی اور زوئلہ شیرازی تو دور کی بات خود عارفین بھی چکرا کے رہ گیا تھا۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

''ہاں۔ بیٹا لوگ اپنی نسل، اپنے نام کے لئے کچھ بھی کر لیتے ہیں تم کوئی انوکھا کام نہیں کرو گے۔ البتہ اپنی ماں اور بیوی سے کہو وہ ایک بار پھر سوچ لیں۔'' بابا جان فیصلہ کن انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا میری بھانجی پہ سوتن نہیں آ سکتی۔'' رابعہ شیرازی پھنکار کے بولی تھیں اور بابا جان دوبارہ واپس پلٹ آئے تھے۔

''میں اپنے اسی پوتے کی قسم کھاتا ہوں رابعہ بی بی اگر تمہاری بھانجی نے بچہ پیدا نہ کیا تو اس پہ سوتن ضرور آئے گی اور تم خود اپنی بھانجی کی سوتن کو بیاہ کے لاؤ گی۔ بس میری یہ قسم یاد رکھنا۔'' وہ اپنے فیصلے پہ قسم جیسی آخری کیل ٹھونک کر وہاں سے چلے گئے تھے اور رابعہ شیرازی پہلی بار...... دم بخود رہ گئی تھیں۔ بابا جان بہت نرم تھے تو بہت سخت بھی تھے۔ کوئی ان کے سامنے پر نہیں مار سکتا تھا۔ فقط رابعہ شیرازی ایسی تھیں جو ان سے دو بدو بات کرتی تھیں اور ان کی چپ کا

ناجائز فائدہ اٹھاتی تھیں۔ مگر آج......

''اروٰی آپی آپ کس کلر کا سوٹ لیں گی، یسریٰ آپی کی مایوں کے لئے؟'' ٹیکسی سے اترتے ہی سارہ کو سوٹ کے کلر کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ ''ابھی شاپ کے اندر تو جا لینے دو۔'' اروٰی نے خفگی سے گھورا تھا اسے۔

''امی شاپنگ کے بعد آئس کریم کھلائیں گی نا؟'' اب سارہ کی توپ کا رخ امی کی سمت ہو چکا تھا۔ اروٰی کی نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی پھوٹ نکلی تھی۔ وہ بے حد کھلکھلا کے ہنسی تھی اور ذرا سے فاصلے پہ گاڑی سے اترتے عارفین شیرازی نے چونک کر ہنسی کے تعاقب میں دیکھا تھا، آف وائٹ اور پرپل کمبی نیشن کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس پرکشش شخصیت کی حامل وہ لڑکی بہت دلکشی سے مسکرا رہی تھی اور اس کی نظروں کا مرکز اپنے ساتھ کھڑی دوسری لڑکی تھی۔ عارفین ان لوگوں کی نوک جھوک سنتا ہوا سائیڈ سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا، البتہ شاپنگ سنٹر میں جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ان لوگوں کو دیکھا تھا اور مسکرا کر اندر چلا گیا، لگتا تھا وہ لوگ کافی فرصت اور فریش موڈ سے آئی تھیں، لیکن عارفین کو نہیں پتہ تھا کہ ان کی یہی بے فکری اور فریش موڈ وہ خود ہی ختم کر بیٹھے گا۔ وہ پہلے شاپنگ کرنے کے بعد اپنے ایک جاننے والے کے ساتھ ہی قریبی ریسٹورنٹ چلا آیا تھا اور انہیں لنچ کروانے کے بعد وہاں سے رخصت چاہی تھی، پارکنگ ایریا سے اس نے گاڑی بہت آہستہ رفتار میں نکالی تھی اور پھر روڈ پہ آ کر اس نے یوٹرن بھی بہت ہی سلو رفتار میں لیا تھا۔ یوٹرن لیتے ہی اس نے گاڑی کی سپیڈ ایک دم سے بڑھا دی تھی اور گاڑی کو سلو رفتار میں آتا دیکھ کر فٹ پاتھ سے اتر آنے والی سارہ یقیناً گاڑی کا نشانہ بنتی، اگر یک دم اروٰی اسے دھکا نہ دے دیتی۔ سارہ تو ایک سائیڈ پہ گرنے کی وجہ سے بچ گئی تھی، لیکن اروٰی کی چیخ نے پورے ماحول کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا، اس کا دوپٹہ گاڑی کے ٹائر سے لپٹ کر اسے بھی زمین بوس کر گیا تھا اور عارفین بریک لگاتے ہوئے فوراً ہی بھاگتے ہوئے پاس آیا تھا۔

''اروٰی آپی؟'' سارہ زمین پہ بہتا خون دیکھ کر پاگل ہو اٹھی تھی۔ امی دوزانو اس کے قریب گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھیں اور اروٰی کی بند ہوتی آنکھوں نے تین چہرے اپنے بے حد قریب جھکے دیکھے تھے۔ سارہ کا چہرہ، امی کا چہرہ، اور ایک اجنبی (عارفین شیرازی) کا چہرہ! وہ چہرہ بھی اتنا ہی متفکر اور ہوائیاں اڑاتا نظر آ رہا تھا جتنے باقی دو چہرے، اور اس کی بند ہوتی بے ہوشی میں ڈوبتی آنکھوں میں وہ چہرہ بھی ''ڈوب'' گیا تھا۔ کہنے کو صرف چہرہ ڈوبا تھا، لیکن صحیح

معنوں میں بہت کچھ ڈوب چکا تھا، اس کی بند ہوتی آنکھوں نے بہت کچھ اپنے اندر ہی قید کر لیا تھا، لیکن وقتی طور پر خاص محسوس نہیں ہو سکا تھا۔

''اروٰی......اروٰی'' وہ ماں، بیٹی بے تحاشا روتے ہوئے پکارے جا رہی تھیں، آس پاس لوگوں کا شور اور ہجوم بڑھ چکا تھا، ان لوگوں کی بڑے ارمانوں اور خوشیوں سے خریدی چیزیں سڑک پہ بکھری تھیں، عارفین نے مجرموں کی طرح سر جھٹک کر اسے اٹھایا اور اپنی گاڑی میں ڈالا تھا، سارہ اور امی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھیں، وہ بڑی تیزی اور عجلت میں ڈرائیو کرتا ہسپتال پہنچا تھا۔

......

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ مکمل ہوش میں آئی تھی۔ سیدھا سڑک پہ گرنے کی وجہ سے اس کا سر بری طرح زخمی ہوا تھا اور خون بھی کافی زیادہ بہا تھا۔ اندر ہی اندر عارفین بہت زیادہ پشیمانی کا شکار ہو رہا تھا۔ حالانکہ غلطی سراسر اروٰی اور سارہ کی تھی وہ تو بالکل صحیح سپیڈ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''سر آپ کی پیشنٹ ہوش میں آ چکی ہیں اور وہ گھر جانا چاہتی ہیں۔'' وہ کوریڈور میں ریسپشن کے قریب ٹہلتے ہوئے مسلسل چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کا دھیان زوئلہ کی طرف تھا، اس کو لے کر ڈاکٹر فائزہ کے پاس جانا تھا، لیکن وہ کافی لیٹ ہو چکا تھا۔ نرس کے بتانے پر وہ اندر آ گیا تھا، جہاں وہ تینوں خواتین موجود تھیں اور زخمی ہونے والی ''اروٰی'' نامی لڑکی پورے ہوش و حواس میں نظر آ رہی تھی۔ عارفین نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ کوئی لمبی چوڑی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اگر اس لڑکی کی چوٹ گہری ہوتی تو زیادہ مشکل ہو سکتی تھی۔

''جی ماں جی اب کیسی کنڈیشن ہے ان کی؟'' عارفین نے بہت ہی عزت اور احترام سے مخاطب کیا تھا انہیں اور اروٰی کی طبیعت پوچھی تھی۔ امی بھی اچھی طرح جان چکی تھیں کہ وہ ایک انتہائی شریف اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ بے شک دیکھنے سے ہی امیر کبیر لگ رہا ہے، لیکن اس کے کسی بھی انداز و اطوار سے عام بگڑے ہوئے امیرزادوں جیسی کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''بیٹا یہ اب ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ اب گھر جا سکتی ہے۔'' امی نے فوراً بتایا تھا۔

''اگر آپ گھر جانے کے لئے رضامندی ہیں تو ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں، اور اگر آپ مطمئن نہیں اپنے آپ کو صحیح فیل نہیں کر رہیں تو کوئی بات نہیں آپ مزید یہاں

ایڈمٹ رہ سکتی ہیں میں ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے آپ کا ٹریٹ منٹ بڑھا دیتا ہوں۔''

''نن نہیں، سر میں بالکل ٹھیک ہوں، میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اروی نے اس کی بات سنتے ہی انکار کر دیا تھا اور فوراً ہی بیڈ سے کھڑی ہوگئی تھی، مگر دماغ یک دم چکرا کر رہ گیا تھا اور قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ سارہ نے یک دم اسے کندھے سے تھام لیا تھا۔

''اٹس او کے۔'' اروی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش تھی اور پھر سارہ کے ساتھ چلتے ہوئے وہ باہر پارکنگ تک آئی تھی۔ عارفین نے انہیں ڈراپ کرنے کی ذمہ داری خود لی تھی۔ حالانکہ اروی نے منع کیا تھا وہ کسی اجنبی کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے گھر تک لے کر جانا چاہتی تھی، مگر جب امی کو اعتراض نہیں تھا تو وہ بھلا کیا کرتی؟ نہ جانے کیا بات تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عارفین نے اس لڑکی (اروی) کو دو بار بیک ویو مرر سے دیکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ لڑکی بہت تیکھی تھی، لیکن جاننے اور سمجھنے میں وہ بہت نرم محسوس ہو رہی تھی، اس کی شخصیت دو رنگوں کا امتزاج لئے ہوئے تھی، نرمی کا رنگ بھی اور سختی کا رنگ بھی۔

''جی بس یہیں ڈراپ کر دیں؟'' امی اور عارفین بے وجہ سی باتوں میں مصروف تھے، سارہ سہمی بیٹھی تھی، اروی نے خود ہی اسے چونکا کے بریک لگانے کو کہا تھا۔

''ماں جی یہ میرا کارڈ ہے آپ کو زندگی میں کبھی بھی کسی کام کی کسی چیز کی ضرورت پڑے آپ مجھے یاد کر سکتی ہیں اور مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی؟'' گاڑی سے اترنے سے پہلے عارفین نے امی کو اپنا کارڈ تھمایا تھا اور وہ کارڈ امی نے گھر آ کر اپنی سلائی مشین کی دراز میں ڈال دیا تھا۔

۞......۞......۞

''کہاں تھے تم، زونلہ کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے، تم نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا؟'' رابعہ شیرازی، عارفین کو دیکھتے ہی شروع ہوگئی تھیں، جبکہ وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

''مام میں گھر ہی آ رہا تھا لیکن راستے میں معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک لڑکی زخمی ہوگئی تھی، اس لئے ان لوگوں کے ساتھ ہسپتال جانا پڑ گیا تھا۔'' اس نے صوفے پہ نیم دراز ہوتے ہوئے بتایا تھا۔

''زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟''

''نہیں کافی حد تک بچت ہوگئی تھی۔''

''تم خود تو ٹھیک ہو نا؟'' رابعہ شیرازی آج سچ مچ ایک ماں کا روپ دھارے ہوئے تھیں، جن کو بیٹے کی بھی فکر ہو رہی تھی اور بہو کے علاج کے لئے بھی پریشان تھیں اور یہ سب کرم نوازی بابا جان کی آخری وارننگ ان کی قسم کی وجہ سے ہو رہا تھا، اب رابعہ شیرازی کو اپنی لاپروائیاں چھوڑ کے عملی زندگی میں آنا تھا، اب انہیں یہ فکر تھی کہ زونلہ جلد سے جلد ماں بنے اور وہ پھر سے بےفکری ہو کر اپنی راجدھانی پہ عیش کریں۔

''جی میں ٹھیک ہوں۔'' عارفین بھی اپنی ماں کا بدلا ہوا رنگ روپ بھانپ گیا تھا اور دل ہی دل میں اس نے بابا کو داد دی تھی، جن کی ایک دھمکی ہی اتنی پراثر ثابت ہوئی تھی کہ رابعہ شیرازی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نئی فکروں میں لگ گئی تھیں۔

''پھر زونلہ کو کب لے کر جاؤ گے؟'' وہ گھوم پھر کے دوبارہ اپنے مطلب کی بات پہ آ گئی تھیں۔

''شام کو ڈاکٹر فائزہ سے بات کروں گا، جب انہوں نے کہا تب لے جاؤں گا۔''

عارفین کا ذہن کچھ منتشر ہو رہا تھا، اس لئے ان کی باتوں پہ دھیان ذرا کم ہی دے رہا تھا۔

''او کے، لیکن یاد سے بات کرنا، بعد میں نہ ہو کہ تمہارے وہ بابا جان پھر میرے کندھوں پہ سوار ہو رہے ہوں؟'' انہوں نے ناگواری سے ذکر کیا تھا، عارفین کوئی بھی نوٹس لئے بغیر چپ چاپ بیٹھا رہا تھا، تھوڑی دیر بعد زونلہ چلی آئی، وہ بھی رابعہ شیرازی جیسی ہی پوچھ گچھ شروع کر چکی تھی اور مجبوراً عارفین وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

۞......۞......۞

یسریٰ کی شادی کافی دھوم دھام سے ہوئی تھی، امی اور بہروز بھائی سب کچھ اچھے طریقے سے نپٹ جانے پہ بہت خوش تھے اور زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اللہ نے انہیں ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش تو کر ہی دیا ہے، اب دو بیٹیوں کا فرض باقی تھا اور انہیں یقین تھا کہ وہ باقی دونوں بیٹیوں کے فرض سے بھی جلد اور احسن طریقے سے فارغ ہوں گے، مگر قسمت کے دھارے کب کس رخ پہ بہہ نکلیں گے یہ آج تک کوئی نہیں جان پایا تھا، وہ لوگ ان دنوں بہت خوش تھے اور انہیں خوشی راس نہیں آئی تھی۔ وہ دن ان کے لئے قیامت کا دن تھا جب بہروز بھائی کے آفس سے فون کال آئی تھی۔

''آپ بہروز صاحب کے گھر سے بول رہی ہیں۔''

"جی میں بہروز بھائی کی بہن بات کر رہی ہوں۔" اروی یونیورسٹی سے ذرا جلدی گئی تھی جیسے ہی فون کی بیل ہوئی، اس نے ہی کال ریسیو کی تھی۔

"میں ان کے آفس سے ان کا کولیگ بات کر رہا ہوں۔ بہروز صاحب کی طبیعت خراب ہے، انہیں ہسپتال لے گئے ہیں۔ اگر آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو ہسپتال کا پتہ لکھ لیں۔"

"کک...... کیا کہہ رہے ہیں......؟ کیا ہوا ہے بھائی کو......؟" اروی کی آواز لڑکھڑا گئی تھی اور کچن میں اروی کے لئے کھانا نکالتی امی کے ہاتھ کپکپا گئے تھے، ان کا دل کسی انہونی کے خیال سے بری طرح لرز اٹھا۔

"یا اللہ خیر......" انہوں نے بے ساختہ اللہ کو یاد کیا تھا۔ ثمینہ بھابی بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔

"دل کا دورہ......؟" اروی کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے لفظ نکلے تھے اور وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ثمینہ بھابی اپنا سینہ پیٹنے لگی تھیں اور امی کے جسم سے تو جیسے کسی نے روح کھینچ لی تھی۔ پورے گھر میں عجیب سی وحشت چیخ اٹھی تھی، وہ تینوں بمشکل روتے پیٹتے ہوئے ہسپتال پہنچی تھیں، جہاں بہروز کو اس کے کولیگز اپنی نگرانی میں سنبھالے ہوئے تھے، ان کے ٹیسٹ کئے جا رہے تھے اور نارمل ٹریٹ منٹ بھی ہو رہی تھی۔ ابھی مزید تفصیلی رپورٹ کا انتظار تھا کہ آخر انہیں ہوا کیا ہے؟ پانچ گھنٹوں کے انتظار کے بعد انہیں رپورٹ ملی تھی جس کے مطابق بہروز حیات کے دل کی شریانوں کا خون منجمد ہو چکا تھا جس کی وجہ سے خون کی گردش میں رکاوٹ پیش آ رہی تھی اور رگیں پھٹنے کے قریب ہو رہی تھیں اور شریانوں کی اسی پرابلم کی وجہ سے بہروز حیات کے سینے میں درد کی لہریں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب اس بیماری کا کوئی حل بھی تو ہوگا؟" امی روتے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے آئی تھیں۔

"اس کا فی الحال ایک ہی حل ہے اور وہ ہے آپریشن...... تاکہ آپریشن کے ذریعے ان کی شریانوں کی بندش دور کی جا سکے۔" ڈاکٹر صاحب بہت نارمل سے انداز میں تفصیل بتا رہے تھے جبکہ امی آپریشن کا سن کر چپ سی ہو گئیں۔

"آپریشن کب ہوگا ڈاکٹر صاحب اور اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" اروی نے امی کو خاموش ہوتے دیکھ کر مزید پوچھا تھا۔

"آپریشن کل تک ہو جانا چاہیے اور اس کے لئے دو لاکھ روپے کا خرچہ آپ لوگوں کو افورڈ کرنا ہوگا۔ آپ اگر دیر کریں گے تو مریض کی جان کو خطرہ ہوگا۔" ڈاکٹر کے منہ سے نکلا ایک لفظ اروی کے جسم کے رونگھٹے کھڑے کر گیا تھا اروی کے کانوں میں سائیں سائیں آواز گونجنے لگی تھی۔

"دو لاکھ...... کک...... کہاں سے آئیں گے دو لاکھ روپے؟" وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ساکت بے جان سی بیٹھی تھیں، ان دونوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔

"کیا ہوا آنٹی! کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" جرار بہنوئی کی بیماری کا سن کر ابھی ابھی ہاسپٹل آیا تھا، اس کی ہمدردی آواز سن کر امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

"امی پلیز حوصلہ کریں ہمیں کچھ کرنا ہوگا، ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔" اروی نے ماں کے کندھے پہ دباؤ ڈالتے ہوئے انہیں رونے سے روکا تھا۔

"بیٹا...... دو لاکھ روپے کہاں سے آئیں گے، کیسے جمع ہوگا؟"

"انشاء اللہ ضرور ہوگا، آپ ہمت کریں۔ آپ کے پاس شاید زیور ہیں؟" اروی کو پتہ تھا کہ امی نے وہ زیور سارہ کے اور اس کے لئے بچا کر رکھے ہیں اور مشکل وقت میں اب وہی کام آ سکتے ہیں۔

"وہ...... وہ زیور تو......؟"

"امی! آپ بھائی کی زندگی کے لئے دعا کریں۔ وہ زیور زیادہ ضروری یا اہم نہیں ہیں۔"

"لیکن بیٹا...... دو دو چوڑیاں اور ایک ایک لاکٹ سیٹ ہی تو ہے، ان سے دو لاکھ پورا تو نہیں ہوگا؟"

"کچھ تو ہوگا نا، آپ گھر چلیں میرے ساتھ، ہم ابھی وہ زیور بیچ دیتے ہیں۔ بھابی! آپ بھائی کے پاس رکیں، ہم کچھ دیر بعد پھر آ جائیں گے۔" اروی نے ثمینہ بھابی کو تسلی دی۔

"آیئے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" جرار کے پاس گاڑی تھی، اس لئے بڑھ چڑھ کر آفر دے رہا تھا ورنہ مصیبت یا مشکل کے وقت کام آنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

دو لاکٹ سیٹ اور چار چوڑیاں بیچ کر انہیں ایک لاکھ روپے کی رقم تو حاصل ہو ہی گئی تھی، اب مسئلہ مزید ایک لاکھ روپیہ جمع کرنے کا تھا اور بہت زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد امی نے بہروز بھائی کی بائیک بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہروز بھائی کی بائیک کا سن کر اروی کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا، اس کا جی چاہا وہ امی کو منع کر دے مگر اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں تھا۔ چالیس ہزار

کی بائیک بیچنے کے بعد بھی انہیں ساٹھ ہزار کی ضرورت تھی۔

”بھابی! آپ کے پاس بھی تو کچھ زیور تھا...... آپ وہ زیور بیچ دیں، بھائی ٹھیک ہو جائیں تو آپ کو دوبارہ بنوا دیں گے۔“ ایک بہن اپنے بھائی کے لئے بھائی کی بیوی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہی تھی حالانکہ ایسے وقت میں بیوی کو خود اپنے شوہر کی موت وزندگی کا احساس ہونا چاہیے تھا جس کے لئے بناؤ سنگھار کرنا تھا جس کے لئے زیور پہننا تھا، وہی نہ رہتا تو زیور کس کام کے؟

”میرے زیور تو بک گئے۔“ ثمینہ بھابی نے ناگواری سے کہا۔

”کیا مطلب......؟“

”آپ لوگوں کو پتہ ہوگا مہینہ بھر پہلے میری امی بہت بیمار ہوگئی تھیں اور جرار کے پاس کوئی جاب نہیں تھی، اس لئے امی کے علاج کے لئے میں نے زیور بیچ دیے تھے۔“ ثمینہ بھابی کے سفید جھوٹ پر اروی ہکا بکا رہ گئی تھی، صرف یہ دیکھ کر کہ کیا کوئی بیوی اتنی بے رحم اتنی سنگدل بھی ہوسکتی ہے؟ اس کے بچوں کا باپ، اس کا سرتاج موت کے منہ میں جا رہا تھا اور وہ خودغرضی اور طوطا چشمی سے کام لے رہی تھی اور اروی دوسری کوئی بھی بات کیے بغیر واپس پلٹ گئی تھی۔

”آپ نے جھوٹ کیوں بولا باجی؟“ جرار نے حیرت سے بہن کو دیکھا تھا، وہ کمینہ تھا لیکن بہن اس سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔

”چپ رہو تم...... آج اگر میں زیور بیچ دیتی ہوں اور بہروز کو کچھ ہو جاتا ہے تو پھر میرا کیا بنے گا، میرے پاس کیا بچے گا؟ یہ عورتیں مجھے بھلا کیا دیں گی؟ اپنے پاس کچھ جمع پونجی بھی ضرور رکھنی چاہیے، کسی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔“ ثمینہ بھابی نے بھائی کی زبان بند کر دی تھی۔

امی نے محلے کی ایک خاتون کے سامنے جھولی پھیلائی تھی اور انہوں نے بیس ہزار روپیہ قرض دیا تھا۔ آٹھ دس ہزار میں انہوں نے گھر کا فریج بیچ دیا تھا۔ دس ہزار یسریٰ کے پاس تھے، وہ بھی چپکے سے ماں کے ہاتھ پہ رکھ گئی تھی۔ ایک ایک روپیہ جمع کرنے کے بعد بھی بیس ہزار کی ضرورت تھی، ایک لاکھ اسی ہزار جمع ہو چکا تھا۔ اروی نے بہروز بھائی کے آفس ان کے باس سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا کیونکہ بہروز پہلے ہی ان سے یسریٰ کی شادی کے لئے کچھ رقم ایڈوانس لے چکا تھا۔

”دیکھیے حامد صاحب! جب تک بھائی ٹھیک نہیں ہو جاتے، ان کی جگہ میں آپ کے آفس میں کام کروں گی۔ پلیز آپ ہماری کچھ ہیلپ کریں، ہمیں بیس ہزار روپے کی ضرورت

ہے، کل ان کا آپریشن ہونا بہت ضروری ہے۔“

”ایم سوری میڈم! ہم مزید اپنی رقم ڈبونے کا رسک نہیں لے سکتے اور پلیز آپ رات کے اس پہر بار بار فون کر کے تنگ مت کریں۔“ حامد صاحب نے انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا اور اروی آج کی رات ختم ہونے کا سوچ کر ہی وحشت زدہ ہوگئی تھی۔ ٹائم بارہ سے اوپر کا ہو رہا تھا، گویا دوسرا دن لگ چکا تھا۔

❁......❁......❁

اگلی صبح امی نے اپنی سلائی مشین اور واشنگ مشین بیچنے کے لئے رکھ دیں مگر دو گھنٹے خوار ہونے کے بعد بھی کسی نے اچھے داموں خریدنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”یہ مشین کتنے کی بک رہی ہے امی؟“ اروی نے سلائی مشین کو بےزاری سے دیکھا۔

”بیٹا! یہ لوگ تو اسے پرانے لوہے کے بھاؤ خرید رہے ہیں، چار پانچ سو سے زیادہ کوئی نہیں دے رہا۔“ امی کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکنے لگا تھا اور اروی کی نظر مشین کے رخنے سے جھانکتے سفید کارڈ پہ جم گئی تھی، اس نے ایک سیکنڈ میں وہ کارڈ جھپٹا تھا۔

”مسٹر عارفین شیرازی۔“ اس کی نظروں میں عارفین شیرازی کا چہرہ گھوم گیا تھا اور ذہن میں اپنی موجودہ ضرورت چکرانے لگی تھی۔

”اس وقت اگر ہماری کوئی مدد کر سکتا ہے تو وہ عارفین شیرازی ہے۔ مجھے...... مجھے اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ وہ لپک کر فون کے قریب آئی تھی اور اس کا نمبر ڈائل کیا تھا لیکن اس کے موبائل کا نیٹ ورک نہیں مل رہا تھا۔ اس نے دس منٹ کے اندر اندر تقریباً چالیس پچاس مرتبہ ٹرائی کر لیا تھا مگر دوسری طرف سے جواب ہی موصول نہیں ہو رہا تھا۔ مجبوراً اسے عارفین شیرازی کے آفس جانے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو اروی؟“ امی اسے دوپٹہ اور اسکارف لیتے دیکھ کر فوراً بولی تھیں،

”امی! میں اس آدمی کے پاس جا رہی ہوں جو مجھے یقین ہے کہ ہماری مدد ضرور کرے گا اور آپ بھی اسے جانتی ہیں۔“

”کون ہے بیٹا...... کس کی بات کر رہی ہو؟“ انہوں نے ذرا الجھ کر پوچھا تھا۔

”عارفین شیرازی۔“ اس نے امی کے سامنے کارڈ لہرایا تھا اور امی کی آنکھوں میں مدھم سی روشنی جگمگائی تھی۔

"لیکن بیٹا...... ٹائم بہت کم ہے۔"

"امی! آپ فکر نہ کریں، آپ یہ رقم لے کر ہاسپٹل جائیں، تب تک میں بھی آجاؤں گی۔ بس دعا کریں کہ اس سے ملاقات ہو جائے۔" اروی ماں کو تسلی دے کر گھر سے نکل آئی تھی، اس نے روڈ پہ آتے ہی رکشہ والے کو روکا اور کارڈ پہ لکھا ایڈریس سمجھایا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ عارفین شیرازی کے عالیشان آفس میں موجود تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ بہت پر یقین تھی، اسے پورا بھروسہ تھا کہ عارفین شیرازی اس کی پرابلم سن کر ضرور ہیلپ کرے گا لیکن یہاں آ کر اس کا سارا یقین سارا بھروسہ بکھر سا گیا تھا۔ اتنا امیر کبیر انسان، اتنا بڑا بزنس مین...... اتنی معروف شخصیت کو بھلا کیا پتہ کہ وہ کون ہے اور اس سے ملاقات کہاں ہوئی ہے؟ اگر اس نے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تو...... تو کیا کرے گی وہ؟ کہاں جائے گی؟ کس سے بھیک مانگے گی؟ کس سے کہے گی کہ اس کے بھائی کی زندگی کا سوال ہے؟" عارفین شیرازی کے ممکنہ رویے کا سوچ کر ہی اس کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

"ایک گلاس پانی مل سکتا ہے پلیز......" اس نے پاس سے گزرتے پیون کو مخاطب کیا تھا۔

"یس میم......" وہ فوراً پانی لے آیا تھا اور اس کی حالت کے پیش نظر ویٹنگ روم کے اے سی کی کولنگ اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

عارفین منیجر صاحب سے کوئی بات ڈسکس کرتے ہوئے اپنے روم سے باہر نکلا تھا، جب اس کی نظر نڈھال سی اس لڑکی پہ پڑی جو آج بھی اس کے حافظے میں محفوظ تھی۔

"اروی......" بے ساختہ ہی اس کا نام بھی ذہن سے زبان تک پہنچ گیا تھا اور عارفین کے لئے یہ مزید حیرت کی بات تھی کہ وہ اس لڑکی کو نام سمیت یاد رکھے ہوئے تھا۔

"میم...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" آفس کی ایک لیڈی ورکر نے اٹھ کر اس کا حال پوچھا تھا۔

"جج...... جی...... میں ٹھیک ہوں......" اروی واپسی کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔

"میم...... آپ تو سر سے ملنے کے لئے آئی تھیں۔"

"نن...... نہیں...... مم...... میں پھر کبھی آجاؤں گی......" اروی کو ناکامی کا سوچ کر چکر آنے لگے تھے کہ اب بہروز بھائی کا کیا ہوگا؟

"رکیے مس اروی......" عارفین کی بھاری اور بلند آواز نے جہاں اروی کے قدم

روک دیے تھے، وہیں آفس کے پورے سٹاف کو ٹھٹکا دیا تھا کیونکہ اس کے لہجے اور انداز میں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی تھی۔ اروی نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ عارفین شیرازی نے اسے اس کے نام سے پکارا ہے؟ گویا وہ اس کو بھی پہچانتا تھا اور اس کا نام بھی جانتا تھا۔

"آئیے، آپ واپس کیوں جا رہی ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنے آفس روم میں آنے کی پیشکش کی تھی اور اروی کو لگا، اللہ نے کوئی دعا سن لی ہے۔ وہ اس کے ساتھ اس کے سپر لگژری روم میں داخل ہوئی تھی۔ سکون اور ٹھنڈک کا احساس پورے کمرے میں بکھرا تھا۔ یہاں آ کے احساس ہوا کہ زندگی کے لئے کچھ پل سکون کے بھی بے حد ضروری ہیں۔

"بیٹھے......" اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا اور خود دوسری چیئر گھسیٹ کر اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا تھا۔

"ماں جی کیسی ہیں؟" اس نے چھوٹتے ہی حال احوال پوچھا تھا۔

"جی ٹھیک ہیں۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"اور آپ......؟" عارفین کو وہ پہلے روز جیسی فریش نہیں لگی تھی، اسی لئے گہری نظروں سے جانچتے ہوئے اس کا حال بھی پوچھ لیا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں لیکن......" وہ اپنا مدعا بیان کرتے کرتے رک گئی تھی، نہ جانے کیوں دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اس اجنبی آشنا سے کچھ مانگے۔

"لیکن کیا مس اروی...... آپ پلیز کھل کر بات کریں، میں جانتا ہوں آپ اس وقت یقیناً کسی مصیبت میں ہیں۔ پلیز بتایئے گھر میں سب ٹھیک ہیں نا؟ آپ کے بہن بھائی سب کیسے ہیں؟" امی اس روز باتوں باتوں میں اپنی ساری فیملی کے متعلق بتا گئی تھیں، تب ہی وہ اتنی بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

"بہروز بھائی کو کل آفس میں کام کے دوران دل کا دورہ پڑا ہے، وہ اس وقت ہاسپٹل میں ہیں، ڈاکٹرز ان کے لئے آپریشن بتا رہے ہیں۔ آج شام پانچ بجے کا ٹائم دیا ہے آپریشن کے لئے مگر......" بات کرتے کرتے وہ ٹھہر سی گئی تھی اپنے جیسے اپنے برابر کے انسان کے سامنے اپنا حال، اپنا سوال رکھتے ہوئے انسان کو اتنی جھجک اتنی عار نہیں آتی جتنی اس انسان سے آتی ہے جو حالات اور مقام میں ان سے بہتر اور ان سے اوپر ہو۔ یہی حال اروی کا تھا۔

"مگر......" عارفین نے اس کی بات سننے کے لئے اسے لفظ کا ایک سرا تھمایا تھا۔

"مگر ہمیں دو لاکھ روپے کی ضرورت تھی جو ہم نے جیسے تیسے جمع کر لیا ہے مگر بیس ہزار ابھی بھی کم ہیں اور ہمارا اس شہر میں کوئی بھی جاننے والا نہیں ہے۔" اروی کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور حلق میں بے بس آنسو اٹک رہے تھے، حالت ایسی تھی جیسے کسی نے بدن سے سارا لہو نچوڑ لیا۔

"کیش کی ضرورت ہے یا چیک کی؟" عارفین اس لڑکی کی بے بسی کی حد جانتا تھا، وہ اپنی خودی کو مار کے یہاں تک آئی تھی اور یہاں لانے والا اور کوئی نہیں تھا، صرف بہن اور بھائی کا رشتہ تھا، ایک بہن ایسی مجبور، ایسی بے بس ہوئی تھی کہ بھائی کے لئے کسی اجنبی در پہ سوالی بننے سے بھی نہیں کترائی تھی، حالانکہ جو کچھ اس کا حال ہو رہا تھا یا تو وہ خود جانتی تھی یا پھر اس کے سامنے بیٹھا عارفین شیرازی۔

"کیش......" اروی کی زبان بولتے ہوئے لڑکھڑا گئی تھی۔ عارفین نے کال کر کے منیجر صاحب سے کیش منگوایا تھا اور رقم اروی کے حوالے کی تھی۔

"لیکن سر! یہ تو بہت زیادہ ہے، ہمیں تو صرف بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔" اروی نے چالیس نوٹ دیکھ کر جلدی سے کہا تھا۔

"یہ بات آپ کو آپریشن کے بعد پتہ چلے گی کہ آپ کو صرف بیس ہزار کی ضرورت ہے یا اور بھی رقم چاہیے؟" عارفین دور اندیشی سے کام لے رہا تھا۔

"کیا مطلب سر......؟"

"آپ مطلب کے چکر میں نہ پڑیں اور پانی پئیں۔" اس نے پیون کے لائے ہوئے لوازمات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"تھینک یو سر! میں پانی لے چکی ہوں، مجھے اس وقت ہاسپٹل جانا ہے، امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔" اروی اٹھنے کے لئے پر تولنے لگی تھی۔

"او کے، آپ جا سکتی ہیں۔" عارفین اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"سر! میں آپ کی یہ رقم ادھار لے کر جا رہی ہوں، جیسے ہی بھائی ٹھیک ہوں گے، میں آپ کو واپس دے جاؤں گی لیکن مجھے اس وقت سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں؟ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اس طرح ہماری ہیلپ کریں گے۔"

اروی سچ مچ اس کے احسان پہ تذبذب کا شکار ہو رہی تھی۔

"جب آپ یہ ادھار واپس کرنے آئیں گی، تب شکریہ کے لئے لفظ بھی ڈھونڈ لائیے گا، اس وقت آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" وہ انتہائی دلکش سے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے جانے کا سگنل دے رہا تھا اور اروی، عارفین شیرازی کی اچھائی کی چھاپ دل پہ لئے وہاں سے نکل آئی تھی، اسے آج یقین ہو گیا تھا کہ دنیا میں ابھی بھی عارفین شیرازی جیسے اچھے لوگ موجود ہیں اور دنیا شاید انہی کی اچھائی کے سہارے قائم تھی ورنہ تو بہت کچھ ایسا بھی تھا جو کائنات کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی تھا۔

❁......❁......❁

رابعہ شیرازی کی آنکھیں زوئلہ کی رپورٹ دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"آر یو آل رائٹ مام؟" عارفین نے تیزی سے اٹھ کر ان کے ہاتھ سے زوئلہ کے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ تھامی تھی اور نیگیٹو رزلٹ دیکھ کر اس کی حالت بھی رابعہ شیرازی سے کم نہیں ہوئی تھی۔

"زوئلہ بانجھ ہے......؟ وہ...... وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی؟" رابعہ شیرازی زیر لب بڑبڑائی تھیں اور عارفین اپنے ماؤف ہوتے ذہن کو یکجا کرنے میں لگا ہوا تھا۔ تین روز پہلے ہی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق زوئلہ چند ٹیسٹ کروا کے گئی تھی لیکن ان کی رپورٹ تین روز بعد ملنی تھی لیکن آج زوئلہ کو بہت تیز بخار تھا، اس لئے اس کی رپورٹ لینے کے لئے رابعہ شیرازی خود اس کے ساتھ آئی تھیں۔

"کیا زوئلہ کا علاج نہیں ہو سکتا ڈاکٹر؟" رابعہ شیرازی نے ڈاکٹر فائزہ کو امید بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

"مسز رابعہ شیرازی! آپ تو جانتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے شفا رکھی ہے، ہر چیز کے لئے علاج بنایا ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن بانجھ پن ایک ایسا مرض ہے جس کو کوئی دوا دور نہیں کر سکتی۔ ہاں اللہ چاہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، وہ سوکھے درخت ہرے بھرے کر دیتا ہے، بنجر عورت کو آباد کرنا اس کے لئے مشکل تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر فائزہ دل کی گہرائی سے کہہ رہی تھیں اور رابعہ شیرازی چپ ہو کے رہ گئیں۔ ہاسپٹل سے واپسی کے دوران بھی وہ دونوں ماں بیٹا اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے تھے جیسے ہی گاڑی گھر کے اندر داخل ہوئی تھی، رابعہ شیرازی اپنے تمام خیالوں سے چونک کر پورے حواسوں میں لوٹ آئی تھیں کیونکہ سامنے روش پہ بابا جان کی گاڑی

کھڑی تھی، وہ ابھی ابھی آئے تھے شاید۔

"عارفین! زونلہ کی رپورٹ کے بارے میں بابا جان کو کچھ مت بتانا۔" انہوں نے بیٹھے بیٹھے کچھ سوچا اور عارفین کو منع کیا تھا۔

"لیکن مام! یہ بات چھپنے والی تو نہیں ہے۔" عارفین کو پردہ ڈالنے پر اعتراض ہوا تھا۔

"لوگ یہاں قتل کر کے چھپا لیتے ہیں، تم بات چھپانے کا کہہ رہے ہو۔" رابعہ شیرازی تیز لہجے میں بولی تھیں اور گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر گئی تھیں۔ عارفین الجھتا ہوا کتنی ہی دیر یونہی بیٹھا رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان کیا کریں گے اور رابعہ شیرازی کیا کریں گی؟ دونوں طرف دشمن اپنے اپنے محاذ پہ ڈٹے ہوئے تھے۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے مات کھانے پہ تیار ہی نہیں ہوتا تھا اور ان کی دشمنی میں عارفین خوامخواہ سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ وہ اب رابعہ شیرازی کے کسی نئے پلان کے متعلق سوچ کر جھنجھلاتا ہوا گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"کیا بات ہے، کہاں گئے تھے دونوں ماں بیٹا؟" بابا جان نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"زونلہ کی میڈیکل رپورٹ آنا تھی، آج وہی لینے گئے تھے لیکن آج ڈاکٹر چھٹی پہ چلی گئی، اسی لئے رپورٹ نہیں مل سکی۔" عارفین کی بجائے رابعہ شیرازی نے جواب سے نوازا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بابا جان کو بھی آج زونلہ کی میڈیکل رپورٹ کا ہی انتظار ہوگا، اسی لئے وہ گاؤں سے شہر آئے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ پوچھتے رابعہ شیرازی نے خود ہی بتا دیا تھا تاکہ عارفین کو کچھ بولنے کا موقع نہ ملے اور حقیقتاً عارفین نے ماں کے سفید جھوٹ پہ انہیں ذرا الجھ کر دیکھا تھا کہ آخر یہ بات چھپانے کے پیچھے ان کا مقصد کیا ہے؟

"ڈاکٹر کب آئے گی؟" بابا جان آئندہ کا پوچھ رہے تھے۔

"جب آئے گی وہ لوگ فون پہ انفارم کر دیں گے، شاید شہر سے باہر گئی ہے۔" رابعہ شیرازی ساڑھی کا پلو لاپروائی سے جھاڑتے ہوئے اپنے بیڈروم میں جانے کے لئے پلٹی تھیں۔

"اپنی ڈاکٹر صاحبہ سے کہنا، ذرا جلدی آ جائیں ورنہ کہیں دیر نہ ہو جائیں۔" بابا جان نے لقمہ دیا تھا اور رابعہ شیرازی نے پلٹ کر بابا جان کر دیکھا۔

"میں اپنی بھانجی کا اگر علاج کرواتا ہو تو انگلینڈ یا امریکہ سے بھی کروا سکتی ہوں۔ پاکستان کے ڈاکٹرز میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن میرا پورا یقین ہے کہ وہ انشاء اللہ جلد ہی ماں بھی بنے گی اور آپ کی قسم بھی ٹوٹے گی۔" وہ نخوت سے بولیں۔

"میں تو چاہتا ہی یہی ہوں بہو صاحبہ کہ میری قسم ٹوٹے اور زونلہ جلد از جلد مجھے پردادا کے عہدے پر فائز کر دے۔" ابا جان رابعہ شیرازی کی بات سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

اتنے میں بابا جان کا موبائل فون بج اٹھا تھا جو اس وقت ٹیبل پہ رکھا تھا۔

"دیکھو بیٹا کس کا فون ہے۔" انہوں نے عارفین کو اشارہ کیا کیونکہ وہی قریب بیٹھا ہوا تھا۔

"مہرالنساء آنٹی کا فون ہے۔" رابعہ شیرازی نے ٹھٹک کر دیکھا۔ بابا جان نے اسے کال ریسیو کرنے کا کہا اور پھر عارفین مہرالنساء سے باتیں کرنے لگا، اس کے بعد فون بابا جان نے لے لیا لیکن رابعہ شیرازی تلملاتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھیں۔

"ہونہہ...... مہرالنساء آنٹی...... جادوگرنی...... چالباز عورت...... اداؤں کے تیر چلانے والی...... زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑے گی میرا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر زونلہ کے پاس آئی تھیں کیونکہ بانجھ پن جیسی ہولناک خبر اسے بھی تو سنانی تھی۔ زونلہ کا بخار پہلے سے قدرے کم تھا، تب ہی وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رابعہ شیرازی نے آتے ہی اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا اور اپنے آپ کو وہ خبر سنانے کے لئے تیار کرنے لگی تھیں۔

◈......◈......◈

آپریشن کے دوسرے روز جب بہروز بھائی کے لئے نئی دوائیاں لانے کی ضرورت پڑی تو اروی کو خود بخود عارفین شیرازی کی بات یاد آ گئی۔

"یہ بات آپ کو آپریشن کے بعد پتہ چلے گی کہ آپ کو صرف بیس ہزار کی ضرورت ہے یا اور بھی رقم چاہیے؟" وہ اس کی بات اور دوراندیشی کی قائل ہو گئی تھی۔ باقی بچنے والے بیس ہزار میں سے دس ہزار تو دوسرے روز فوراً ہی دوائیوں پہ خرچ ہو گئے تھے اور اب مزید گزارا دس ہزار میں ہی کرنا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹرز بتا رہے تھے کہ بہروز بھائی کا علاج بہت مہنگا پڑے گا ان لوگوں کو لیکن ان کی کنڈیشن ایسی تھی کہ وہ علاج چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے اور علاج کروانا بھی بس سے باہر ہو رہا تھا۔

دو تین روز میں ہی ان کی ہمت جواب دے گئی تھی گو کہ بہروز بھائی اس وقت ہوش میں آ چکے تھے اور ان لوگوں سے بات چیت بھی کر رہے تھے لیکن پھر بھی ان لوگوں کی پریشانی کم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق ان کا علاج مزید چھ ماہ تک لگاتار جاری رہنا بے حد ضروری تھا اور ساتھ ہی بیڈ ریسٹ کی بھی اشد ضرورت تھی۔ اگر ان چھ ماہ میں وہ لوگ کوئی بے احتیاطی یا کوتاہی کرتے تو انہیں مزید کسی اٹیک کا خدشہ ہو سکتا تھا اور ڈاکٹرز کی انہی ہدایات کو لے کر امی اور

اروٰی بے حد پریشان تھیں۔ پریشانی تو یسریٰ، سارہ اور ثمینہ بھابی کو بھی تھی لیکن ان کی پریشانی اس لیول تک نہیں تھی جہاں تک اروٰی اور امی کو ہو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اب جمع پونجی کے نام پہ ان کے پاس ایک روپیہ یا ایک چھلا تک نہیں ہے۔ وہ لوگ پہلے جھٹکے میں ہی کنگال ہو چکے ہیں تو آئندہ کیا ہوگا اور اس ‘‘آئندہ’’ نے اروٰی کو بڑی گہری سوچوں کی تحویل میں دے دیا تھا۔

وہ پورا دن اور پوری رات ‘‘آئندہ’’ کے شکنجے میں جکڑی رہی تھی اور پھر فجر کے وقت نماز پڑھنے کے بعد اس نے دعا مانگی اور ساتھ ہی ایک فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے میں رب کی رضا چاہی تھی۔ اگر اس کا رب اس کا ساتھ دیتا تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس وقت اس کا رب اس کی دعا قریب سے سن رہا ہے اور سننے کے بعد پوری بھی کرے گا۔ وہ نماز اور دعا سے فارغ ہو کر امی کے پاس آ گئی تھی، رب کی رضا کے بعد ماں کی رضا لینا بہت ضروری تھا اور ماں کو اپنی عزت و آبرو، اپنی شرم و حیاء، اپنی انا اور آن کا پورا یقین دے کر وہ گھر سے نکلی تھی۔

اس کی ماں نے اس پہ بھروسہ کیا تھا، اور اجازت دے دی تھی۔ وہ گھر سے نکلی تو اپنی آن بان اس کے ساتھ تھی، اسے اپنوں کے پیار اور حوصلہ افزائی پہ بھی بڑا مان تھا، اب وہ جنگ لڑنے کو تیار تھی۔

سات دن...... یعنی پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا اروٰی کو جاب کے لئے جگہ جگہ جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے لیکن ‘‘نو ویکنسی’’ تو جیسے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئی تھی، سات روز میں وہ اتنی ذلیل اور خوار ہو چکی تھی کہ اسے ان تمام مردوں کے حوصلے پہ رشک آنے لگا تھا جو مہینوں اور سالوں نوکریاں ڈھونڈتے تھے لیکن ناکامی کی صورت میں بھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ اروٰی چونکہ ہمت ہار چکی تھی لیکن حوصلہ اتنا بلند تھا کہ وہ ہر صبح نئے عزم سے نکل پڑتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ گھر سے نکلی تو سب سے پہلے اس نے آج کا اخبار خریدنے کا سوچا تھا۔ تھوڑی دور پیدل چل کر آئی تو اسے روڈ پہ اخبار بیچنے والا بھی نظر آ گیا تھا۔ اس نے بارہ روپے میں اخبار خریدا اور پھر ‘‘ضرورت ہے’’ کے تمام اشتہار دیکھتی فٹ پاتھ پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ کھڑے کھڑے ہی وہ اپنی مطلوبہ نوکری کے لئے نظریں دوڑانے لگی تھی اور پھر ایک جگہ اسے ‘‘پرسنل اسسٹنٹ’’ کی ضرورت ہے، کا اشتہار نظر آیا تھا اور پھر اروٰی نے فوراً ہی اخبار پہ درج ذیل بلاک نمبر اور بلڈنگ کا ایڈریس نوٹ کر لیا تھا۔

جلدی اور بے دھیانی میں اسے یہ بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ اس ایڈریس پہ پہلے بھی ایک بار جا چکی ہے۔ اس نے کلائی پہ بندھی ریسٹ واچ پہ قائم دیکھتے ہوئے جلدی سے ٹیکسی

والے کو روکا تھا اور اپنا مطلوبہ ایڈریس اس کے سامنے رکھا۔ ٹیکسی جس بلڈنگ کے سامنے رکی، وہ یہاں پہلے بھی آ چکی تھی، اس نے واپس پلٹنے کا ارادہ کیا تب ہی کچھ سوچ کر اندر داخل ہو گئی۔

اس سے پہلے وہاں سات لڑکیاں موجود تھیں، وہ آٹھویں تھی، وہاں موجود ساتوں نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا تھا کیونکہ اس کا حلیہ اس جاب سے قطعی میچ نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہاں جتنی بھی موجود تھیں، سب کا فیشن ایک سے بڑھ کر ایک تھا، لباس سے لے کر میک اپ پر انہوں نے پوری پوری توجہ دی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے بیگز اور سینڈل بھی میچنگ کے تھے جبکہ اروٰی کی ایسی کوئی بھی تیاری نہیں تھی، بس وہ دل میں دعا کرتی ہوئی باقی سب کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ ساڑھے نو بجے انٹرویو شروع ہوا اور تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اروٰی کی باری آ گئی تھی۔ آج بھی وہ مایوسی اور آس و امید کے درمیان ڈولتی ہوئی اٹھی اور ایم ڈی کے روم کا دروازہ کھول کر اندر گئی تھی، اس امید کے ساتھ کہ اس کا سامنا عارفین سے نہیں ہوگا لیکن اندر آتے ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی، وہ تو پہلے ہی اس شخص کی مقروض تھی، اب پھر اس کے سامنے جاب کے لئے......

‘‘نہیں نہیں...... میں یہاں جاب نہیں کر سکتی، مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔’’ وہ اپنے آپ کو واپس پلٹنے پہ آمادہ کر رہی تھی جب عارفین نے دروازے کی سمت دیکھا تھا اور اروٰی کو اپنی فائل کے ہمراہ تذبذب کا شکار دیکھ کر چونک گیا۔ وہ شاید آج بھی واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر رہی تھی۔

‘‘آیئے بیٹھیے۔’’ عارفین کی آواز پہ وہ چونک اٹھی اور بمشکل اس کی سمت دیکھ پائی تھی۔

‘‘تشریف رکھیے میم......’’ اب کی بار ایک سائیڈ پہ بیٹھے مینجر صاحب نے کہا تھا اور مجبوراً اروٰی کو واپسی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے آگے بڑھنا پڑا تھا۔

‘‘السلام علیکم!’’ اس نے بیٹھتے ہوئے بے حد آہستگی سے کہا۔

‘‘وعلیکم السلام!’’ عارفین نے کچھ بھی کہے بغیر اس کی فائل کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا اور اس نے ہمت کر کے فائل اس کے سامنے رکھ دی جس میں اروٰی کا تعلیمی ریکارڈ محفوظ تھا اور عارفین اس کا یہ ریکارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

‘‘آپ جانتی ہیں۔’’ آپ اس وقت ایک پی اے کی جاب کے لئے انٹرویو دینے آئی ہیں۔’’

‘‘جی سر......’’ ایک پی اے پہ کتنی رسپانس ہوتی ہے، اس کا اندازہ ہے آپ کو؟’’

‘‘جی سر اندازہ ہے مجھے۔’’

"آپ کے خیال میں آپ یہ جاب کر سکتی ہیں؟"

"سر! جب ایک مجبور ایک غریب اپنے گھر سے "کچھ کرنے" کا ارادہ لے کر نکلتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ہمت، حوصلہ، صبر اور محنت کا عزم لے کر نکلتا ہے، وہ اپنی ول پاور دیکھ کر قدم بڑھاتا ہے، میں بھی اپنی ول پاور دیکھ کر ہی یہاں تک آئی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ جاب میرے بس سے باہر ہو لیکن اس جاب کو اپنے بس میں کرنا میری مجبوری ہے، اگر نہ کروں تو پھر میں "بے بس" رہ جاؤں گی۔" پہلی بار اس نے اتنی پراعتماد بات کی تھی، عارفین کو اچھا لگا تھا اور منیجر صاحب بھی جان گئے کہ وہ لڑکی ذمہ دار اور محنتی ہے، لہٰذا منیجر صاحب سے ذرا سے باہمی مشورے کے بعد عارفین نے اسے جاب کے لئے اپائنٹ کر لیا تھا، باقی سب لڑکیاں ناک بھوں چڑھاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئی تھیں جبکہ اروئی باہر بیٹھی عارفین کے بلاوے کی منتظر تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر بلایا گیا تھا۔

"مس اروئی حیات! آپ کل صبح نو بجے سے جوائن کر سکتی ہیں، باقی تفصیلات آپ کو منیجر صاحب سمجھا دیں گے، اگر کسی اور گائیڈینس کی ضرورت ہو تو آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔" عارفین بہت نرمی اور تحمل سے سمجھا رہا تھا۔

"سر! کیا میں جان سکتی ہوں کہ یہ جاب مجھے کس چیز کے بل بوتے پر مل رہی ہے؟" اروئی کے ذہن میں پھانس کی طرح اٹکا سوال نوک زبان پہ آ ہی گیا تھا۔ عارفین نے چونک کر اس عجیب سی لڑکی کو دیکھا تو جو کبھی صرف ایک ملاقات کے بل بوتے پہ اپنے پورے یقین کے ہمراہ اس سے کچھ رقم قرض کے طور پر مانگنے آ گئی تھی اور کبھی وہ اپنی تمام کوالیفکیشن کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھ کر بھی جاب ملنے پہ مشکوک اور غیر مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"آپ کو اپنی ذہانت پہ کوئی شک ہے؟" عارفین نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں اس وجہ سے نہیں پوچھ رہی، مجھے بس آپ کی......" اروئی جو کہنا چاہتی تھی، وہ کہنا اسے خود ہی مناسب نہیں لگا تھا، تب ہی کچھ کہتے کہتے ہی خاموش ہو گئی تھی۔

"مس اروئی حیات! میں اتنا جذباتی انسان نہیں ہوں کہ کسی ہمدردی میں آ کر اپنا اتنا بڑا نقصان کر بیٹھوں، اس جاب کے لئے مجھے آپ میں کچھ مطلوبہ کوالٹیز نظر آئی ہیں تو میں آپ کو اپائنٹ کر رہا ہوں ورنہ میں انکار بھی کر سکتا تھا۔" اس نے اروئی کو بہت واضح الفاظ میں جواب دیا تھا، وہ کچھ ریلیکس ہو گئی تھی لیکن دل کے اندر ابھی بھی "کچھ" مطمئن نہیں تھا۔

"او کے سر! میں چلتی ہوں۔" وہ اجازت لے کر کھڑی ہو گئی تھی اور عارفین سر جھٹک

کر اپنے سامنے رکھی فائلز دیکھنے لگا تھا جو اس کی توجہ مانگ رہی تھیں۔

زوئلہ اور رابعہ شیرازی کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی تھی، وہ زوئلہ کے بانجھ پن کو لے کر پریشان تھیں کیونکہ اپنی قسم اپنے عہد اپنے چیلنج کے مطابق اگر بابا جان عارفین کی شادی اپنی پسند سے کر دیتے تو پھر ان کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا تھا کیونکہ بابا جان تو شروع سے ہی اپنی بھتیجی مہر النساء کے گن گاتے تھے اور اگر عارفین، مہر النساء کی بیٹی سے شادی کر کے مہر النساء کی طرف مائل ہو جاتا، انہی کے گن گاتا اور انہی کی بیٹی کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کے بل بوتے پہ وہ صاحب اولاد کہلاتا تو یہ رابعہ شیرازی کے لئے مر جانے کا مقام تھا، وہ کبھی مہر النساء سے شکست کھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں، چاہے اس کے لئے انہیں کسی بھی حد سے گزرنا پڑتا۔ وہ پوری دنیا سے شکست کھا سکتی تھیں لیکن مہر النساء سے نہیں۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے عارفین......" عارفین دو روز سے گاؤں گیا ہوا تھا، بی بی جان کی طبیعت خراب تھی، اس لئے بابا جان نے اسے خود بلایا تھا اور وہ ابھی ابھی واپس آیا تھا کہ رابعہ شیرازی نے بلا لیا۔

"کیسا فیصلہ مام؟"

"تم اور زوئلہ ایک بچہ اڈاپٹ کرو گے۔" انہوں نے بہت ہی سکون سے بم پھوڑا تھا۔

"واٹ...... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" عارفین اپنی جگہ پہ ہل کے رہ گیا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے زوئلہ سے بھی بات کی ہے، وہ کہتی ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں کوئی بھی بچہ گود لے سکتی ہوں۔" وہ اتنی بڑی بات اتنے سکون اور اتنے تحمل سے کر رہی تھیں کہ عارفین حیران رہ گیا تھا۔

"مگر مجھے اعتراض ہے مام...... میں کسی کا کوئی بھی بچہ اڈاپٹ نہیں کر سکتا، مجھ میں اتنا ظرف نہیں کہ میں ساری زندگی کسی اور کی اولاد، کسی اور کا خون سینے سے لگا کے رکھوں اور اس کی کیئر کروں۔ آپ بھول جائیں کہ میں ایسا کوئی قدم اٹھاؤں گا۔" وہ سختی سے انکار کر کے اوپر جانے کے پلٹ گیا تھا۔

"عارفین...... میری بات سنو......" رابعہ شیرازی بلند آواز سے بولی تھیں، اس کے قدم رک گئے تھے۔

''اگر تم لوگ بچہ اڈاپٹ نہیں کرو گے تو زونلہ کا کیا بنے گا؟'' کیا بابا جان کے کہنے پہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہو؟'' وہ عارفین کی رائے جاننا چاہتی تھیں۔

''آپ زونلہ سے کہیں کہ وہ اپنا میڈیکل ٹریٹ منٹ کروائے اور رہی بات دوسری شادی کی تو وہ میں نے ابھی نہیں سوچا۔ اگر بابا جان میری شادی یا میری اولاد سے خوش ہوتے ہیں تو میں یہ بھی کرلوں گا۔'' وہ رابعہ شیرازی کو حیران پریشان چھوڑ کر اوپر چلا گیا تھا۔

''گویا عارفین ابھی سے میرے ہاتھوں سے نکلنا شروع ہو گیا ہے، وہ ان کے گن گانے لگا ہے۔ تو کیا وہ مہرالنساء کی بیٹی کو بیاہ کے لے آئے گا؟ اس مہرالنساء کی بیٹی جس کے فراق میں مجھے میرے ہی شوہر نے چھوڑ دیا؟ اس نے اس عورت کے لئے مجھ سے منہ پھیر لیا؟ مجھے نظر انداز کر کے چلا گیا؟ مجھے غیر اہم کر گیا، مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا اس شخص نے؟ صرف...... صرف اس عورت، اس مہرالنساء کی خاطر اس کے عشق اور فراق میں ڈوب کر اس نے میری ذات بے وقعت کر ڈالی اور اب۔ اب اس کی بیٹی اس گھر میں آئے گی میرے بیٹے کی دلہن بن کے؟ ہرگز نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہو گا...... رابعہ شیرازی مر جائے گی لیکن ایسا نہیں ہونے دے گی، چاہے مجھے خود عارفین کی دوسری شادی کسی اور سے کرنا پڑ جائے لیکن مہرالنساء کی بیٹی...... کبھی نہیں۔'' رابعہ شیرازی اپنی سوچوں میں پھنکارتی ہوئیں اٹھ گئی تھیں، ان کا ذہن اب نئے پلان ترتیب دے رہا تھا۔ اب وہ عارفین کی خفیہ شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا بابا جان کو بھی علم نہ ہوتا اور بچہ بھی ہو جاتا۔ ایک ایسا بچہ جو پوری دنیا کے سامنے عارفین اور زونلہ کا بچہ کہلاتا۔ اس بچے کی ماں چاہے کوئی بھی ہوتی لیکن باپ عارفین ہی ہوتا اور اس پلان کے لئے انہیں اب صبر کی ضرورت تھی اور عارفین کو اپنی مٹھی میں لینے کی۔

◈......◈......◈

ڈاکٹرز نے آپریشن کے دو ہفتے بعد بہروز بھائی کو ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا تھا لیکن یہ تاکید سختی سے کی تھی کہ انہیں مکمل آرام اور بیڈ ریسٹ کی اشد ضرورت ہے، اور علاج کے دوران ذرا سی بھی بے احتیاطی یا پھر بدپرہیزی ان کی جان خطرے میں ڈال سکتی ہے لہٰذا وہ لوگ ان کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور حد سے زیادہ احتیاط سے کام لیں، اور ایسے میں اروی نے ڈاکٹرز کو پورا یقین دلا دیا تھا کہ وہ بہروز بھائی کا بھرپور طریقے سے خیال رکھیں اور پراپر علاج کروائیں گے۔ اروی کی ہمت حوصلہ اور یقین دیکھ کر ایک پل کے لئے تو امی کو بھی اپنی اتنی بہادر اور

باہمت بیٹی پہ رشک آیا تھا اور خود پہ فخر محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کی ماں ہیں۔ جس روز وہ ڈسچارج ہو کر گھر آئے وہ لوگ بہت خوش تھے۔

''مبارک ہو بھئی آج بھائی صاحب گھر آ گئے ہیں۔'' جرار باقاعدہ انہیں مبارکباد دینے گھر آیا تھا۔

''خیر مبارک بیٹا اللہ تمہیں بھی زندگی دے، آؤ بیٹھو......'' امی آج بہت خوش تھیں اور ان کی خوشی ان کے لہجے ان کی آواز سے ہی جھلک رہی تھی۔

''میں ذرا بھائی صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں۔'' وہ امی کے برابر کرسی چھوڑ کر بہروز بھائی کے قریب آ بیٹھا تھا۔

''سلام بھائی صاحب کیسی طبیعت ہے اب؟ کیسا فیل کر رہے ہیں؟'' وہ بیٹھتے ہی شروع ہو چکا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے، ابھی تک تو بہتر ہوں۔'' بہروز بھائی کے لہجے میں غیر محسوس سی اداسی تھی ان کے چہرے پہ فکر کے سائے تھے، جب تک وہ ہسپتال میں رہے ان کا ذہن جاگا سویا سا رہا تھا اور ان کی سوچیں بھی منتشر اور بے ربط سی رہی تھیں لیکن گھر آ کر جیسے سب کچھ ٹھہر گیا سوچیں، خیالات اور فکریں ایک ہی مرکز پہ رک گئی تھیں کہ بستر پہ پڑے ہیں اور ان کی ماں بہنیں فکروں میں گھری ہوئی ہیں۔ یہ گھر جو پہلے صرف اور صرف ان کے بل بوتے پہ چل رہا تھا اب...... اب اس گھر کا نظام کیسے چلے گا؟ کون سنبھالے گا پورے گھر کو؟ کیا بنے گا ان کے بیوی بچوں اور ماں، بہنوں کا؟ جبکہ دوسرا کوئی آسرا نہیں، سہارا بھی نہیں تھا۔

''سنا ہے اروی نے جاب کر لی ہے اور کافی پرکشش سیلری مل رہی ہے اسے؟'' جرار کی بات پہ بہروز بھائی نے بری طرح چونک کر جرار کو دیکھا تھا اور چائے کی ٹرے لے کر آتی اروی کے قدم کمرے کی چوکھٹ میں ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے اس نے غصے سے جرار کو دیکھا جو نہ جانے کہاں سے الٹی سیدھی ہانکنے آ جاتا تھا اور بات کرتے ہوئے کوئی موقع محل بھی نہیں دیکھتا تھا۔

''اروی نے جاب کر لی ہے؟'' بہروز بھائی پوچھ نہیں رہے تھے صرف دہرا رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز جیسے کہیں دور آ رہی تھی ان کا لہجہ ڈوب سا گیا تھا۔

''بھائی آپ کے لئے یہ سوپ اور جرار صاحب آپ کے لئے یہ چائے......'' اروی نے اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے آگے بڑھ کے درمیانی میز پہ ٹرے رکھی اور کافی بشاشت سے بولی تھی۔

"اروی تم جاب......؟" بہروز بھائی نہ جانے کیوں کچھ بول نہیں پائے تھے۔

"جی بھائی مجھے تقریباً ایک ہفتہ ہونے والا ہے، میں نے جاب کر لی ہے آپ کو اس لئے نہیں بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت بھی اتنی ٹھیک نہیں تھی۔ سوچا آپ گھر آ جائیں گے تو بتا دوں گی، امی نے بھی منع کیا تھا بتانے سے۔" اروی نے بات کرتے ہوئے اپنے لہجے کو بہت ہی نارمل رکھا تھا تاکہ وہ کوئی ٹینشن نہ لیں۔

"لیکن بیٹا......"

"پلیز بھائی آپ مجھے بیٹا کہتے ہیں تو مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔ میں آپ کی بہن نہیں آپ کا بھائی، آپ کا بیٹا ہوں۔" اروی قریب بیٹھے جرار کو یکسر نظر انداز کئے اپنے بھائی کا ہاتھ تھامے انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"لیکن بیٹا تم ابھی بہت کم عمر ہو، تمہیں کیا پتہ دنیا کیسی ہے؟" وہ کمزور سے لہجے میں بولے تھے۔

"بھائی میں دنیا کو دیکھوں گی تو مجھے پتہ چلے گا نا کہ دنیا کیسی ہے؟ دنیا کو جاننے اور سمجھنے کے لئے دنیا کا سامنا کرنا، دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ میں بھی دنیا کو دیکھنے نکل چکی ہوں بس آپ میرے لئے دعا کیجئے۔

ویسے بھی میں نے کونسا عمر بھر کے لئے جاب کرنی ہے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو میں فوراً جاب چھوڑ دوں گی۔" وہ کہتے کہتے آخر میں ہلکے سے مسکرائی تو وہ جواباً چپ ہو گئے اور اروی کو اشارہ کر کے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے جرار اٹھ کر خاموشی سے باہر آ گیا تھا۔

❁......❁......❁

بی بی جان کی طبیعت اتنے دنوں سے سنبھل نہیں پا رہی تھی اس لئے بابا جان انہیں شہر لے آئے تھے اور عارفین جی جان سے ان کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ بابا جان پوتے کی اتنی فکر مندی اتنی محبت اور توجہ دیکھ کر بہت خوش تھے کہ کم از کم ان کے پوتے کو تو اپنے دادی، دادا کی فکر ہے نا۔

"بابا جان آج چار بجے کا ٹائم لیا ہے ڈاکٹر سے، بی بی جان کے چیک اپ کے لئے، کل جو شوگر کے ٹیسٹ کروائے تھے آج ان کی بھی رپورٹ مل جائے گی۔" وہ صبح آفس جانے کے لئے تیار ہو کر نیچے آیا تو پہلا سامنا بابا جان سے ہی ہوا تھا۔

"جیتے رہو بیٹا اللہ تمہیں خوش رکھے۔" بابا جان عارفین کو سر تا پا دیکھ کر بولے تھے لیکن لہجہ کچھ بھیگ سا گیا تھا وہ شاید عارفین کے قد کاٹھ میں اور نین نقوش میں اس وقت اپنے بیٹے کی جھلک تلاش کر رہے تھے، اور پوتے میں بیٹے کی شبیہہ پا کر ان کی پلکوں کے کنارے ہی نہیں آواز بھی بھیگ گئی تھی۔ بابا جان اور بی بی کو آج تک بیٹے کی جدائی پہ صبر نہیں آیا تھا شاید اس لئے کہ ان کا بیٹا زندہ سلامت ان سے جدا ہوا تھا اگر ان کا بیٹا مر گیا ہوتا تو شاید اسے مردہ سمجھ کر ہی انہیں صبر آ جاتا...... اور یہ روایت تو ازل سے چلی آ رہی ہے کہ انسان صرف موت پہ صبر کرتا ہے۔ زندگی پہ نہیں۔

"بابا جان کیا دیکھ رہے ہیں۔" عارفین واپس پلٹنے لگا تھا مگر ان کی محویت دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹا تم آفس جاؤ۔" وہ اپنے دل کے کمزور جذبات کو سنبھالتے ہوئے سنبھل گئے تھے۔

"او کے اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر پلٹ گیا لیکن ذہن بابا جان کی بھیگی آنکھوں کے احساس میں اٹکا ہوا تھا ڈرائیونگ کے دوران بھی وہ بابا جان کے دکھ کو خود پہ طاری کئے ان کی کیفیت اور جذبات کے متعلق سوچتا ہوا کافی سنجیدہ لگ رہا تھا کہ اچانک وہ بری طرح چونک گیا اور فوراً ہی گاڑی سنبھالتے ہوئے بریک لگائے تھے کوئی لڑکی اچانک سامنے آ گئی۔ عارفین نے غصے سے تلملا کر اس لڑکی کو دیکھا جو اتنی عجلت کا مظاہرہ کرتی اتنا خطرناک رسک لے رہی تھی۔

"میڈم آپ پاگل تو نہیں ہیں؟" وہ یکدم دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اور اس کی آواز پہ اپنا بیگ سنبھالتی اروی بھی چونک گئی تھی۔

"سر آپ؟" اس نے حیرانی سے دیکھا جبکہ عارفین بھی اپنی جگہ پہ اسی طرح حیران کھڑا تھا۔

"مس اروی مجھے لگتا ہے آپ ایک روز مجھے جیل بھیج کر ہی دم لیں گی۔" عارفین نے ایکسیڈنٹ کی سمت اشارہ کیا تھا اور اروی سچ مچ اپنی غلطی پہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

"سوری سر! میں ان فیکٹ آفس جانے کی جلدی میں تھی۔"

"اوہ تو پھر آئیے آپ کو آفس چھوڑ دوں آپ لیٹ ہو رہی ہیں۔" اس نے آفر کی تھی۔

"نو تھینکس سر میں چلی جاؤں گی۔" اس نے فوراً انکار کر دیا تھا۔

"آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گی تو مزید لیٹ ہو جائیں گی کیونکہ میں آپ سے

پہلے پہنچ جاؤں گا جبکہ آپ کا مجھ سے پہلے آفس پہنچنا زیادہ ضروری ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں کیونکہ اکٹھے جانے سے کوئی بھی لیٹ نہیں ہوگا۔'' عارفین کی دلچسپ وضاحت اور آفر پہ اروئ کو ذرا دیر کے لئے سوچنا پڑا تھا، اور اس کو سوچ میں دیکھ کر عارفین نے آگے بڑھ کے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

❁......❁......❁

''دیکھئے حمید صاحب! جب تک میرا کراچی والا پروجیکٹ مکمل نہیں ہو جاتا، میں مری والے پروجیکٹ پہ ہرگز کام نہیں کروں گا، میں جو بھی کام کرتا ہوں پوری ایمانداری اور محنت سے کرتا ہوں، میں صرف پیسہ کمانے کے چکر میں نہیں ہوں، میرا ایک نام ہے، ایک معیار ہے اور اپنے معیار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ میں کام پہ خود دھیان دوں اور مری والے پروجیکٹ پہ کام کرنا ایک بہت ہی حساس پروجیکٹ پہ کام کرنے کے مترادف ہے۔ انشاء اللہ جتنا ٹائم میں نے آپ کو دیا ہے اس ٹائم پہ آپ کو اپنا پلازہ تیار ملے گا اور ویسے بھی مری میں میرا ایک اور پروجیکٹ بھی شروع ہونے والا ہے۔'' عارفین اپنے کلائنٹ سے کافی تفصیلی بات کر رہا تھا اور اس کے قریب رکھی چیئر پہ بیٹھی اروئ اس گفتگو کو بے حد غور سے سن رہی تھی۔

''لیکن شیرازی صاحب کچھ اندازہ تو ہو کہ آپ کام کب شروع کر رہے ہیں؟'' حمید صاحب کچھ عجلت دکھا رہے تھے۔

''حمید صاحب میں تمام ضروری میٹریل کی بکنگ کروا چکا ہوں، ایک دو چیزیں اور ارینج کرنا باقی ہے، لیکن انشاء اللہ ایک ماہ تک مجھے پوری امید ہے کہ کام شروع ہو جائے گا۔'' اس نے انہیں پوری تسلی دی تھی، اور پھر مزید معاملات طے کرنے کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔

''مس اروئ میں بہت دنوں سے آپ کو انفارم کرنا چاہ رہا تھا کہ مجھے چند دن تک مری جانا پڑے گا اور وہاں کچھ ہفتے کا قیام بھی ہوگا۔ تو پھر آپ کیا کریں گی؟ آپ کے گھر والے آپ کو شہر سے باہر جانے کی اجازت دے دیں گے؟'' عارفین نے اپنی چیئر گھماتے ہوئے اچانک اروئ کی سمت رخ کیا تھا اور وہ اس کے سوال پہ ایک دم سے پریشان ہوگئی تھی۔

''لیکن سر میں کیسے آپ کے ساتھ؟''

''مس اروئ حیات آپ میری پی اے ہیں اور آپ کا میرے ساتھ ہونا اس جاب کا حصہ ہے، اور اسی اونچ نیچ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے انٹرویو کے دوران آپ سے سوال بھی

کیا تھا، اور آپ کا کہنا تھا کہ آپ یہ ذمہ داری نبھا سکتی ہیں۔ لہٰذا آپ کا کوئی بھی جواز سامنے رکھنا بے کار ہے۔'' عارفین نے اپنی طرف سے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور وہ مزید مشکل اور پریشانی میں گھر گئی تھی۔

''سر آپ جانتے تو ہیں کہ میرے گھر میں......'' اس سے پہلے کہ اروئ بات مکمل کرتی اچانک پورے استحقاق سے دروازہ کھول کر رابعہ شیرازی دندناتی ہوئی اندر آ گئی تھیں۔

''مام آپ یہاں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''گھر میں تمہارے بابا جان اور بی جان نے جو قبضہ کر رکھا ہے اس لئے تم سے بات کرنے کے لئے تو آفس ہی آنا پڑے گا۔'' رابعہ شیرازی کے ناگوار لب و لہجے پہ عارفین ٹپٹا گیا تھا۔ اس نے فوراً اروئ کو دیکھا، وہ کافی الجھی ہوئی اور حیران نظر آ رہی تھی۔

''مام پلیز کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ آفس ہے، میرا کچھ تو خیال کریں۔'' وہ خفگی سے بولا تھا۔

''تمہارے بابا جان کچھ خیال کر رہے ہیں کیا؟ انہوں نے اچھی بھلی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔ آخر ایسی کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی اگر زوئلہ اور تمہارا بچہ نہیں ہوگا تو؟'' وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھیں اور اروئ ان کی گفتگو پہ شرمندہ سی ہوگئی تھی۔

''اوکے سر میں چلتی ہوں، بعد میں آ جاؤں گی۔'' وہ فوراً اجازت طلب کرتی ہوئی پلٹ گئی تھی اور عارفین اپنا سر تھام کے رہ گیا تھا، اب یہ نوبت آ گئی تھی کہ گھر کے مسئلے آفس تک آ گئے تھے۔

''مام یہ مسئلہ ہم آرام سے بیٹھ کر بھی سلجھا سکتے ہیں۔'' عارفین کو سچ مچ اروئ کے سامنے اپنی ماں کے لب و لہجے اور گفتگو پہ سبکی محسوس ہوئی تھی۔

''یہ مسئلہ صرف ہم سلجھانا چاہتے ہیں، لیکن تمہارے بابا نہیں، وہ چاہتے ہیں کہ انہیں زوئلہ میں کوئی نقص نظر آئے اور وہ اپنی چہیتی مہر النساء بیگم کی بیٹی کو بیاہ کر لے آئیں۔ میں ان کے سارے پلان کو سمجھتی ہوں، آج کل اسی لئے وہ گاؤں چھوڑ کر شہر رہنے کے لئے آئے ہوئے ہیں، تاکہ تم پہ نظر رکھیں اور تمہیں ورغلا سکیں۔'' رابعہ شیرازی چنگاریاں چھوڑ رہی تھیں۔

''مام پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے، جیسا آپ سمجھ رہی ہیں، مہر النساء آنٹی کی بیٹی......''

''شٹ اپ میرے سامنے اس کمینی، منحوس، جادوگرنی کو کبھی بھی آنٹی مت کہنا۔'' عارفین ان کے ہذیانی انداز پہ حیرت زدہ انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔

''اور ہاں اتنا یاد رکھنا تم اگر دوسری شادی کرو گے تو میری پسند سے، ...... دوسری صورت

میں تم میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔ میں کسی بھی لڑکی کو تمہاری دوسری بیوی اور زولکہ کی سوتن کے روپ میں دیکھ سکتی ہوں، مگر مہر النساء کی بیٹی کو نہیں۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھیں اور عارفین کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ آندھی طوفان کی طرح کمرے سے بھی نکل گئی تھیں۔

''اف خدایا...... ان دو لوگوں کی جنگ اور ضد میں میرا وجود کہاں ہے؟ میرے جذبات، میرے احساسات کہاں ہیں؟ یہ لوگ میری ذات کو کیوں چکی میں پیس رہے ہیں؟'' وہ بالوں میں ہاتھ پھنسا کر بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا، وہ نہ جانے کیوں آفس سے اٹھ کر باہر نکل آیا تھا۔

''سنئے سر وہ مسز ہمدانی آپ سے ملنے......'' اروی پیچھے سے پکارتی رہ گئی، لیکن وہ کچھ بھی سنے بغیر سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ اس وقت اسے سب کچھ برا لگ رہا تھا بہت برا۔

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا جب ان کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔

''اروی، سارہ جلدی آؤ، تمہارے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' بھابی کی گھبرائی بوکھلائی سی آواز ان کے اعصاب پہ ہتھوڑے کی مانند برسی تھی اور وہ تینوں ماں، بیٹیاں یک دم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تھیں، اور پھر رات کے دو بجے ان کے گھر میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ فوراً ایمبولینس کو کال کی گئی اور وہ روتے دھوتے انہیں لے کر بمشکل ہسپتال پہنچی تھیں۔ بہروز بھائی دل کا دورہ پڑتے ہی بے ہوش گئے تھے، لیکن ان کو دیکھ کر ہی ان کی اذیت ناک حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹرز انہیں فوری آئی سی یو میں لے گئے تھے اور کچھ ہی دیر میں ان کی مزید ٹریٹ منٹ شروع ہو گئی اور پھر صبح کے قریب ڈاکٹرز نے انہیں روح فرسا خبر سنائی تھی۔ جس کو سن کر وہ سبھی ساکت ہو گئی تھیں۔

''بائی پاس؟'' امی زیر لب دہرا کر بولی تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ خود بھی زمین بوس ہو گئی تھیں۔

دو، تین روز سے بی بی جان کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ اس لئے وہ واپس گاؤں جانے پہ اصرار کر رہی تھیں اور آج ان کی ضد پہ بابا جان انہیں لے کر واپس جا رہے تھے، لیکن جانے سے پہلے وہ عارفین سے حتمی بات کرنا چاہتے تھے، جبکہ رابعہ شیرازی بھی تاک میں بیٹھی تھیں کہ وہ لوگ ابھی

تک گئے کیوں نہیں؟ تھوڑی دیر بعد عارفین تیار ہو کر نیچے آیا تو بابا جان فوراً ہی متوجہ ہوئے تھے۔

''لگتا ہے آج کافی گہری نیند سوئے تھے جبھی آفس سے بھی لیٹ ہو گئے ہو؟'' انہوں نے اخبار رول کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں آج سویا ہی نہیں تھا، اس لئے لیٹ ہو گیا ہوں۔'' اس کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور گھمبیر تھا۔

''کیوں خیریت؟ کیوں نہیں سوئے تھے؟'' بابا جان متفکر سے ہوئے تھے۔

''بس ایسے ہی...... کچھ سوچتے ہوئے رات گزر گئی۔'' وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے آہستگی سے بولا تھا۔

''ہوں...... اچھی بات ہے، کبھی کبھی سوچ سے بھی کام لے لینا چاہیے، ہم بھی کچھ سوچ رہے تھے، اسی لئے تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔'' بابا جان عارفین کا سنجیدہ موڈ دیکھ کر مطمئن تھے کہ بات حتمی اور اچھے طریقے سے ہو جائے گی۔

''میرا انتظار؟'' اس نے کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے ہماری قسم، ہمارے فیصلے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیا ارادہ ہے اب؟'' بابا جان کی بات پہ عارفین کا دماغ گھوم کے رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی، اس کا آرام و سکون بس اس سوال کی نذر ہو کے رہ گیا تھا۔ کتنے ہی لمحے وہ خاموش بیٹھا اپنے اندر کے ابال کو کنٹرول کرنے میں لگا رہا تھا۔

''تم چپ کیوں ہو گئے عارفین؟'' انہوں نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

''بابا جان کیا آپ اپنی اس قسم، اس ضد کا دامن چھوڑ نہیں سکتے؟'' اس کا لہجہ بہت دھیما مگر تھکن زدہ تھا۔ وہ اپنی ماں اور دادا جان کی سالوں پرانی جنگ کے ہاتھوں بری طرح تھک چکا تھا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ صرف اپنے لئے سوچا تھا، کبھی عارفین کی ذات کی پروا ہی نہیں کی تھی اور وہ ان لوگوں کو اپنی ذات کا مان دیتے ہوئے ان کی ہر اچھی، بری بات بھی مانتا چلا جاتا تھا، لیکن وہ پھر بھی اس کا احساس نہیں کرتے تھے۔

''کیا تم ہمیں بے نام و نشان کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے دل میں بھی اب اپنے باپ جیسی سرکشی سر ابھارنے لگی ہے؟ یا پھر صاف صاف کہو کہ تم باپ نہیں بن سکتے؟ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، کوئی پرابلم ہے تمہیں، تم ہماری خواہش پوری کرنے سے اور اپنی نسل آگے

بڑھانے سے قاصر ہو؟" بابا جان آج پہلی بار عارفین پہ اس قدر مشتعل اور غصہ ہوئے تھے اور اتنی شدت سے ہوئے کہ وہ عارفین کی مردانگی کو بھی ٹھیس پہنچانے سے باز نہیں آئے تھے، وہ ان کے طعنے کی چوٹ سے بلبلا کے رہ گیا تھا۔

"پلیز بابا جان یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" عارفین کی مردانگی پر...... بہت کاری ضرب لگی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم...... تم ہماری خواہش پوری کرنے سے کترا کیوں رہے ہو؟ مرد ہو تو دوسری شادی کرو اور ہمیں اولاد دو، ہم ترسے بیٹھے ہیں، ہمیں زندہ رہنے کے لئے کسی خوشی، کسی سہارے کی ضرورت ہے، ہم اپنی نسل کو ختم ہوتے نہیں دیکھ سکتے، تمہیں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ اگر دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے نہ کرو، مگر پھر اپنی بیوی سے کہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بنے، ہمیں وارث دے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، علاج کرواؤ، چاہے انگلینڈ لے جاؤ اور اس کے لئے سارا خرچہ ہم افورڈ کریں گے۔" بابا جان اس بار کوئی بھی چھوٹ دینے کو تیار نہیں تھے اور دوسری طرف رابعہ شیرازی بھی جیسے سر، دھڑ کی بازی لگائے بیٹھی تھیں، عارفین ان لوگوں کے درمیان محض ایک فٹ بال بن کے رہ گیا تھا۔ اس کے اعصاب اتنے شل ہو رہے تھے کہ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، آج پہلی بار وہ جاتے ہوئے بی بی جان سے بھی نہیں ملا تھا اور بغیر سوچے سمجھے ہی اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔

"منیجر صاحب آپ کا عارفین سر سے رابطہ ہوا کوئی؟" اروی نے بہت بے چینی سے پوچھا تھا۔ اسے آج تیسرا دن تھا، وہ مسلسل عارفین شیرازی کے سیل فون پہ رابطہ کر رہی تھی۔ مگر اس کا سیل مسلسل ہی آف جا رہا تھا۔ اس نے عارفین کے گھر بھی کال کی تھی۔ وہاں سے بس یہ پتہ چلا تھا کہ وہ شاید اسلام آباد گئے ہیں۔ اب اسلام آباد میں وہ کہاں ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ موبائل کیوں آف ہے؟ یہ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ اروی جس کے پاس ان کے پل پل کی خبر اور آنے جانے کی پوری لسٹ ہوتی تھی آج وہ بھی بے خبر تھی اور ان کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اسے یقیناً عارفین کی غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن اس کا بھائی ہسپتال کے آئی سی یو میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا اور اس جنگ میں زندگی کی فتح کے لئے روپے کی سخت ضرورت تھی اور روپے کی خاطر جھولی پھیلانے کے لئے عارفین شیرازی کی

موجودگی بھی بے حد ضروری تھی۔ اپنے بھائی کی زندگی کے لئے اللہ کے بعد اسے صرف عارفین پہ امید تھی، لیکن وہ تھا کہ مل کے نہیں دے رہا تھا۔ نہ جانے کہاں بزی ہو گیا تھا۔ حالانکہ اروی نے منیجر صاحب سے کچھ رقم آفس کی طرف سے ایڈوانس لینے کی بھی بات کی تھی۔ مگر منیجر صاحب اپنے باس کی اجازت اور موجودگی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"منیجر صاحب آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ پلیز بتائیے نا۔ سر سے رابطہ ہوا آپ کا؟ وہ کہاں ہیں؟" اروی کا لہجہ تین دن کی مسلسل خواری اور بھائی کی تکلیف اور اذیت کا سوچ کر روہانسا ہو گیا تھا، جبکہ اس کی پریشانی اور شکل دیکھ کر منیجر صاحب اپنی جگہ پہ بہت شرمندہ اور چپ سے ہو گئے تھے۔

"سوری میم آج بھی ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا، ہو سکتا ہے وہ کسی گھریلو کام یا مسئلے کی وجہ سے کہیں کام سے گئے ہوں، ایسے میں ان کی وائف یا پھر مدر کو ہی پتہ ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں ہیں؟" منیجر صاحب بات کرتے ہوئے بہت شرمندہ ہو رہے تھے۔ انہیں اروی کی پریشانی کا بخوبی اندازہ تھا، لیکن وہ خود سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے چند ہزار کی مدد کے۔

"تو کیا میں ان کے گھر جا کے ان کا پتہ کر سکتی ہوں؟" اروی کے بھیگے لہجے میں بے تابی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔ پتہ کرنے میں کیا حرج ہے؟" منیجر صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی تھی اور وہ اپنے گرتے ہوئے حوصلوں کو پھر سے کھڑا کرتی تیزی سے مڑ گئی تھی، عارفین کے گھر جانے کے لئے۔

"مام یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" زونلہ، رابعہ شیرازی کی بات سن کر حیران رہ گئی تھی۔

"ایسا ہو سکتا ہے اور...... ایسا ضرور ہوگا، تم دیکھنا میں سب کی خواہش، سب کی ڈیمانڈ پوری کروں گی، بابا جان کو ان کا "وارث" مل جائے گا، عارفین کو "اپنی اولاد" پالنے کا موقع ملے گا اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوتن کے خطرے سے نکل آؤ گی اور عارفین کی بیوی بن کے اس گھر پہ راج کرو گی اور رہی مہرالنساء تو وہ...... ایک بار پھر زندگی میں ناکام بیٹھی اپنے زخم چاٹتی رہ جائے گی، اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر کامیابی میرے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی۔ پھر میں

دیکھوں گی کہ بابا جان تمہیں ناگوار نظروں سے کیسے دیکھتے ہیں؟ دیکھنا زوئلہ یہ بچہ تمہیں تخت پہ بٹھا دے گا۔ بی بی جان اور بابا جان تمہارے آگے پیچھے پھیریں گے۔ تم اس بچے کی ماں ہی نہیں بلکہ ملکہ کہلاؤ گی۔'' رابعہ شیرازی کا پلان بہت طویل اور بہت سنگین تھا۔ زوئلہ ڈانواں ڈول تھی۔ مگر رابعہ شیرازی اپنے فیصلے، اپنے آئیڈیے پہ قائم تھیں۔

''لیکن مام کیا کوئی لڑکی اس کام کے لئے رضا مند ہو جائے گی؟''

''میری جان پیسہ ہر ایک کو رضا مند کر لیتا ہے۔ میری ایک دوست کا دارالامان ہے۔ وہاں بہت سی لڑکیاں ہیں، ضرورت مند بھی ہیں اور کچھ رنگین مزاج بھی ہیں، بس کسی ایک کو قابو میں کر کے اپنا کام اور اس کا کام کروالیں گے۔'' رابعہ شیرازی بالکل تیار اور مطمئن بیٹھی تھیں۔

''اور عارفین؟'' زوئلہ ہر پوائنٹ ڈھونڈ کے لا رہی تھی۔

''اس کی رضا مندی تم مجھ پہ چھوڑ دو۔''

''السلام وعلیکم میڈم، کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' اچانک ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے آواز ابھری تھی۔ ان دونوں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا تھا۔

''میڈم میں عارفین سر کی پی اے ہوں۔'' اروٰی ان کی سوالیہ نظریں دیکھ کر فوراً بولی تھی۔

''ہوں! آؤ، آؤ اندر آ جاؤ۔'' رابعہ شیرازی چونک سی گئی تھیں۔ انہوں نے اس لڑکی کو عارفین کے آفس میں بھی دیکھا تھا، اور شاید اس کے ساتھ کہیں اور بھی دیکھا تھا۔ اروٰی اندر تو آ گئی تھی۔ مگر اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سامنے شاہانہ انداز میں بیٹھی دونوں عورتوں سے کیا کہے؟

''بیٹھیے کیسے آنا ہوا آپ کا؟'' رابعہ شیرازی اس کا سر تا پا جائزہ لے رہی تھیں۔

''میڈیم آج تیسرا روز ہے عارفین سر کا موبائل فون مسلسل آف ہے، ہم لوگ ان کے نمبر پہ ٹرائی کر کر کے تھک گئے ہیں، ان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے، میں آپ سے پوچھنے کے لئے آئی ہوں کہ کیا آپ کا ان سے کوئی رابطہ ہے؟'' اروٰی اپنے حواس، اپنے اعصاب یکجا کرتے ہوئے بمشکل بات مکمل کر پائی تھی۔ رابعہ شیرازی اسے بغور دیکھ رہی تھیں، جبکہ زوئلہ اسے سرسری نظر سے دیکھ کر میگزین دیکھنے میں لگ گئی تھی۔

''کیوں کیا ضروری کام ہے اس سے؟ کوئی آفس پرابلم وغیرہ؟'' انہوں نے سوال کیا تو اروٰی گڑبڑا گئی۔

''نہیں میڈم ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، ہم تو بس......'' وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔

''آپ لوگ پریشان مت ہوں، وہ جب بہت زیادہ ٹینس ہوتا ہے تو اسی طرح گھر سے چلا جاتا ہے، جب کچھ ریلیکس ہوگا تو فوراً آ جائے گا، وہ جان بوجھ کر کسی سے بھی رابطہ نہیں کر رہا۔'' انہوں نے اروٰی کو تسلی دی، مگر اروٰی کو تو اس وقت کسی اور تسلی کی ضرورت تھی......مگر......

''او کے میڈم۔ میں چلتی ہوں، اگر وہ آپ سے رابطہ کریں تو پلیز ان سے کہیے گا کہ پی اے سے رابطہ کر لیں۔'' اروٰی تھکے تھکے مایوس قدموں سے واپسی کے لئے پلٹ گئی تھی۔ رابعہ شیرازی اسے تولتی ہوئی جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پرکھ رہی تھیں۔

''سنو لڑکی! ادھر آؤ۔'' کافی حاکمانہ سا انداز تھا۔

''جی میڈم؟'' وہ بمشکل پلٹ کر ان کے سامنے آئی اور آنکھ کے کناروں تک آئے آنسو بھی بڑی مشکل سے واپس دھکیلے تھے۔

''تمہیں کوئی ذاتی کام ہے عارفین سے؟''

''جی میڈم۔'' وہ نہ جانے کیوں انکار نہیں کر پائی تھی۔

''کیا کام ہے؟''

''میرے بڑے بھائی دل کے مریض ہیں، ان کے بائی پاس کے لئے رقم کی ضرورت ہے، اس لئے میں سر سے ایڈوانس لینے کے لئے آئی تھی۔ مگر وہ اتنے دنوں سے آفس ہی نہیں آئے اور ان کا موبائل بھی آف ہے، میں نے منیجر صاحب سے بھی کہا ہے، مگر انہوں نے انکار کر دیا ہے کہ وہ سر کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔'' اروٰی بغیر رکے بولتی چلی گئی تھی۔

''اتنی بڑی رقم تو میرا خیال ہے کہ عارفین بھی نہیں دے گا، وہ بھی کسی گارنٹی کے بغیر۔'' رابعہ شیرازی کے شاطرانہ دماغ نے پل میں کروٹ بدلی تھی اور اپنے نئے کھیل کے لئے مہرہ تلاش کیا تھا اور اس تلاش میں ان کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ کیونکہ ''ضرورت مند'' خود چل کے ان کے پاس آ گیا تھا۔ جبکہ وہ ضرورت مند کے پاس جانے سے بچ گئی تھیں۔

''میڈم پلیز، میں...... میں کوئی بھی گارنٹی دینے کو تیار ہوں، پلیز مجھے اپنے بھائی کی زندگی سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہے۔'' اروٰی بے بسی کے ہاتھوں بے اختیار ہو گئی تھی اور اس نے عارفین کا مزید انتظار کئے بغیر رابعہ شیرازی کے سامنے جھولی پھیلا ڈالی تھی، اس وقت اگر اسے کسی کے قدموں میں گر کر بھیک بھی مانگنا پڑتی تو وہ مانگ لیتی۔ کیونکہ اس کی انا، اس کی عزت نفس سے زیادہ اس وقت بہروز بھائی کی زندگی اہم تھی۔

"جو میں کہوں گی وہ کرو گی؟" رابعہ شیرازی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"شکار" ان کے سامنے کھڑا تھا۔ بس اسے اپنے جال میں گھیرنے کی دیر تھی۔

"جی میڈیم آپ جو کہیں گی میں کروں گی، بس میرے بھائی کا آپریشن......"

"تمہارے بھائی کا آپریشن بھی ہوگا، تمہارے گھر کے اخراجات بھی پورے ہوں گے، تمہارے بھائی کا پورا پورا علاج ہوگا۔ جب تک ڈاکٹرز نے چاہا وہ ہسپتال میں ہی رہے گا۔ تمام بل میں خود ادا کروں گی، تمہیں پیسے کی کمی نہیں ہوگی، بس تمہیں کام میری پسند سے کرنا ہوگا، جیسا میں چاہوں گی ویسا ہی کرنا پڑے گا۔" رابعہ شیرازی نے "اروی حیات" کو خریدنے کے لئے اپنی امیری کا در کھول دیا تھا اور اروی حیات اپنے بھائی کی زندگی کی خاطر اپنی غریبی، اپنی مفلسی اور اپنی پوری ذات سمیت کھڑے کھڑے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر امیری کے در پہ بک گئی تھی۔

"میڈم میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، بس آپ بتا دیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟" اروی کو کچھ آس و امید کی کرن نظر آئی تو لہجہ کچھ سنبھل سا گیا تھا۔ رونق آ گئی تھی اس کے چہرے پہ۔

"تمہیں عارفین سے شادی کرنا ہوگی، محض کچھ عرصہ کے لئے......صرف ایک بچے کے پیدا ہو جانے تک...... یہ شادی سب سے خفیہ ہوگی، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ نہ تمہارے گھر والوں، نہ ہمارے خاندان کو، وہ بچہ زونلہ کا بچہ کہلائے گا۔ اس کی ماں زونلہ ہوگی۔" رابعہ شیرازی بہت کچھ کہتی جا رہی تھیں، مگر اروی کے قدموں سے جیسے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے بمشکل رابعہ شیرازی اور زونلہ شیرازی کے چہرے دیکھے تھے۔

❁......❁......❁

"رکئے مس اروی!" اپنا کام بنا کر آفس روم سے باہر نکلتی اروی کے قدم اس کی آواز پہ تھم گئے تھے۔ "جی سر کہئے؟" وہ آہستگی سے بولی چہرہ جھکا ہوا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"جی سر میں ٹھیک ہوں۔" وہ آج پورے دو ہفتے کے بعد آفس آیا تھا۔ وہ اس روز کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر ٹینشن کی وجہ سے بے ارادہ ہی مری چلا گیا تھا اور جان بوجھ کر سیل آف کر دیا تھا کہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ خصوصاً رابعہ شیرازی اور بابا جان، اور پھر مری والے پروجیکٹ کا سیٹ اپ کرتے کرتے ٹینشن بھی دور ہو گئی تھی اور اعصاب بھی کچھ بہتر ہو گئے تھے،

جبھی آج صبح ہی ذرا فریش موڈ کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔

"مس اروی آپ کے بھائی کیسے ہیں؟ ان کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" اس نے دُہرا کے پوچھا تھا۔ اسے اروی کا مزاج، اس کے تیور، اس کا انداز بہت بدلے بدلے کترائے ہوئے اور کچھ کچھ شکوہ کناں سے لگ رہے تھے۔ جبھی وہ اسے کرید رہا تھا۔

"جی اب وہ ٹھیک ہیں۔" وہ دھیمے سے کہہ کر فوراً باہر نکل گئی تھی اور اندر داخل ہوتے منیجر صاحب سائیڈ پہ ہو گئے تھے۔ عارفین سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"سلام سر۔ کیسے ہیں آپ؟" منیجر صاحب نے اسے متوجہ کیا تھا۔

"والسلام بیٹھئے۔"

"کیا سوچ رہے آپ؟"

"میں مس اروی حیات کے متعلق سوچ رہا ہوں، کچھ ٹینس لگ رہی ہیں۔" عارفین نے فوراً اظہار کیا تھا۔

"جی سر وہ تھوڑی سی ٹینس نہیں ہیں، وہ بہت زیادہ ٹینس رہی ہیں۔ دراصل ان کے بھائی کو پھر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ان کے ہارٹ کی کنڈیشن بہت ویک تھی۔ شاید لاسٹ اسٹیج پہ تھا۔ ڈاکٹرز نے بائی پاس تجویز کیا تھا، ان کے دل کی شریانوں میں خون پھر سے رک گیا تھا۔ ان کی حالت بہت خراب تھی اور مس اروی بے حد پریشان تھیں۔ آپریشن کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ آفس کی طرف سے کچھ رقم ایڈوانس لینے کے لئے بھی آئی تھیں۔ مگر میں آپ کی اجازت کے بغیر ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اتنے دن آپ کے نمبر پہ بھی ٹرائی کرتی رہی تھیں۔ آپ کے گھر سے بھی آپ کا پتہ کیا تھا۔ مگر آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔" منیجر صاحب کی بات پہ عارفین بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اروی کی پریشانی اور مشکل وقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

"پھر اب...... وہ کیسے ہیں؟ کیا ہوا ہے؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا کہ کہیں کوئی انہونی نہ ہو گئی ہو۔

"اب وہ کافی بہتر ہے، خطرے سے باہر ہیں اور ان کا بائی پاس بھی ہو چکا ہے۔"

"بائی پاس ہو چکا ہے؟ کب کہاں سے ہوا؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"شاید یہیں کراچی سے "دی ہارٹ سینٹر" سے ہوا ہے۔"

"اوہ پھر تو کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ان لوگوں کو؟"

"جی کافی سے بھی زیادہ مشکل وقت تھا ان لوگوں پہ، اللہ بھلا کرے اس آدمی کا جس نے ان کی ہیلپ کی ہے، ایک ہنستے بستے گھرانے کا چراغ بجھنے سے بچالیا ہے۔"

"کس نے ہیلپ کی ہے ان کی؟" اس نے چونک کر پوچھا تھا۔

"سر یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ، شاید اس آدمی نے اپنی نیکی پردے میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔" مینیجر صاحب بھی اروی کی طرف سے خاصے متفکر ہو رہے تھے۔ عارفین کو سب کچھ جاننے کے بعد بے حد افسوس ہو رہا تھا اور اپنے آپ پہ غصہ بھی آیا تھا کہ اتنے دن وہ گھر سے باہر رہا اور فون بھی آف رکھا۔ اگر ایسی لاتعلقی، ایسی لاپروائی میں ہی اس کے پیچھے کسی کو کچھ ہو جاتا تو؟ اگر اس کے اپنے ہی گھر والوں کو کوئی مصیبت آن پڑتی، کوئی کام آن پڑتا تو پھر کیا ہوتا؟

اروی صبح صبح آفس جانے سے پہلے بہروز بھائی سے ملنے ہسپتال آئی تھی، لیکن آج گھر سے نکلتے نکلتے ہی وہ کافی لیٹ ہوگئی تھی اور پھر جیسے ہی وہ ہسپتال پہنچی اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے، اور اس کے چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ بہروز بھائی کے قریب ہی عارفین شیرازی بیٹھا ہوا تھا اور بہروز بھائی کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پہ بڑا سا سرخ گلابوں کا بکے رکھا ہوا تھا۔

"آؤ اروی تم رک کیوں گئی ہو، دیکھو عارفین بیٹا آیا ہے۔" امی نے خوشی خوشی بتایا تھا بھابی اور بھائی بھی بہت خوش اور مرعوب نظر آرہے تھے، آخر اتنا امیر، کبیر اور مصروف آدمی خود ان کی عیادت کے لئے آیا تھا۔

"السلام علیکم!" اروی نے لٹھ مار سے انداز میں سلام کیا تھا۔ عارفین نے ایک بار پھر اروی کے مزاج کی بیگانگی نوٹ کی تھی۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ وہ تو خاصی خوش اخلاق تھی۔ بہت عزت سے، بہت احترام سے پیش آتی تھی، مگر اب...... اب وہ خاصی بدلی ہوئی لگ رہی تھی اور عارفین کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ کیا وہ بغیر بتائے جانے پہ خفا ہے یا پھر کوئی اور خطا ہوگئی ہے؟"

"اروی آپ کی بہت تعریف کرتی ہے، وہ بتاتی رہتی ہے کہ آپ بہت کیئرنگ اور سوفٹ نیچر کے ہیں، پہلے تو ہم صرف سنتے تھے۔ مگر اب تو خود بھی یقین ہوگیا ہے کہ صرف آپ ہی نہیں آپ کی پوری فیملی ہی بہت اچھی ہے، آپ کی والدہ، آپ کی وائف بھی ماشاء اللہ بہت اچھے مزاج کی خاتون ہیں، اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھے۔" بہروز بھائی کی بات پہ عارفین

بری طرح چونکا تھا۔

"میری والدہ اور میری وائف؟ ان کی ملاقات ان سے کب ہوئی؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے اروی کی سمت دیکھا، مگر اروی تو نظر ملانے سے ہی انکاری تھی آج کل۔

"تھینک یو بہروز صاحب آپ سے مل کر، آپ کی کمپنی میں بہت اچھا لگا۔ بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے، او کے اب اجازت دیجئے میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا گیا تھا اور پھر بہروز بھائی سے ہاتھ ملا کر ان کا کندھا دبایا تھا۔ پھر امی اور بھابی سے اجازت لی اور جاتے جاتے صوفے پہ کھیلتی سونیا کو کچھ نوٹ تھما گیا تھا۔ اروی سونیا کے ہاتھ میں دبے نوٹ دیکھ کر اندر سے مشتعل سی ہوگئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے سارے نوٹ چھین لئے اور لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ عارفین تب تک پارکنگ میں اپنی گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔

"سر آپ کے یہ روپے۔" اروی کی سخت آواز وہ گاڑی کا ڈور کھولتے ٹھٹک گیا تھا۔ اس نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں پکڑے روپے دیکھے تھے۔

"یہ میں آپ کو نہیں آپ کی بھتیجی کو دے کے آیا ہوں۔"

"وہ بھتیجی آپ کی نہیں میری بھتیجی ہے، اس لئے میں لینے سے انکار کرتی ہوں آپ کی یہ عنایت نہیں چاہئے ہمیں۔" اروی کا لہجہ بہت سخت ہو رہا تھا اور بے مروت بھی۔

"یہ روپے میں نے اس لئے نہیں دیئے کہ آپ کو یہ چاہیے یا نہیں، بلکہ میں نے تو اس لئے دیئے ہیں کہ یہ میری خوشی ہے، میں پہلی بار سب سے ملنے آیا۔ مگر خالی ہاتھ، اس لئے سوچا جو میں نہیں لا سکا وہ بچی خود لے لے گی۔" عارفین کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی کہ وہ آخر ایسا کیوں کر رہی ہے؟

"وہ بچی لاوارث نہیں ہے اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ابھی اہم زندہ ہیں، فی الحال اس بھیک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے زبردستی وہ روپے عارفین کو واپس تھما دیئے تھے۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں مس اروی؟"

"میں ایسا اس لئے کر رہی ہوں کیونکہ میں اتنا قرض نہیں چکا سکتی، مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں آپ کی پائی پائی کا حساب دے سکوں، میں مزید نہیں بک سکتی، پلیز آپ اپنی

عنایات اپنے تک رکھیں، میں نے جو آپ سے لینا تھا وہ لے لیا، اب اور نہیں۔"

وہ کہہ کر واپس مڑ گئی تھی اور عارفین حیران پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ لڑکی جو ایک بار اس کی ذات پہ مان رکھ کر، اس پہ بھروسہ کر کے، ایک آس، ایک امید اور ایک یقین لے کر اس سے قرض لینے آ گئی تھی، آج اس کی خوشی سے دیئے ہوئے پیسوں کو قرض کا نام دے کر واپس ٹھکرا کے چلی گئی تھی، عجیب لڑکی تھی وہ؟ عارفین کے ذہن میں الجھی ریشم کی گتھی سلجھ ہی نہ رہی تھی کہ چکر کیا ہے آخر؟؟

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔" وہ اپنی ماں کا ترتیب دیا ہوا پلان سن کر یک دم غصے سے بپھر گیا تھا۔

"مجھے سوچ سمجھ کر جواب دینا عارفین، کیونکہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی، بالکل اسی طرح جس طرح تمہارا باپ یہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا، آج تک نہ وہ لوٹ کر واپس آیا ہے اور آئندہ کبھی نہ میں لوٹ کر واپس آؤں گی، تم پھر اپنے چہیتے بابا جان کی ہر بات ماننا اور ہر بات پہ عمل کرنا، لیکن یہ بھول جانا کہ تمہاری کوئی ماں بھی تھی۔ پہلے تم باپ سے محروم ہوئے تھے، اب تم ماں سے محروم ہو جاؤ گے، اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے، صبح تک اچھی طرح سوچ لو، ورنہ وہ دیکھو میرا بیگ تیار رکھا ہے، میں کسی بھی وقت کسی کو بھی بتائے بغیر گھر چھوڑ کر جا سکتی ہوں، کیونکہ میں مہرالنساء سے کبھی بھی شکست نہیں کھا سکتی، چاہے مجھے گھر چھوڑنا پڑ جائے۔" رابعہ شیرازی بیڈ پہ رکھے بیگ کی سمت اشارہ کر کے عارفین کو فیصلے کے جلتے کنوئیں میں دھکیل کر خود ہی اپنی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ عارفین وہیں صوفے پہ ڈھے گیا تھا......

اس کی زندگی تماشا بن کے رہ گئی تھی، وہ کیا کرتا؟ کہاں جاتا آخر؟

بہروز بھائی ڈسچارج ہو کر گھر آ چکے تھے اور پہلے سے کچھ بہتر تھے، اروی ہمیشہ کی طرح اپنی جاب میں بزی تھی، جب رابعہ شیرازی نے اسے نکاح اور روانگی کا وقت بتایا تھا۔ اروی نے چند روز پہلے ہی گھر والوں کو باخبر کر دیا تھا کہ اسے جاب کے سلسلے میں میڈم اور باس کے ساتھ مری جا کر رہنا پڑے گا۔ وہاں ان کے دو نئے پروجیکٹ شروع ہو رہے ہیں، اس لئے پی اے ہونے کے ناتے اس کا جانا بھی ضروری تھا اور وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ گھر والے بھی

اس جاب کی نوعیت اور گھر کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا کوئی بھی اسے جانے سے منع نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی انہیں میڈم رابعہ شیرازی اور عارفین پہ پورا بھروسہ تھا کہ وہ لوگ بہت اچھے لوگ ہیں، اس کا دھیان رکھیں گے اور وہ محفوظ رہے گی۔

وہ اروی کی طرف سے مطمئن تھے۔ اسی لئے جب آج اروی نے اپنی پیکنگ شروع کی تو انہیں حیرانی نہیں ہوئی تھی۔

"بیٹا اپنے گرم کپڑے رکھ لو اور اپنے موبائل کا بھی دھیان رکھنا، ہم روزانہ فون کر کے تمہاری خیریت معلوم کر لیا کریں گے، اور سردی سے بچ کے رہنا، ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔" امی نے اس کے سامان کے ساتھ چند نصیحتیں بھی باندھ کے رکھنی شروع کر دی تھیں۔

"پھوپھو آپ واپس کب آؤ گی؟" سونیا نے اس کا دوپٹہ پکڑ کر فکرمندی سے پوچھا تھا اور اروی کو اس کا سوال دل پہ لگا تھا۔ سبھی اسے رخصت کر رہے تھے، جبکہ سونیا کو اس کی واپسی کی فکر تھی۔

"جب اللہ نے چاہا آ جاؤں گی۔" وہ بہروز بھائی، ثمینہ بھابی، سارہ اور امی کے گلے مل کے رخصت ہوئی تھی۔

"میں آپ کی طرف سے خوشخبری کی منتظر رہوں گی۔" اس نے ثمینہ بھابی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ پریگنینٹ تھیں۔ بس کچھ دنوں تک ان کی ڈلیوری متوقع تھی اور ان لوگوں کو بھتیجے کی بہت خواہش تھی، اسی لئے دن رات بیٹے کی دعا کرتی تھیں۔

"انشاء اللہ سب سے پہلے تمہیں ہی بتائیں گے۔" امی نے پیار سے کہا تھا اور وہ اپنے آنسو روکتی ہوئی دہلیز عبور کر گئی تھی۔ وہ اپنے ان سب رشتوں کو کیسے بتاتی کہ وہ آج اپنی زندگی کسی شخص کے نام کرنے جا رہی ہے۔

"""آج اس کی نام نہاد شادی ہو رہی ہے، اس کا نکاح ہے آج، اس کی رخصتی ہو رہی ہے۔" وہ اپنے آنسو ضبط کرتی اپنے آپ کو تسلی دیتی بس سٹاپ تک آ گئی تھی، جہاں رابعہ شیرازی کی گاڑی منتظر کھڑی تھی، اس کے بیٹھتے ہی رابعہ شیرازی نے ڈرائیور کو اشارہ کیا تھا۔ گاڑی ایک فلیٹ کے سامنے رکی تھی۔ اس فلیٹ پہ ہی ان کا نکاح ہونا تھا۔ سارا انتظام ہو چکا تھا۔ صرف عارفین کی آمد باقی تھی۔

"اروی حیات؟" نکاح کے دوران عارفین کی ساعتوں سے ٹکرانے والا نام اسے اپنی جگہ پہ ساکت وصامت کر گیا تھا۔

"بولئے بیٹا قبول ہے؟" مولوی صاحب اقرار مانگ رہے تھے۔

"اروی حیات؟" اس کے ذہن میں پھر سے بازگشت ہوئی تھی، اس نے سر اٹھا کے رابعہ شیرازی کی سمت دیکھا تھا۔

"عارفین بولو نا بیٹا تمہیں اروی حیات قبول ہے۔" انہوں نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نارمل سے انداز میں کہا تھا، لیکن عارفین کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی اس نام پہ غور کر رہا تھا اور کبھی رابعہ شیرازی کے نارمل سے انداز پہ اور کبھی قریب بیٹھے مولوی صاحب اور چند گواہوں پہ۔

"عارفین کہاں گم ہو گئے ہو؟ ہمیں دیر ہو رہی ہے، آدھے گھنٹے بعد فلائٹ ہے تمہاری۔" رابعہ شیرازی کا سخت لہجہ عارفین کو سوچ کی دنیا سے یک دم واپس کھینچ لایا تھا اور پھر اس نے ماؤف ہوئے ذہن کے ساتھ۔

"قبول ہے۔" کی نوید بخشی تھی۔ رابعہ شیرازی کا چہرہ خوشی اور فتح کے احساس سے چمک اٹھا تھا۔ نکاح نامے پہ سائن کرنے کے فوراً بعد وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جہاں اس وقت اروی اکیلی بیٹھی اپنی ذات کے بک جانے کا ماتم منا رہی تھی، اپنی ذات کی کم مائیگی اسے بے تحاشا رلا رہی تھی۔ اس کا پورا سراپا مدھم ہچکیوں کی زد میں تھا۔ وہ دروازے کی آہٹ پہ بھی نہیں چونکی تھی۔ مگر عارفین قدم قدم پہ چونک رہا تھا۔ ٹھٹک رہا تھا۔ الجھ رہا تھا۔ ایک طرف رابعہ شیرازی تھیں جو خوشی سے کھلی پڑ رہی تھیں اور دوسری طرف اروی حیات تھی جو مسلسل روئے جا رہی تھی اور ایک وہ تھا جو اس بساط کا ایک انتہائی اہم مہرہ ہوتے ہوئے بھی لاعلم تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ رابعہ شیرازی اس کا کسی لڑکی کے ساتھ خفیہ نکاح کروا رہی ہیں، اب وہ لڑکی کون ہے، اسے اس چیز سے قطعی کوئی سروکار نہیں تھا۔ مگر وہ لڑکی اروی حیات ہو گی، اسے یقین نہیں آیا تھا، وہ ایک شاک کی سی کیفیت میں تھا۔

"اروی۔" اس نے کافی بلند آواز سے اسے مخاطب کیا تھا۔ اروی نے اپنے گھٹنوں سے سر اٹھاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ کیونکہ وہ پھر بہتے چلے آ رہے تھے۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ سب کیوں ہو رہا

ہے؟" وہ سوال کرتا چلا گیا تھا اور اروی کے دل پہ گھونسا پڑا تھا، اس کی لاعلمی پہ اسے مزید دکھ ہوا تھا۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔" وہ غصے اور ناگواری سے مغلوب ہو کر اسے "آپ" کی بجائے آج "تم" کہہ رہا تھا۔

"یہ سب آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے سر، آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ کیا ہوا ہے؟ یہاں وہی کچھ ہوا ہے جو آج تک فلموں، ڈراموں اور کہانیوں میں ہوتا آ رہا ہے۔ غربت کے ہاتھوں بے بس انسان کھڑے کھڑے کسی امیر کے در پہ بک جاتا ہے۔ غریبی بک جاتی ہے اور امیری خرید لیتی ہے اور یہ سودا آپ لوگوں جیسے معزز انسان ہی کرتے ہیں، کبھی آپ جیسے اور کبھی میڈم رابعہ شیرازی جیسے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے، آپ نے نہ سہی آپ کی والدہ نے سہی، مگر سودا اچھا کیا ہے۔ میری مصیبت، میری مشکل حقیقتاً اتنی ہی بڑی تھی کہ مجھے اپنا آپ بیچنا ہی پڑتا۔ آپ کی والدہ نہ ملتیں تو کوئی اور خریدار مل جاتا۔" وہ تلخی سے کہتی...... بے دردی سے اپنے آنسو پونچھ کر بیڈ سے کھڑی ہو گئی تھی، لیکن عارفین کے آس پاس دھماکے ہو رہے تھے، اس کے ذہن کی الجھی ہوئی ساری گتھی سلجھنے لگی تھی۔

اروی کا عارفین سے رابطہ کرنے کے چکر میں اس کے گھر جانا اور پھر وہاں رابعہ شیرازی کے جال میں پھنسنا، پھر بہروز حیات کا اس کی والدہ اور وائف کی تعریف کرنا، یقیناً وہ دونوں بہروز حیات کی نظروں میں اچھا بننے کے لئے اس کی عیادت کرنے بھی گئی ہوں گی۔ پھر اروی کا اکھڑا اکھڑا مزاج اور سونیا کو دیئے ہوئے روپے واپس کرنا، رفتہ رفتہ سب کچھ اک ترتیب سے ذہن میں سماتا چلا گیا تھا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی، نہ وہ کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی اروی آزاد ہو سکتی تھی، ان کی ڈور اب رابعہ شیرازی کے ہاتھ میں تھی اور رابعہ شیرازی اس وقت عارفین، اروی اور زوئلہ کو مری جانے کے لئے رخصت کرنے کو تیار کھڑی تھیں، ڈرائیور سامان گاڑی میں رکھ چکا تھا، بس ان کے چلنے کی دیر تھی۔

سفر کے دوران جہاز میں بھی وہ تینوں اپنی اپنی سوچ میں گم بے حد خاموش ہی رہے تھے، کسی نے ایک دوسرے سے کچھ کہنا تو دور کی بات، بلکہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا، اپنی اپنی ذات کے دائرے میں ہی قید تھے سبھی، کوئی دکھی تھا، کوئی پشیماں تھا، اور کوئی مطمئن بیٹھا تھا، جس طرح اروی کا دکھ اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا، اسی طرح عارفین کی پشیمانی بھی چہرے پہ

واضح دکھائی دے رہی تھی، مگر ان دونوں سے ہٹ کر زوئلہ خاصی مطمئن تھی۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ محض کچھ عرصہ ہی مری میں رہنا تھا اور جیسے ہی اروی کی طرف سے بچے کی نوید ملتی زوئلہ کا ارادہ انگلینڈ چلے جانے کا تھا، کیونکہ انہوں نے بابا جان کو یہ ہی بتایا تھا کہ زوئلہ انگلینڈ جا رہی ہے اور وہاں جا کر علاج کروانا چاہتی ہے، جس پہ بابا جان بہت خوش ہوئے تھے اور پلان کے مطابق زوئلہ نے انگلینڈ سے تب ہی واپس آنا تھا جب اروی کے ہاں بچہ ہو جاتا، کیونکہ اگر زوئلہ بھی مری میں رہتی تو ہوسکتا تھا کہ جھوٹی پریگننسی کی خوشخبری سن کر بابا جان بھی زوئلہ سے ملنے کے شوق میں مری چلے آتے۔ لہٰذا پہلے سے ہی یہ کہہ دیا گیا تھا کہ زوئلہ انگلینڈ جانے والی ہے۔

''سر گھر آ چکا ہے۔'' ایک بہت ہی خوبصورت کاٹیج کے سامنے گاڑی روک کر ڈرائیور نے اسے متوجہ کیا تھا، کیونکہ عارفین حال میں موجود نہیں تھا، کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

''عارفین کہاں گم ہیں؟'' زوئلہ نے گاڑی سے اترتے ہوئے خاصے زور سے اس کا کندھا ہلایا تھا اور وہ بری طرح چونکتے ہوئے حواسوں میں واپس لوٹا تھا۔ اس نے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اروی بھی اپنی سیٹ پہ جمی بیٹھی تھی۔ اس کے حواس بھی موجود نہیں تھے۔

''میڈم آپ بھی آ جائیے۔'' زوئلہ نے گاڑی کے اندر جھانک کر غصے سے کہا تھا اور وہ اپنے دھیان سے گڑبڑاتے ہوئے فوراً گاڑی سے اتر آئی تھی۔ عارفین ان دونوں سے پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔

''ڈرائیور سامان اندر پہنچا دو۔'' زوئلہ نے جاتے جاتے حکم جاری کیا تھا۔

''جی میڈم۔'' ڈرائیور فوراً سامان نکالنے میں لگ گیا تھا۔ عارفین نے اپنا یہ ذاتی کاٹیج پچھلے سال ہی ڈیزائن کیا تھا، لیکن مصروفیت کی وجہ سے اتنا ٹائم ہی نہیں ملا تھا کہ وہ یہاں آ کر چند دن رہ لیتا۔ بس پچھلے دنوں گھر سے بغیر بتائے ہوئے نکلا تو یہاں آ گیا تھا اور وہ دو ہفتے اس نے بہت ریلیکس گزارے تھے، لیکن تب اسے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ چند دن بعد وہ اپنی دو عدد بیویوں کے ہمراہ یہاں رہنے کے لئے آ جائے گا۔

وہ تو باتوں باتوں میں جب اس نے رابعہ شیرازی کو بتایا کہ وہ ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں مری کچھ عرصہ رہنے کے ارادے سے جا رہا ہے تو انہوں نے فوراً اپنے شاطرانہ دماغ کو استعمال میں لاتے ہوئے پورا پلان ترتیب دے ڈالا تھا، اور اس پلان میں کیا کچھ ہو گیا تھا، یہ ہی سوچ کر عارفین کو وحشت ہونے لگی تھی۔

''سر یہاں سامان رکھ دوں؟'' عارفین اپنے بیڈروم کے صوفے پہ آڑا ترچھا لیٹا تھا، جب اپنے سامان کے ساتھ ایک اور بیگ دیکھ کر چونک گیا تھا، کیونکہ وہ بیگ یقیناً زوئلہ کا نہیں تھا۔ زوئلہ جب گھر سے نکلی تھی اس کے ساتھ سلور کلر کا اٹیچی بیگ تھا، جو وہ اپنے ہمراہ گھسیٹتی ہوئی آئی تھی۔ تو گویا یہ بیگ اروی کا تھا؟ عارفین کے اعصاب مزید شل ہو گئے تھے۔

''یہ بیگ میرا نہیں ہے، یہ ساتھ والے کمرے میں رکھ دو۔'' اس نے ڈرائیور کو وہ بیگ رکھنے سے منع کر دیا تھا۔

''نہیں یہ بیگ یہیں رہے گا اور اس بیگ کے ساتھ ساتھ اس بیگ کی مالک بھی یہیں رہے گی، یہ میرا نہیں بلکہ مام کا آرڈر ہے۔'' ڈرائیور کے عقب سے زوئلہ نمودار ہوئی تھی اور زوئلہ کے پیچھے وہ بے بس کھڑی تھی۔

''زوئلہ پلیز بس کرو، میرا دماغ پھٹ جائے گا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' وہ کنپٹی پہ ہاتھ رکھتے ہوئے چیخ پڑا تھا اور زوئلہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

''آپ خوامخواہ پاگل ہو رہے ہیں؟ مجھے دیکھئے میں تو اپنی سوتن کو ہنسی خوشی قبول کر رہی ہوں اور آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں، میرے ظرف کی داد دیجئے۔'' زوئلہ نے اپنے آپ کو خود سراہا تھا۔

''یہ تمہارا ظرف نہیں، تمہاری کمینگی ہے، تمہارا مطلب ہے، تمہاری غرض ہے اس میں۔ آج اگر اس لڑکی سے میں اپنی مرضی سے شادی کر کے لایا ہوتا تو پھر میں دیکھتا کہ تمہارے ظرف کی حد کتنی ہے؟ تم مجھے داد دو کہ میں یہ سب کچھ برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں۔'' وہ بے حد تلخی سے بات کر رہا تھا۔

''جب برداشت ہی کرنا ہے تو پھر اتنا غصہ کیوں کر رہے ہیں؟ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے، انجوائے کریں۔'' وہ انتہائی بے نیازی سے کہتی پلٹ کر دروازے تک چلی گئی تھی، لیکن باہر نکلتے نکلتے اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اروی بے بس ولاچاری کشمکش میں کھڑی تھی۔

''اور میڈم آپ بھی ذرا ذہن نشین کر لیں کہ یہ آپ دونوں کا مشترکہ بیڈروم ہے، آپ لوگوں نے ایک ساتھ رہنا ہے، کوئی نخرہ، کوئی ڈھکوسلہ نہیں چلے گا یہاں۔'' وہ تیکھے انداز سے کہہ کر دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی اور وہ دونوں قربانی کے جانور کی طرح اپنی اپنی جگہ پہ بندھے رہ گئے تھے۔

ان دونوں کی ساری رات آنکھوں میں گزری تھی، عارفین اتنی شدید سردی کے باوجود ٹیرس پہ کھڑا رہا تھا اور اروی اتنی تھکن اور ذہنی ٹینشن کے باوجود یک ٹک بیڈ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی رہی تھی، نہ اس نے پلک جھپکی تھی اور نہ وہ سو پایا تھا اذیت کا دریا دونوں طرف برابر بہہ رہا تھا اور اس دریا میں وہ دونوں ایک ساتھ ڈوبے ہوئے تھے، سانس دونوں کی بند ہو رہی تھی، مگر زندہ رہنے اور زندگی جینا دونوں کی مجبوری تھی۔ لہٰذا صبح ہونے تک وہ دونوں اپنے اپنے دل کو اور اپنے اپنے دماغ کو سمجھانے اور تسلی دلاسہ دینے میں لگ گئے تھے۔ جب اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا تو پھر اب آگے بھی بڑھنا تھا، کیونکہ پیچھے مڑنے کا اب نہ تو کوئی راستہ تھا اور نہ ہی کوئی وقت۔

سو بہتر یہ ہی تھا کہ وقت کے سانچے میں ڈھل کر سب کچھ درگزر کر دیا جاتا۔ کیونکہ ہونا تو وہی تھا جو ہو چکا تھا، اور جو ہو چکا تھا وہ بدل نہیں سکتا تھا اور جن میں کچھ بدلنے کی سکت اور جرأت ہی نہیں تھی وہ سوچ سوچ کر پاگل کیوں ہو رہے تھے بھلا؟ اور یہ ہی سوچ کر اروی نے اپنے اعصاب کنٹرول کر لئے تھے اور دل پہ بھاری پتھر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، فجر کی اذان ہو چکی تھی، نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا، اسے سب کچھ بروقت سنبھالنا تھا۔ نماز کے بعد اس نے اپنے رب سے گڑگڑا کر اپنے لئے حوصلہ، صبر اور سکون مانگا تھا اور بہتری کی دعا کی تھی۔

⊛......⊛......⊛

صبح ناشتے کے لئے زوئلہ نے ملازمہ کو بلانے بھیجا تھا اور اروی چپ چاپ خاموشی سے اٹھ کر ملازمہ کے ساتھ ہی نیچے آ گئی تھی، لیکن اروی کو یہ نہیں پتہ تھا کہ اسے اب لحہ لحہ امتحان سے گزرنا ہوگا۔ جیسے ہی وہ نیچے آئی زوئلہ نے سر تا پا اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور ان ''نظروں'' میں کیسی ''کھوج'' تھی یہ دیکھ کر اروی کٹ کے رہ گئی تھی۔

''اُف اس بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' اسے زوئلہ کی نظروں نے بہت کچھ باور کروا دیا تھا۔

''لگتا ہے اپنی مظلومیت کا خوب دل کھول کر روگ مٹایا ہے خوب دھوم دھام سے ماتم کیا ہے ساری رات؟'' زوئلہ کچھ کہنے سے باز نہیں آئی تھی۔ جبکہ اروی کی گردن اور نظریں جھکی ہوئی تھیں، وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھی، آخر وہ کہتی بھی کیا؟

''میڈم اروی حیات آپ کو یہاں بیاہ کر لائے ہیں تو کسی مقصد کے لئے...... محض انجوائے کرنے نہیں آئے۔ آپ ایک بار پھر کان کھول کر سن لیں عارفین آپ کا شوہر اور آپ

اس کی بیوی ہوتی ہیں آج کل...... اور میاں، بیوی دور، دور نہیں رہتے سمجھیں آپ؟'' زوئلہ کی باتیں سن کر اروی کا جی چاہا کہیں ڈوب کے مرجائے یا پھر زمین پھٹے اور اس میں سما جائے، کیونکہ سامنے ہی اس کاٹیج کے ڈرائنگ روم میں بنی لکڑی کی سیڑھیوں پہ عارفین کھڑا تھا اور زوئلہ کی گفتگو کے معنی با آسانی سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔

''وہ لاکھوں کی رقم تمہارے جسم کے لئے دی ہے، تمہارے جسم کو سات پردوں میں سنبھال سنبھال کے رکھنے کے لئے نہیں دی، اتنی نیک پروین بی بی بننے کی کوشش مت کرو اور عارفین کے قریب رہنے کی کوشش کرو۔ ورنہ مام کو پتہ چل گیا تو وہ پہلی فلائٹ سے یہاں پہنچ جائیں گی۔'' زوئلہ نے اچھی خاصی بک بک کرنے کے بعد اسے ناشتے کی اجازت دی تھی۔ لیکن عارفین وہیں سے واپس لوٹ گیا تھا۔

⊛......⊛......⊛

''اروی کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں تم نے اپنے ساتھ مجھے سولی پہ لٹکا دیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اپنے آپ کو گولی مار دوں۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں، پاگل ہو گیا ہوں میں، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ اور...... اور آئندہ کیا ہوگا؟ آخر کیا بنے گا تمہارا؟ تم نے اتنا بڑا قدم کچھ بھی سوچے بغیر کیسے اٹھا لیا؟'' وہ اروی کے سامنے پشیمان اور بے بس کھڑا تھا، اور اس کے سوالوں پہ اروی تلخی سے مسکرائی تھی۔

''سر یہ سب جو کچھ بھی ہوا ہے یہ ازل سے میری قسمت میں لکھا تھا اور اب اس لکھے کا دوش کس کو دوں؟ بس دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے آپ کے لئے خریدا گیا ہے، خریداروں کی صف میں آپ کی ماں کھڑی ہیں، جبکہ میرے دل میں، میرے دماغ میں آپ کے لئے اور آپ کے گھر والوں کے لئے ایک بہت اونچا ''سنگھاسن'' بنا ہوا تھا جو چند دن پہلے اتنے زور سے گرا کہ اس پہ بٹھائے گئے سارے معتبر مجسمے ٹوٹ گئے اور ان ٹوٹے مجسموں کی کرچیاں اتنی تیز اور نوکیلی ہیں کہ جب جب چبھتی ہیں تو تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف پہ آنسو نکل آتے ہیں۔'' وہ کہتے کہتے اپنے رخساروں پہ ڈھلک آنے والے آنسوؤں کو رگڑنے لگی تھی۔

''کیا اس سنگھاسن پہ میں بھی تھا اروی؟'' عارفین جیسے کسی خدشے کے تحت پوچھ رہا تھا۔

''آپ تو اس سنگھاسن کا سنگھار تھے سر۔'' اروی کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تھے؟'' عارفین نے پھر پوچھا تھا۔

"ہاں آپ بھی تھے، مگر اب کہیں نہیں ہیں، اب آپ امیر کبیر خریداروں میں نظر آتے ہیں، اب تو یہ ہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب مجھ پہ کوئی اور مصیبت آ جائے اور کب مجھے پھر بکنا پڑ جائے۔" اروی کا لفظ لفظ نوکدار تھا۔

"کیا میں تمہیں ایسا نظر آتا ہوں اروی؟" عارفین کو اس کی باتوں سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"آپ جیسے نظر آتے تھے اب ویسے نظر نہیں آتے۔ اب بہت کچھ بدل چکا ہے سر۔ آپ، آپ نہیں رہے اور میں، میں نہیں رہی۔ پہلے ہم میں ایک خلوص، ایک محسن اور مہربان کا رشتہ تھا۔ اب ہمارے درمیان ایک سودا ہے، کسی دکان دار اور گاہک کا سا رشتہ ہے۔"

"لیکن اروی میں اس سارے قصے میں کہاں قصوروار ہوں، مجھے بس اتنا بتا دو کہ میرا جرم کیا ہے؟" عارفین تو سچ مچ بے گناہ مارا جا رہا تھا۔

"اچھے انسان کو برا بننے میں دیر نہیں لگتی، بس ایک سنگھاسن سے گرنے کی دیر ہوتی ہے۔ آپ کے گھر والے اچھائی کا چولا اتار سکتے ہیں تو آپ بھی اتار سکتے ہیں، اس لئے بہتر یہ ہی ہے کہ میں کسی سے بھی کوئی اچھی امید نہ رکھوں، میں آپ کے لئے خریدی گئی ایک "چیز" ہوں۔ اب آپ اس چیز کو جب چاہے "استعمال" کر سکتے ہیں، اور جب چاہے چھوڑ سکتے ہیں، آپ کو کسی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، جس طرح اس کمرے کی تمام چیزوں پہ آپ کا حق ہے، آپ کا اختیار ہے، بالکل اسی طرح مجھ پہ بھی ہے، آپ جب چاہیں اپنا حق استعمال کر سکتے ہیں، میں انکار نہیں کروں گی، چاہے خود اپنی ذات پہ جبر کا پہاڑ کھڑا کرنا پڑے۔ میں وہ بھی کر لوں گی، لیکن آپ کو شکایت نہیں ہونے دوں گی۔" اروی نے آج صاف صاف بات کرتے ہوئے اپنی شرم وحیا بھی بالائے طاق رکھ دی تھی، کیونکہ وہ یہ ہی سوچ رہی تھی کہ جب اس ندی میں پاؤں ڈال ہی دیا تھا تو اب پار بھی لگنا تھا، ڈر ڈر کے قدم اٹھانے سے کیا حاصل؟ لیکن دوسری طرف عارفین مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا، اسے اروی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ملال تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ بھی اس مسئلے کو فراموش کر ڈالتا، مگر نہ جانے کیوں اروی سے اس کے کیسے احساسات وابستہ تھے کہ وہ اس زیادتی، اس سودے کو فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید وہ اروی کو اس روپ میں قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

ان لوگوں کو مری آئے ہوئے پورا ایک ماہ ہو چکا تھا اور یہ پورا ایک ماہ عارفین اپنے آپ کو سمجھانے میں لگا رہا تھا، ہاں اس ایک ماہ میں بس یہ تبدیلی آئی تھی کہ دونوں میں بات چیت کا سلسلہ بحال ہو گیا تھا۔ اروی اگر اچھے طریقے سے پیش آتی تھی تو عارفین بھی نارمل ہونے لگا تھا اور اس چیز کا اندازہ ان کی گفتگو سے ہوتا تھا، اس وقت بھی عارفین کو آتے دیکھ کر اروی تیزی سے قریب آئی تھی۔ عارفین کا کام آج کل زوروں پہ تھا اس کی مری والی برانچ میں بھی کافی پروجیکٹ کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ ہر کام اپنی موجودگی میں کروا رہا تھا۔ ابھی بھی وہ آفس سے ہی لوٹا تھا۔

"چائے لے کر آؤں آپ کے لئے؟" وہ کچھ دیر ریلیکس کرنے کے لئے صوفے پہ بیٹھا تھا، جب وہ بھی بیویوں کے روپ میں سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ ان چیزوں کا عادی نہیں تھا، نہ ہی اس کی سوسائٹی میں بیویاں اتنی تابعداری کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اسے اروی کا یہ انداز بہت اچھا لگتا تھا، اس کا کیئر کرنا دل کو عجیب سی خوشی بخشتا تھا۔ مگر وہ اس خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا، اور نہ ہی اس خوشی کو ہمیشہ کے لئے محسوس کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ تھا کہ سب کچھ عارضی ہے۔ اسے اپنا اور اروی کا رشتہ کاغذی پھول جیسا لگتا تھا۔ جس کا رنگ بناوٹی تھا اور خوشبو تھی ہی نہیں۔ بغیر خوشبو کے پھول سا رشتہ تھا جو کسی بھی وقت مرجھا سکتا تھا اور اس کے مرجھانے کا خدشہ ہی دل ودماغ کو مٹھی میں بھینچ کر رکھ دیتا تھا۔

"کیا بات ہے آج آپ چائے نہیں لیں گے کیا؟" اس نے پھر اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں کیا کہا؟" وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ اب کی بار ذرا فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" وہ مختصر سا کہہ کر وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم میں آ گیا تھا، اور اس کے پیچھے تقریباً دس منٹ بعد وہ چائے لے کر بیڈ روم میں آ گئی تھی۔ وہ ابھی ابھی شاور لے کر کپڑے چینج کر کے واش روم سے بال تولیے سے رگڑتے ہوئے برآمد ہوا تھا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟" میں ان چیزوں کا عادی نہیں ہوں میری کیئر آج تک میری ماں نے نہیں کی تم تو پھر چند دن کی مہمان ہو۔" اس کا انداز تلخی لئے ہوئے تھا۔

"جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں، میں آپ کی بیوی ہوں، اور ایک بیوی ہونے کے ناطے مجھ پہ فرض ہے کہ میں آپ کا خیال رکھوں، آپ کے کام خود کروں، اب اس سے آپ

کی عادت بگڑتی ہے یا سنورتی ہے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے چائے کا کپ اٹھا کر بہت ہی نارمل سے انداز میں اس کی سمت بڑھایا تھا اور عارفین مزید انکار اور اگنور نہیں کر سکتا تھا، اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہی بنی تھی۔

"کھانا کب کھائیں گے؟" وہ اسے چائے دے کر واپس پلٹ رہی تھی، جب ذرا ٹھہر کر پوچھا تھا۔

"فی الحال بھوک نہیں ہے لیٹ نائٹ کھا لوں گا۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چلا گیا تھا، اور اروی باہر نکل گئی تھی۔

❂......❂......❂

"میری وائٹ شرٹ کہاں ہے؟" عارفین اپنی شرٹ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تو جھنجھلا کے پوچھا تھا اور اروی جو اپنی فراغت کی وجہ سے کوئی کتاب پڑھنے بیٹھی تھی چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"آپ کی وائٹ شرٹ پہ داغ لگا ہوا تھا، میں نے اسے دھو کر دھوپ میں پھیلایا ہے۔" وہ کتاب بیڈ پہ اوندھی رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کونسی دھوپ میں؟" عارفین نے مزید جھنجھلا کر پوچھا۔ باہر اتنی دھوپ نکلی ہوئی تھی اس لئے میں نے ......" کہتے کہتے اروی کی نظر کھڑکی کی سمت اٹھی اور وہ حیران رہ گئی، ہلکی بارش کے ساتھ ہلکی ہلکی برف کی پھوار بھی جاری تھی۔

"لیکن تھوڑی دیر پہلے تو اتنی اچھی دھوپ تھی کہ سبھی لوگ سڑکوں پہ نکل آئے تھے۔" اروی کو ذرا سی دیر میں موسم کی ایسی تبدیلی پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"محترمہ یہ مری ہے ہمارا کراچی نہیں۔ جہاں خوش گوار موسم کبھی قسمت سے ہی میسر آتے ہیں۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے طنز کیا تھا اور اپنی دوسری شرٹ ڈھونڈنے لگا جو اس کی پینٹ سے کچھ میچ کر جاتی...... اتنے میں اروی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ لان کے ایک کونے میں شاید دو روز پہلے ہی اس نے رسی باندھی تھی کہ کبھی کبھار کوئی کپڑا ہی سکھانے کے لئے ڈال دیا جاتا ہے اور آج اس نے اس رسی سے کام لے ہی لیا تھا۔ مگر موسم کام خراب کر گیا تھا۔

"ایم سوری سر شرٹ تو خراب ہو گئی ہے۔" وہ جب واپس آئی تو تھر تھر کانپ رہی تھی، برف کی ٹھنڈک سے اس کی رنگت نیلی پیلی ہو گئی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے دوپٹے کو

بھی بھگو گئے تھے اور برف کی پھوار ابھی بھی اس کے سر پہ سفید روئی کی طرح جمی نظر آ رہی تھی۔ عارفین نے بے حد سرسری نظر سے اس کو سر تا پا دیکھا تھا۔ مگر سرسری نظر کب "گہری نظر" میں بدل گئی اسے کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔

"محترمہ صرف شرٹ ہی خراب نہیں ہوئی آپ کا حلیہ بھی خراب ہو چکا ہے۔" عارفین نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"اوہ نو۔" اسے اپنی سنگین غلطی کا اب احساس ہوا تھا۔

"کیوں کیا؟"

"میرے یہ کپڑے بھی بھیگ گئے اور وہ کپڑے بھی۔"

"وہ کپڑے؟" عارفین نے سوالیہ دیکھا۔

"ہاں میں نے اپنے کپڑے بھی دھو کر پھیلائے تھے۔" اس نے غلطی کا اعتراف کیا۔

"تو کیا اور کپڑے نہیں ہیں آپ کے پاس؟" وہ چونک اٹھا، اس نے اروی کے کپڑوں پہ غور کیا، تو وہی تین، چار مخصوص سے سوٹ یاد آئے جو وہ گھر سے ساتھ لے کر آئی تھی، جبکہ عارفین اور زوئلہ تو اپنے لئے اتنے عرصے میں کئی بار شاپنگ کر چکے تھے، بلکہ یہاں آ کر زوئلہ کا تو کام ہی یہی تھا یا گھومنا پھرنا یا ہر روز شاپنگ کرنا، اس وقت بھی وہ کہیں باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی چپ سے وہ شرمسار سا ہو گیا تھا اور کوئی بھی سوال کئے بغیر رخ پھیر لیا تھا۔ ایک بار پھر اس سے کوتاہی ہو گئی تھی۔

جب اروی اتنے نازک اور سنگین حالات کے باوجود اس کی ذرا ذرا سی بات کا خیال اور دھیان رکھ سکتی تھی تو پھر وہ ایسا کیوں نہیں کرتا تھا؟ اتنا لاپروا کیوں ہو جاتا تھا، آخر؟ لیکن اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی اس کا بھرپور خیال رکھے گا۔ اسے اروی کے رنگ اڑے کپڑے دیکھ کر بے حد ندامت ہو رہی تھی کہ اسے پہلے خیال کیوں نہیں آیا؟ وہ خود کپڑے چینج کرنے چلا گیا تھا۔ جب تک اروی نے جیسے تیسے اپنا ایک سوٹ استری سے خشک کر ہی لیا تھا اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑے چینج کر کے دوسرے پہن لئے تھے۔

"تم کھانا بنا چکی ہو؟" عارفین پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں ابھی بنانے لگی ہوں۔" اروی کچن میں جانے کی تیاریوں میں تھی۔

"نہیں آج رہنے دو، آج ہم باہر سے کھانا کھائیں گے۔" وہ اپنا والٹ اٹھا کر جیب

میں رکھتے ہوئے بولا تھا۔

''لیکن باہر سے کیوں؟'' اروئ حیرانی سے بولی تھی۔

''بس آج اتنے اچھے موسم کو دیکھ کر موڈ ہو رہا ہے اور ویسے بھی کبھی کبھی ہوٹلنگ بھی کر لینی چاہیے طبیعت پہ اچھا اثر پڑتا ہے۔'' وہ اپنا موبائل اور گھڑی بھی اٹھا چکا تھا۔

''لیکن میں کیسے جا سکتی ہوں؟'' اروئ کو اپنی حالت دیکھ کر احساس ہوا تھا، بے حد عام سے کپڑے، نہ کوئی گرم چادر تھی اور نہ ہی گرم سلیپر تھے۔

''یہ میری چادر لے لو۔'' عارفین نے اپنی گرم وول کی چادر اٹھا کر اسے تھمائی کہ وہ کندھوں پہ ڈال لے۔

''مگر سر اس طرح اچھا۔''

''کچھ نہیں ہوگا یار تم چلو تو سہی۔'' عارفین نے بے ساختگی سے کہتے ہوئے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے اپنی بے تکلفی اور بے ساختگی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔

''سوری۔'' اس نے ذرا انجل ہوتے ہوئے اروئ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور اروئ نظریں چرا گئی تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پورٹیکو میں پہنچے ہی تھے کہ اتنے میں زونلہ اپنی گاڑی سے اترتی دکھائی دی تھی۔

''اوہو جناب آج کہاں کی تیاریاں ہیں؟'' زونلہ نے انہیں ایک ساتھ دیکھ کر معنی خیز خوشگواریت کا اظہار کیا تھا۔ اروئ کا چہرہ جھک گیا تھا۔

''بس آج مال روڈ پہ گھومنے کا موڈ ہو رہا ہے۔'' عارفین گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے لاپروائی سے بولا تھا۔

''او یعنی شاپنگ کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ہوں...... بالکل شاپنگ کا ارادہ ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور اروئ کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''اچھا ارادہ ہے او کے انجوائے یور سیلف۔'' زونلہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی تھی اور عارفین ایک پل کے لئے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ کیا بیویاں زونلہ جیسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے شوہر کو دوسری عورت کے ہاتھوں سونپ کر اس کے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں؟ کوئی اور وقت

ہوتا تو وہ مزید سوچتا، مگر اروئ کا خیال کرتے ہوئے اس نے سر جھٹک دیا تھا اور گاڑی باہر نکال لی تھی۔ عارفین اس کی چپ اور اداسی دور کرنے کی غرض سے اس کے گھر والوں کا ذکر چھیڑ لیتا تھا اور وہ ذرا دیر کے لئے کچھ بہل جاتی تھی، اس وقت بھی وہ باتیں کرتے کرتے شاپنگ کرنے نکل آئے تھے اور رفتہ رفتہ عارفین نے ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی تھی۔

''سر پلیز بس کریں، اتنا سب کچھ لینے کی کیا ضرورت ہے؟'' اروئ اسے روکنے لگی، وہ اتنی شاپنگ دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

''یہ سب تمہاری ضرورت کی چیزیں ہیں، جب گھر جا کر استعمال کرو گی تو پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ تمہیں ان کی کتنی ضرورت تھی۔'' اس نے اس کے لئے کاسمیٹکس کی بھی کافی چیزیں لی تھیں اور کچھ چیزیں اس نے وہ بھی خریدی تھیں جن کو دور سے ہی دیکھ کر اروئ شاپ میں داخل ہی نہیں ہوئی تھی، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور ہتھیلیوں میں پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

''چلو اب کچھ کھا لیتے ہیں، کافی بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ شاپنگ بیگ سنبھال کر والٹ جیب میں ڈالتے ہوئے باہر آیا تو اروئ نے اسے دیکھنے سے بھی گریز کیا تھا۔ عثمانیہ ریسٹورنٹ تک وہ دونوں چھتریوں کا سہارا لے کر پیدل چلتے ہوئے آئے تھے۔ بارش کی بوندوں میں تو کمی آ گئی تھی، مگر برف کی پھوار ابھی بھی ہنوز تھی۔ ان کی واپسی رات دیر گئے ہوئی تھی اور تب تک زونلہ سو چکی تھی، اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ لے کر آئے تھے؟ اور آتے سے اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بیڈ پہ گرتے ہی نیند آ گئی تھی۔ حالانکہ جسم سن ہو رہا تھا۔

وہ عارفین جس نے پہلے روز سے اروئ حیات کو کبھی بھی نہ چھونے کا عہد کر رکھا تھا، وہ اب اپنے عہد سمیت متزلزل ہو چکا تھا اس کا دل، اس کا دماغ، اس کی سوچیں، اس کی دھڑکنیں اسے کسی نئی راہ پر ڈال رہی تھیں اور وہ بیٹھے بٹھائے اک نئی ڈگر پہ چل نکلا تھا۔ اروئ کے حوالے سے اس احساسات اور جذبات میں کافی زیادہ تبدیلی آ گئی تھی، وہ اپنے رشتے کو کچے رنگ کی بجائے ایک پکا رنگ دینا چاہتا تھا اور اس حوالے سے اس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا، اسی لئے آج کل وہ کچھ فریش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور اس کے موڈ کی خوشگواریت اروئ کے علاوہ بھی سبھی نے محسوس کی تھی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے کے ٹیرس پہ دو کرسیاں ڈالتے بیٹھے ہوئے تھے اور برف

باری کا منظر انجوائے کر رہے تھے، ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی باتیں بھی جاری تھیں۔

''اس موسم میں سب سے زیادہ ضروری چیز ہوتی ہے چائے، اور وہ ہمارے پاس ہے ہی نہیں، اس لئے آپ ویٹ کریں میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔'' اروی مسکراتے ہوئے کہہ کر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی، مگر عارفین نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا، اس کے مضبوط ہاتھ کی پرحدت گرفت کا لمس ''کچھ اور ہی کہہ رہا تھا'' جس پہ اروی کا دل سکڑ کر سمٹا تھا۔

''بیٹھ جاؤ اس موسم میں ''صرف'' چائے ہی ضروری نہیں ہوتی ایک دوسرے کا ساتھ اور قربت بھی بہت معنی رکھتی ہے۔ چائے تو بعد میں بھی مل سکتی ہے، مگر احساس کے لمحے دوبارہ ہاتھ نہیں آتے۔'' اس نے اروی کا ہاتھ چھوڑے بغیر اسے واپس چیئر پہ بٹھا دیا تھا اور اروی کی جیسے قوت گویائی منجمد سی ہو کے رہ گئی تھی۔

''اس وقت میرے ہاتھ میں چائے کا کپ نہیں بلکہ تمہارا ہاتھ دلکش لگ رہا ہے اور اس موسم کی ساری رنگینی، سارا لطف تمہارے اس خوبصورت ہاتھ کے لمس میں سمٹ آیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں اس ہاتھ کو چھوڑ کر ایک بے جان کپ کی کیسی خواہش کر لوں؟'' عارفین اور اروی کی کرسیاں اک دوسرے کے آمنے سامنے بچھی ہوئی تھیں، دونوں روبرو بیٹھے تھے اور اس کا ہاتھ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے بغور اس کی مخروطی انگلیوں اور ترشے ہوئے ناخنوں کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں اور اروی، اگر کبھی اس ہاتھ پہ میں اپنا دل رکھ دوں تو کیسا لگے گا؟'' وہ اس کی شفاف گلابی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے بولا، اروی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''بولو اروی کیا میں اس ہاتھ پہ اپنا دل رکھ سکتا ہوں؟'' اب کی بار اس کے لہجے میں بے قراری سمٹ آئی تھی۔

''سر میرے اس ہاتھ کی اتنی اوقات کہاں کہ اس پہ کوئی اپنا دل رکھ دے۔ یہ ہاتھ ایک غریب مفلس لڑکی کا ہاتھ ہے، یہ ہاتھ بہت سے لوگوں سے بھیک مانگ چکا ہے، بہت حقیر ہے یہ اور آپ۔'' وہ کچھ کہتے ہوئے چپ ہو گئی تھی۔

''میں اس سے زیادہ حقیر ہوں اروی۔ جیسے یہ خالی ہے ویسے ہی میں بھی خالی ہوں، میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے...... اور جو ہے وہ میں اس ہاتھ میں سونپ دینا چاہتا ہوں، اور جو چیز میں اس ہاتھ میں سونپ رہا ہوں وہ میں نے آج تک کبھی کسی کے حوالے نہیں کی، کبھی کسی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا یا پھر مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مجھے آج تک کوئی ایسا ملا ہی نہیں جو اس کے

قابل لگتا اور جب کوئی اس کے قابل لگا تب میں شادی شدہ ہو چکا تھا، لیکن اللہ نے کچھ ایسی سبیل نکال ہی دی کہ میں آج سب کچھ کہنے کے لئے اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا ہوں۔''

''سر پلیز آپ یہ دل کے حساب کتاب رہنے دیں کوئی اور بات کریں۔'' اروی کترا گئی تھی۔

''کیسے رہنے دوں؟ بڑی مشکل سے تو کوئی لمحہ میسر آیا ہے۔'' عارفین نے دل کی گہرائیوں سے کہتے ہوئے اروی کی ہتھیلی کو پورے استحقاق سے چوم کر اپنے دل پہ رکھ لیا تھا اور وہ جیسے لرز کے رہ گئی تھی، اتنی شدید سردی کے باوجود اس کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا تھا۔ عارفین ان لمحوں کو کچھ اور طول دیتا، مگر وہ ہاتھ کھینچ کر یک دم اندر آ گئی تھی، اب حال یہ تھا کہ عارفین کی طرف وارفتگی اور والہانہ پن انگڑائیاں لے رہا تھا جبکہ اروی کتراتی ہوئی رہنے لگی تھی، اسے عارفین کے جذبات سے ڈر لگنے لگا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا؟ وہ سب کچھ مجبوری کے تحت کر رہی تھی، لیکن محبت کا روگ نہیں پال سکتی تھی۔ بہتر یہ ہی تھا کہ ان کے رشتے کے رنگ کچے رنگ ہی رہتے، اگر گہرے ہو جاتے تو مٹتے مٹتے بھی اتنا وقت لے سکتے تھے۔ جبکہ وہ یہاں ایک ایگری منٹ کے تحت آئی تھی، دلوں کے رشتے پالنے نہیں۔

عارفین کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا وہ آفس کے کسی کام سے واپس کراچی آیا ہوا تھا۔ یہاں کا سارا کام مینیجر صاحب نے سنبھالا ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً رابعہ شیرازی بھی آفس کا چکر لگاتی رہتی تھیں، عارفین کی غیر موجودگی میں وہ اکثر آفس کا کام سنبھال لیتی تھیں، اور اس طرح عارفین کو آفس کی طرف سے ذرا کم ہی ٹینشن ہوتی تھی۔

''عارفین ہماری ایک جاننے والی ہیں، مسز فاروق انصاری ان کا بیٹا حال ہی میں اپنی سٹڈی سے فارغ ہوا ہے، وہ جاب کرنا چاہتا ہے چند روز پہلے ہی جاب کی تلاش میں یہاں آیا تھا، مگر میں نے اسے اپائنٹ نہیں کیا، لیکن اس سے کہہ دیا تھا کہ تم سے مشورہ کر کے بتاؤں گی، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو؟ کیا تمہیں کسی ایمپلائز کی ضرورت ہے؟'' عارفین بھی مسز فاروق اور مسٹر فاروق انصاری کو جانتا تھا، مگر ان کا بیٹا کون تھا یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

''نام کیا ہے اس کا؟''

''احمر انصاری۔'' رابعہ شیرازی کے بتانے پہ اسے یاد آ گیا تھا۔

''اوہ ہاں میری ملاقات ہوئی تھی اس سے کسی فنکشن میں، کافی اچھا لڑکا ہے، آپ اسے

اپائنٹ کر لیجئے گا، باقی ساری ڈیٹیلز مینجر صاحب سمجھا دیں گے۔" عارفین کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر......"

"اتنی جلدی؟"

"جی وہ بابا جان آنے والے ہیں، انہوں نے مجھے تھوڑی دیر پہلے فون پہ بتایا ہے۔"

"جو کچھ تمہیں سمجھایا ہے تم بابا جان سے وہی کہنا، او کے؟" ان کی تاکید پہ وہ کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر پہنچا تو بابا جان اس سے پہلے آئے بیٹھے تھے، اتنے دنوں بعد پوتے کو دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا بازو پھیلا دیئے تھے اور وہ بھی خاصی گرمجوشی سے ملا تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟ اور بی بی جان کی طبیعت کیسی ہے، اور مہر النساء آنٹی بھی ٹھیک ہیں نا؟" وہ فرداً فرداً سب کا پوچھ رہا تھا۔

"اللہ کا کرم ہے بیٹا سب اچھے حال میں ہیں، تم اپنی سناؤ، زونکلہ کیسی ہے؟" بابا جان کی تان آخر کار زونکلہ پہ آ کر ہی ٹوٹتی تھی۔

"زونکلہ بھی ٹھیک ہے، اس کے انگلینڈ جانے کے سارے انتظامات ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر سے اپائنمنٹ بھی لے لی ہے۔" یہ وہ جملہ تھا جو عارفین نے رابعہ شیرازی کے حسب منشا ادا کیا تھا، ورنہ بابا جان کو اندھیرے میں رکھنے کا خیال ہی اسے بے چین کر ڈالتا تھا۔

مگر اس کی مجبوری تھی اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی نام نہاد ماں گھر چھوڑ کر چلی جاتی اور وہ اپنی سوسائٹی میں کیا منہ دکھاتا؟ بیس سال ہو گئے تھے ملنے ملانے والے ابھی تک اس کے باپ کے گھر چھوڑ دینے کی باتیں کرید کرید کر پوچھتے تھے اور اب اگر اس کی ماں بھی ایسا کر گزرتی تو وہ آئندہ بیس سال ماں کے چلے جانے کی لوگوں کو وضاحتیں دیتا پھرتا...... اور یہ ہی وہ نہیں چاہتا تھا، اسی لئے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا اور اپنے ضمیر کی عدالت میں بابا جان کا چور بن گیا تھا۔

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، اگر تم زونکلہ کے ساتھ جانا چاہتے ہو تو تم بھی چلے جاؤ۔"

"نہیں بابا جان فی الحال تو وہ وہاں جا کر ڈاکٹر سے چیک اپ اور ٹریٹ منٹ کروائے گی، البتہ کچھ عرصہ بعد میں بھی چکر لگاؤں گا انگلینڈ کا۔" اس نے بابا جان کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا تھا۔

"انشاء اللہ اللہ ہماری مراد ضرور پوری کرے گا، تمہاری بی بی جان نے بہت سی منتیں

مان رکھی ہیں۔" بابا جان بہت خوش لگ رہے تھے اور ان کو خوش دیکھ کر عارفین کو اچھا لگا تھا۔

"اروی! اروی! کہاں ہو؟" واپس گھر آتے ہی عارفین نے اسے پکارنا شروع کیا تھا، نہ جانے کب اور کیسے اس میں روایتی شوہروں جیسے جراثیم پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، وہ ہی انداز و اطوار، وہ ہی لپک، وہی بے تابیاں تھیں اس میں...... گو کہ پہلے کبھی بھی اس نے ایسی حرکتیں نہیں کی تھیں، لیکن اروی کے معاملے میں وہ سچ مچ ایک مشرقی خواہشات رکھنے والا مرد اور شوہر ثابت ہو رہا تھا۔

"اروی۔" وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اوپر بیڈ روم میں چلا آیا تھا، لیکن اسے بستر میں لیٹا دیکھ کر ٹھٹک کر اندر آ گیا تھا۔ اس نے اروی کے چہرے سے آہستگی سے کمبل ہٹایا تھا اور اس کی نظریں اروی کے سیاہ گھنے اور دراز بالوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں، اس کے بال پورے بیڈ کا احاطہ کئے ہوئے لگ رہے تھے اور خود وہ گہری نیند سو رہی تھی، لیکن اس کے بالوں کی خوب صورتی ایسی تھی کہ عارفین انہیں چھونے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کے بالوں کو کھلے ہوئے دیکھ رہا تھا، پہلے اس نے نہ جانے کیسے چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی قربت کا احساس ہی تھا کہ اروی کی آنکھیں فوراً کھل گئی تھیں۔

"سر آپ؟" وہ اسے دیکھ کر یک دم اٹھ بیٹھی تھی، لیکن بوکھلاہٹ میں یہ بھول گئی کہ وہ دوپٹے کے بغیر سوئی ہوئی تھی، کیونکہ اسے عارفین کی واپسی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

"تمہیں سرپرائز دینے کے لئے بغیر بتائے آیا ہوں۔" عارفین نے کہتے ہوئے اروی کے مدہوش سراپے سے اپنی نگاہیں چرانے کی بھرپور کوشش کی تھی، مگر دل و دماغ بار بار اس کے حلئے میں اٹک رہے تھے۔ سیاہ بال اس کے وجود کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی براؤن آنکھیں ادھوری کچی نیند کی وجہ سے گلابی رنگ ہو رہی تھیں اور بغیر دوپٹے کے سراپا بہت ہی دلفریب سا نظارہ بخش رہا تھا۔ اروی اس کی نظروں کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر فوراً سامنے سے اٹھ گئی تھی اور لپک کر اپنا دوپٹہ اوڑھ لیا تھا۔ مگر اس وقت تو وہ کترا گئی تھی، لیکن رات جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی تو دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ حالانکہ پہلے بھی اتنے عرصہ سے وہ ایک ہی بیڈ شیئر کرتے آ رہے تھے، لیکن آج اروی کے لئے بیڈ بھی جیسے پل صراط بن گیا تھا، نہ لیٹ سکتی تھی، نہ وہاں سے اٹھ سکتی تھی۔ وہ دم سادھے کروٹ بدل کر سونے ہی والی تھی کہ عارفین نے اسے با

کے گھیرے میں لے کر قریب کر لیا تھا۔

''سر پلیز۔'' بے ساختہ احتجاج ابھرا۔

''ڈونٹ وری یار ہم میاں، بیوی ہیں۔'' اس کی گھمبیر سرگوشی اور مضبوط گرفت اروٰی کی رگوں میں دوڑتا لہو منجمد کر گئی...... عارفین نے دوسرے ہاتھ سے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا لیمپ بجھا دیا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سب کے لئے دل کھول کر دعا کی تھی، لیکن جب اپنے لئے کچھ مانگنے کی باری آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور آہستہ آہستہ اس کے آنسو ہچکیوں میں بدل گئے، وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے...... آج عارفین کی قربت کیا پائی تھی کہ ساتھ ہی کچھ کھونے کا دھڑکا بھی لگ گیا تھا۔ موسم بہار میں بھی اسے خزاں کی آمد کا خوف اپنے گھیرے میں لے چکا تھا، اس کا دل عارفین کی والہانہ چاہتوں سے بھی انکاری تھا، وہ ہر چاہت، ہر جذبے سے انکاری ہو رہی تھی، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ انجام بہت برا ہو گا۔ آج اس کی آنکھیں ہی نہیں دل بھی رو رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بہت سفاک آہٹیں سن رہی تھیں، لیکن اس کی سوچوں اور خدشوں سے ہٹ کے عارفین کچھ مطمئن تھا، کیونکہ وہ کوئی فیصلہ کر چکا تھا اور اس پہ پرسکون تھا۔

''کیا بات ہے اروٰی؟ تم روتی رہی ہو کیا؟'' وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اور وہ نظریں جھکائے اس کی تیاری میں اس کی ہیلپ کر رہی تھی، جب بے ساختہ عارفین کی نظر اس کی سرخ ناک اور سوجے ہوئے پپوٹوں سے ٹکرائی تھی اروٰی اس کی ٹائی میچ کر کے رکھ رہی تھی، اس کے سوال پہ رخ پھیر گئی تھی۔

''اروٰی ادھر دیکھو میری طرف۔'' عارفین نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اونچا کیا، اروٰی کے آنسو آنکھوں سے رخساروں تک سفر طے کر آئے تھے۔

''کیا کچھ غلط ہو گیا ہے؟'' عارفین کا لہجہ بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سخت بات کرتا اروٰی بے ساختہ اس کے سینے سے لگ کے بلک بلک کر رو پڑی تھی اور وہ اس کے ہچکیوں سے لرزتے وجود کو کتنے لمحے بس دیکھتا رہ گیا تھا، وہ اس کے رونے کا سبب ڈھونڈ رہا تھا اور جب ذہن وہاں تک پہنچا اسے بھی اروٰی کے رونے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی، جبھی اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اس کی کمر کو ہلکے سے سہلایا تھا۔

''دیکھو تم ابھی سے اپنے آپ کو پریشان مت کرو، انشاء اللہ، اللہ بہتر حل نکالے گا، میں وعدہ کرتا ہوں میری جان میں تمہارے ساتھ ہوں اب ہمارا رشتہ کاغذی رشتہ نہیں ہے، اب تم میری زندگی میں شامل ہو چکی ہو اور میں تمہیں اتنی آسانی سے اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا...... مجھے اپنے لئے اور تمہارے لئے کوئی اسٹینڈ ضرور لینا پڑے گا اور میں انشاء اللہ ایسا ضرور کروں گا۔ ڈونٹ وری پلیز، چپ ہو جاؤ رونے سے کچھ اچھا نہیں ہو گا۔'' وہ اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا اور وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''پلیز اروٰی اتنی ٹینشن مت لو، پانی پتھروں اور پہاڑوں کے درمیان سے بھی اپنی راہ بنا لیتا ہے اور گزر جاتا ہے، اور اسی طرح اگر رشتہ اور جذبہ سچا ہو تو وہ بھی پوری دنیا، پورے معاشرے میں اپنا آپ منوا لیتا ہے۔ ہمارا رشتہ ناجائز نہیں ہے، ہم میاں، بیوی ہیں، ہمارا تعلق کبھی نہیں ٹوٹے گا اور جس چیز سے تم ڈر رہی ہو میں اس چیز پہ مطمئن ہوں، مجھے خوشی ہو گی کہ تم میرے بچے کی ماں بنو گی اور یہ بچہ ہی ہو گا جو ہمارے رشتے کو مزید مضبوط بنائے گا، ایک دن تمہارے گھر والے اور میرے گھر والے اس حقیقت کو قبول کرنے پہ مجبور ہو جائیں گے، البتہ جس غلط طریقے سے اور غلط پلاننگ سے یہ سب کچھ ہوا ہے، وہ واقعی معافی کے قابل نہیں ہے، لیکن پھر بھی میں وقت آنے پہ تمہارے گھر والوں سے خود ہاتھ جوڑ کے معافی بھی مانگوں گا اور سب کچھ سچ سچ بھی بتاؤں گا، لیکن پلیز تم بس کچھ مت کرنا صرف اور صرف میرا ساتھ دینا، وقت اور حالات کے دھارے کو سمجھنے کی کوشش کرنا پلیز میری خاطر۔'' عارفین نے اسے بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن پھر بھی اس کے دل کا خوف اور دھڑکا کم نہیں ہوا تھا، البتہ وہ روتے روتے چپ ضرور ہو گئی تھی۔

''ارے مام آپ بے فکر رہیں سب کچھ ہماری خواہش کے مطابق ہی ہو رہا ہے، عارفین آج کل اس کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں، لگتا ہے اس پہ فدا ہو چکے ہیں، بس سمجھیں ہمارا کام ہو ہی جائے گا۔'' زونیہ یہاں کی ساری صورتِ حال رابعہ شیرازی کے گوش گزار کر رہی تھی۔

''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ان کے بیڈ روم کے اندر کے تعلقات کیسے ہیں؟ اک دوسرے کے قریب بھی آتے ہیں کہ نہیں؟ یا پھر وہ دونوں ناٹک کرتے پھر رہے ہیں؟'' رابعہ شیرازی کو اروٰی کی طرف سے کوئی ڈر نہیں تھا، کیونکہ انہوں نے ہر طرح سے وارن کر کے بھیجا

تھا۔ البتہ اصل پرابلم عارفین کی طرف سے تھی کہ کہیں وہ ہی ڈنڈی نہ مار جائے۔

''ارے مام آپ بھی پاگل ہیں شاید، ذرا خود سوچئے آگ کے اوپر اگر پانی رکھ دیا جائے تو وہ ضرور اُبلے گا، اسی طرح مرد اور عورت کا تعلق بھی آگ اور پانی جیسا ہی ہے یا تو آگ پانی بن جاتی ہے یا پھر پانی آگ بن جاتا ہے۔'' زوئلہ نے رابعہ شیرازی کو معنی خیز اشارہ دیا تھا وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔

''او کے۔ پھر ٹھیک ہے اور تم سناؤ لندن جانے کی تیاری مکمل ہے نا؟''

''یس مام سب کچھ مکمل ہے بس گڈ نیوز کا انتظار ہے۔'' زوئلہ بےزار ہوئی تھی۔

''ارے مائی سن گھبراؤ مت۔ انشاء اللہ سب کچھ تمہارے لئے ہی تو ہے۔'' انہوں نے اسے تسلی دی تھی اور زوئلہ خاموشی سے سب سنتی رہی، وہ سچ مچ اپنے فرینڈز اور پارٹیز سے دور ہو کر بور ہو گئی تھی اور جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اب اس کا ٹارگٹ انگلینڈ گھومنا تھا، اس کے دیگر رشتہ دار بھی وہاں تھے اور اس کے عیاش قسم کے کزن اس کا بےچینی سے انتظار کر رہے تھے۔

ٹھیک دو ماہ بعد ہی اروئی کو اپنی کنڈیشن بدلی ہوئی لگنے لگی تھی، اس کے کام کاج کرنے میں سستی اور کھانے پینے میں بےزاری آ گئی تھی اور بہت سی چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اسے ڈاکٹر سے چیک اپ کروائے بغیر ہی مشکوک کر ڈالا تھا، وہ تو بری طرح سہم گئی تھی، جبکہ عارفین کا دل پھول کی مانند کھل اٹھا تھا، وہ شام ہوتے ہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا اور پھر مثبت رپورٹ ملنے پر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی اور رفتہ رفتہ اس خوشی میں زوئلہ اور رابعہ شیرازی بھی شریک ہو رہی تھیں، اور عارفین نے خوشی کے مارے بابا جان کو بھی فون کر ڈالا تھا۔

''مبارک ہو بابا جان آپ پردادا بننے والے ہیں۔'' اس کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی، آج اس کے دل کی مراد پوری ہو رہی تھی، آج اس کی مردانگی پہ لگا دھبہ دھل گیا تھا، اور دوسری طرف بابا جان نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالا تھا۔

''شاباش میرے جوان تم نے ہمیں پرپوتے کی نہیں بلکہ زندگی کی دائمی خوشیوں کی نوید سنائی ہے، تم نے ہمارے دل کا ارمان پورا کیا ہے جیتے رہو، آباد رہو۔'' وہ کہتے کہتے اندر سے اداس بھی ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا بابا جان، آپ چپ کیوں ہو گئے؟'' وہ پریشان ہوا تھا۔

''نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے، تم سناؤ زوئلہ سے رابطہ ہوا، وہ کیسی ہے؟'' وہ بات اور لہجہ بدل گئے تھے۔

''جی وہ ٹھیک ہے، بہت جلد آپ سے بات کرے گی۔'' عارفین زوئلہ کے ذکر پہ کچھ مدھم پڑ گیا تھا، تب ہی اس کی نظر اروئی کی سمت اٹھی، وہ بےحد سست اور اداس قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر بیڈروم میں جا رہی تھی۔ اروئی کی اداسی اور چپ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

اروئی بہت دیر سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ایک ہی زاویے سے بیٹھی تھی، اس کی نظروں کا مرکز کوئی غیر مرئی نقطہ تھا، جبکہ عارفین کمپیوٹر میں کوئی ضروری کام کرتے ہوئے بار بار گردن موڑ کے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب تک وہ بیڈ پہ نہیں آتا تھا اروئی سوتی نہیں تھی، اسے عارفین سے پہلے سو جانا کچھ مناسب نہیں لگتا تھا، ابھی بھی وہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور وہ جلدی جلدی کام نبٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی اسے ایک گھنٹہ لگ ہی گیا تھا۔ جب وہ بستر پہ آیا اروئی بری طرح تھک چکی تھی۔

''کیا بات ہے، تم اتنی اداس کیوں ہو؟'' اپنی ٹانگوں پہ کمبل پھیلاتے ہوئے وہ اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

''کچھ نہیں بس نیند آ رہی ہے۔'' اروئی سیدھی ہو کر لیٹ گئی تھی اور کمبل سینے تک اوڑھ لیا تھا۔

''نیند تو اب آ رہی ہے جبکہ تم تو صبح سے ہی اداس اور چپ۔''

''پلیز سر آج کچھ مت کہیں۔ سونے دیں مجھے۔'' وہ عارفین کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے دوٹوک خفگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''لیکن اروئی تم۔''

''سر پلیز۔ کیا آج آپ میری بات نہیں مان سکتے؟'' وہ بھیگے سے انداز میں بولی تھی اور عارفین اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چپ ہو گیا تھا۔ اروئی اس کے بازو پہ سر رکھے لیٹی تھی، پلکیں موند کر سونے کی کوشش کی تو کئی آنسو خاموشی سے عارفین کے بازو پہ جذب

ہونے لگے تھے۔ بہت دیر تک وہ بے آواز روتی رہی اور بہت دیر تک وہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے سہلاتا رہا تھا۔ رات گئے جب وہ سوئی تو وہ آہستگی سے اس کی پیشانی پہ بوسہ دے کر خود بھی سونے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

اس خوشخبری کے فوراً بعد ہی زویلہ انگلینڈ چلی گئی تھی اور اب گھر میں وہ دونوں اکیلے ہوتے تھے۔ اروئ کی پریگنینسی کے چند روز بعد اچانک اروئ کی امی اور بہروز بھائی نے اروئ کو ایک بار گھر آنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ لوگ اس سے ملنا چاہتے تھے، اس کے بغیر اداس تھے اور اداس تو اروئ بھی تھی۔ لہٰذا اس کے موڈ کے پیش نظر عارفین نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی، لیکن اروئ کچھ ہچکچا گئی تھی۔ بے شک ابھی وہ جسمانی لحاظ سے پریگنیٹ محسوس نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی خود اس کو تو پتہ ہی تھا، وہ ایسی حالت میں گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

''ڈونٹ وری یار، کچھ نہیں ہوگا، میں بھی ایک ہفتہ کے لئے کراچی جا رہا ہوں، تم بھی میرے ساتھ چلو میں تم سے کانٹیکٹ کرتا رہوں گا اور ایک ہفتے بعد ہم دوبارہ واپس آ جائیں گے۔''

''لیکن سر میرا اس حالت میں گھر جانا مناسب نہیں ہوگا۔'' وہ آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

''دیکھو اروئ تمہیں یہاں آئے ہوئے چار، پانچ ماہ ہو چکے ہیں، اس لئے تمہارے گھر والے تم سے ملنے کے لئے اداس اور پریشان ہیں اور ابھی تمہاری ڈلیوری میں مزید چھ ماہ باقی ہیں تم خود سوچو تم اپنے گھر والوں کو اگلے چھ ماہ تک کیسے ٹالتی رہو گی؟ جبکہ میرے خیال میں تمہیں ان دنوں ان سے مل آنا چاہیے، تاکہ اگلے چھ ماہ تم آرام سے یہاں گزار سکو، اس طرح تمہارے گھر والے بھی مطمئن ہو جائیں گے اور دوبارہ تمہیں اتنی جلدی ملنے کا اصرار بھی نہیں کریں گے، پھر تم زیادہ کام کا بہانہ کر کے آسانی سے انہیں ٹال سکتی ہو۔'' عارفین کا آئیڈیا حقیقتاً کافی اچھا اور حقیقت کے قریب تھا۔ اروئ کو حوصلہ کرنا ہی پڑا تھا اور پھر جانے سے پہلے اس نے گھر والوں کے لئے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی تھی۔ بھابی، سونیا، سارہ، امی اور بہروز بھائی کے لئے چھوٹے موٹے گفٹ لئے تھے اور عارفین کے ساتھ کراچی آ گئی تھی۔

اروئ گھر پہنچی تو اسے سرپرائز ملا تھا، بھائی کے ہاں بیٹا ہوا تھا، لیکن ان لوگوں نے اروئ کو بتایا نہیں تھا۔

''ہائے امی سچ کہہ رہی آپ؟ کہاں ہے میرا بھتیجا؟'' وہ تیزی سے کمرے کی سمت

لپکی تھی اور پھر چھوٹے سے ننھے منے سے عمر کو دیکھ کر اس کا دل مچل گیا تھا۔ اسے گود میں اٹھا کر بے تحاشا پیار کر ڈالا تھا۔

''ارے پاگل دم تو لے لو اس کو بھی بوکھلا دیا ہے تم نے۔'' عمر گھبرا کر رو دیا تو امی نے اروئ کو مسکراتے ہوئے چپت لگائی تھی۔

''امی اتنا پیارا ہے یہ۔'' اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی بول رہی تھی، ثمینہ بھابی اور امی مسکرا اٹھیں، لیکن نہ جانے کیوں عمر کو بھابی کے پہلو میں لٹاتے ہوئے اروئ کے چہرے کی ہنسی تھم گئی تھی، اسے شاید دھیان کی طنابیں اپنی ذات کی طرف کھینچ کر لے گئی تھیں۔ وہ بھی تو ماں بننے والی تھی، اس کے اندر کی ممتا بھی تو آج کل عروج پر تھی، وہ بھی اس رتبے کو پہنچنے والی تھی۔ لیکن اس کی ممتا کا انجام کیا ہونا تھا؟ اور کس امتحان سے گزرنا تھا؟ یہ سوچ کر ہی ہونٹ چپ ہو گئے تھے۔ مسکراہٹ چہرے سے الگ ہو گئی تھی اور ہلکے خوف کی پرچھائیں لہرانے لگی تھی۔

''بھائی سے نہیں ملو گی؟'' امی نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

''ہوں ملتی ہوں ابھی۔'' وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور پھر کافی دیر تک بہروز بھائی کے پاس بیٹھی رہی، شام کو یسریٰ آپی بھی اس سے ملنے کے لئے آ گئی تھیں، گھر میں خوب رونق لگ گئی تھی، لیکن اروئ اپنے آپ کو اندر ہی اندر چور محسوس کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی حالت کا بھید کھل جانے کا دھڑکا لگا ہوا تھا اور ساتھ میں اداسی بھی تھی۔ عارفین اسے کال کرتا رہا تھا۔ مگر وہ سب کے درمیان کال نہیں سن سکتی تھی، اس لئے ان کی بات چیت میسجز میں ہوتی رہی، دونوں رات گئے تک میسج کرتے رہے تھے۔

اروئ کے گھر والے سچ مچ سے مل کر خوش اور مطمئن ہو چکے تھے اور واپسی پہ وہ بھی کچھ ریلیکس تھی۔

''کیسا گزرا ایک ہفتہ؟'' پلین میں بیٹھتے تو عارفین نے پہلا سوال یہ ہی کیا تھا۔

''ڈر ڈر کر گزرا ہے۔'' وہ اعتراف کر رہی تھی۔

''اوہ کم آن میری جان، اتنا ڈرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا، جتنا ڈرو گی، دنیا اتنا ہی ڈرائے گی۔'' عارفین نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے دبایا تھا۔

''اوہ آج تو کیوٹیکس بھی نظر آ رہی ہے؟'' اس کی نظر اروئ کے ناخنوں سے ٹکرائی تو

عارفین کا دھیان اروئی کی سمت تھا۔

''ڈاکٹر یہ کب تک ہوش میں آجائیں گی؟'' وہ ڈاکٹر کے پیچھے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

''یہ ڈرپ ختم ہونے تک انشاءاللہ وہ ہوش میں آجائیں گی، زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے اسے تسلی دی تھی۔ اور واقعی آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں آگئی تھی۔

''مبارک ہو اروئی ہمارے ہاں بیٹا ہوا ہے۔'' عارفین اس کے قریب آتے ہوئے بہت محبت سے بولا تھا اور اروئی کے لب بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ کو چھو بیٹھے تھے۔ مگر صرف ایک پل کے لئے۔

''عارفین تم نے اپنے بابا جان کو بتایا کہ وہ پردادا بن گئے ہیں؟'' رابعہ شیرازی کی آواز پہ اروئی نے چونک کر دیکھا تھا، وہ کمرے کے ایک کونے میں لگے صوفے پہ بیٹھی تھیں اور بچہ ان کی گود میں تھا۔ رابعہ شیرازی کی صورت نظر آئی تو ان کا پلان بھی دماغ میں گھوم گیا تھا۔

''میرا بچہ؟'' اروئی کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا تھا۔ اس کے سینے سے درد سے اک کراہ نکلی تھی۔

''کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو؟'' عارفین اس کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر جلدی سے اس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' وہ لیٹے لیٹے ہانپنے لگی تھی اور عارفین بدحواسی میں ڈاکٹرز کی سمت لپکا تھا اس کی حالت دیکھ کر رابعہ شیرازی بھی پریشان ہوگئی تھی۔

''ان کا بی پی لو ہوگیا ہے شاید۔'' نرس نے ڈاکٹر کو بتایا تھا، لیکن اس کی طبیعت بگڑتی جارہی تھی۔ بروقت ٹریٹ منٹ سے ڈاکٹر نے کنٹرول پالیا تھا۔

◈......◈......◈

زونئلہ کے واپس آنے تک روحان اروئی کے پاس ہی رہا تھا۔ وہ آٹھ دن اروئی نے مسلسل حانی کو اپنی نظروں کے سامنے رکھا تھا اور ایک سیکنڈ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیا تھا، لیکن ٹھیک آٹھ دن بعد زونئلہ واپس آگئی تھی۔

''سر پلیز ابھی...... ابھی کچھ دن اور اسے میرے پاس رہنے دیں۔'' جب روانگی کا وقت آیا اروئی رو پڑی تھی۔

''اروئی، حانی تمہارا ہے صرف تمہارا...... بس کچھ دن کی بات ہے، تم اس کو مام کے پلان کے مطابق گھر جانے دو۔ میں جلد ہی کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر بابا جان کو سچ سچ بتا دوں گا اور میں خود بابا جان کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گا، تمہارے گھر والوں کو سب کچھ خود بتاؤں گا۔''

''سر پلیز مجھے کچھ نہیں سننا، مجھے کوئی تسلی مت دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے، صرف چند دن پلیز، چند دن اور اسے میرے پاس رہنے دیں۔ میں نے تو ابھی اسے ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ ابھی تو میری ممتا کی پیاس بھی نہیں بجھی۔ ابھی تو میں نے اس کا کوئی کام بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا۔ پلیز سر مجھ پہ ترس کھائیں، اسے میرے پاس رہنے دیں، صرف چند دن اور۔'' اروئی حانی کو بانہوں میں بھینچے التجائیہ انداز میں کہتی بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ عارفین نے آہستگی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''عارفین یہ کیا ناٹک ہو رہا ہے؟ تم ابھی تک حانی کو لے کر نیچے کیوں نہیں آئے؟'' رابعہ شیرازی یک دم دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں اور اک دھاڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز پہ ننھا منا سا حانی یک دم ڈر کے رو پڑا تھا۔

''مام ہم چند دن اور رک جاتے ہیں، تب تک اروئی بھی ریلیکس۔''

''بس بہت ہوگیا یہ ناز نخرہ، تمہارے بابا جان کو پتہ چل چکا ہے کہ ہم لوگ آج ہی کراچی پہنچ رہے ہیں، وہ بھی گاؤں سے نکل چکے ہوں گے اور لڑکی تم کیوں اتنے ٹسوے بہا رہی ہو؟ تمہیں شروع سے پتہ تو تھا کہ یہ بچہ تمہارا نہیں ہے، اس کو پیدا کرنے کی تم ساری قیمت ایڈوانس لے چکی ہو۔ ہم نے اس بچے کے لئے تمہیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دیئے ہیں اور شکر ادا کرو ہم نے تم سے ناجائز نہیں بلکہ جائز کام کروایا ہے، باقاعدہ نکاح کروایا تھا تمہارا اور کچھ نہ سہی لیکن ضمیر کی عدالت میں تو سرخرو ہو نا تم۔ جس طرح تم ہمارے پلان کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گی اس طرح ہم بھی تمہارے گھر والوں سے سب کچھ راز رکھیں گے...... لہٰذا بہتر یہ ہی ہے کہ تم سب کچھ بھول جاؤ، تم لوگوں کے درمیان جو کچھ ہوا وہ ایک ڈرامہ تھا اور اب اس ڈرامے کا اینڈ ہو چکا ہے، بہت جلد تمہیں طلاق کے پیپرز بھی مل جائیں گے۔ تم اپنی پسند سے جہاں چاہے شادی کر سکتی ہو بلکہ ہم بھی تمہاری شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔ اس وقت ہمیں دیر ہو رہی ہے، تم بھی تیار ہو کر جلدی نیچے آجاؤ۔'' رابعہ شیرازی ہر بات کاٹ دار اور دو ٹوک لہجے میں کہتی ہوئیں اروئی کے ہاتھ سے حانی کو جھپٹ کر آندھی طوفان کی طرح باہر نکل

گئی تھیں اور عارفین ساکت بیٹھی اروٰی کو دیکھتا رہ گیا اور پھر لٹے پٹے قدموں سے وہ بھی واپس آ گئی تھی۔

اروٰی نے وہ کام، وہ سودا کیا تھا جو کوئی بھی عورت اتنی آسانی سے نہیں کر سکتی تھی، اس نے اپنے بھائی کی خاطر اپنا کلیجہ انگاروں پہ ڈال دیا تھا اور بدلے میں اسے کیا ملا تھا؟ بھائی کی زندگی اور اس زندگی سے جڑے بہت سے تلخ سچ...... وہ واپس تو آ گئی تھی، مگر بہت کچھ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

اروٰی اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد عارفین کے ساتھ جاب نہیں کر سکتی تھی، لیکن وہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے یہ جاب چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ اگر وہ فوری طور پہ جاب چھوڑتی تو بہت سے لوگوں کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والے بھی سوال کرتے اور وجہ پوچھتے اور دوسری بات یہ کہ اسے اتنی جلدی ایسی اچھی جاب دوبارہ ملنا ناممکن تھا۔ لہٰذا بہتر یہ ہی تھا کہ وہ کچھ عرصہ اور یہاں کام کرتی اور اپنے لئے کوئی نئی جاب تلاش کرتی۔

پورا ایک ماہ اس نے گھر پہ خوب ریسٹ کیا تھا اور تب جا کر جاب دوبارہ جوائن کرنے کی تیاری پکڑی تھی۔

"بیٹا کچھ دن اور آرام کر لیتیں، اتنی کمزور ہو چکی ہو تم، اپنی آنکھیں دیکھو، حلقے پڑ گئے ہیں، مجھے تو لگتا ہے تم وہاں دن رات بس کام کرتی رہی ہو، ان لوگوں نے تمہیں کھانا پینا ہرگز نہیں دیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی، بس اپنے گھر سے دور رہا جائے تو یہ ہی حال ہوتا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر ماں کی فکر دور کی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

"مے آئی کم ان میم؟" وہ اپنے کیبن میں بیٹھی تھی جب احمر انصاری دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔

"جی فرمایئے؟"

"میم میں آپ کا کولیگ ہوں، میں بھی یہاں جاب کرتا ہوں۔" احمر کو ہر ایک سے ہیلو ہائے کرنے کا شوق تھا۔ جبھی وہ ہر ایک سے ناگواری سمیٹتا رہتا تھا۔

"آپ یہاں جاب کرتے ہیں، لیکن کب سے؟ کیا نام ہے آپ کا؟" اروٰی کو

حیرانی ہوئی تھی۔

"تقریباً سات آٹھ ماہ ہو چکے ہیں، اسی لئے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، منیجر صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ عارفین سر کی ایک پی اے بھی ہیں جو آج کل مری برانچ میں کام کر رہی ہیں۔" احمر انصاری پہلی ملاقات میں ہی کافی باتونی لگ رہا تھا، ویسے تو وہ ہر لحاظ سے اچھا لڑکا لگ رہا تھا، بس خوامخواہ بے تکلف ہونے کی عادت غلط تھی۔

"مسٹر احمر آپ اس وقت اپنے کیبن میں جایئے سر آنے والے ہوں گے۔" اس نے آہستگی سے کہا اور دراز سے فائلیں نکالیں۔

"جی میم، پھر ملاقات ہو گی، بائے۔" وہ ہاتھ ہلا کر چلا گیا تھا۔ اتنے میں عارفین کی آمد بھی ہو چکی تھی۔

وہ آج اروٰی کو آفس میں دیکھ کر ٹھہر سا گیا تھا، لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

"کیسی ہو اروٰی؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟ تم نے اتنے دنوں سے اپنا سیل آف کیوں کر رکھا ہے؟" وہ آفس روم میں آئی تو عارفین بے تابی سے پوچھتا چلا گیا تھا۔

"جی۔ سر میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ پلیز ان فائلز کو ایک بار پھر چیک کر لیں۔" وہ مختصر سا جواب دے کر کام کی بات پہ آ گئی تھی۔

"اروٰی تم مجھ سے کیوں خفا ہو؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب تو ہونا ہی تھا، میں تو اب بابا جان کو اصل بات بتانے کی کوشش میں ہوں، بس کوئی مناسب موقع ہاتھ نہیں آ رہا۔"

"سر میں نے آپ سے کچھ کہا؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"یہ تو پرابلم ہے کہ تم کچھ کہہ نہیں رہیں۔" وہ جھنجھلا گیا تھا۔

"سر میں کچھ کہوں گی بھی نہیں، جو ہو گیا، سو گیا بس سینے میں ہلکا سا درد جاگتا ہے، تو اسے تھپک کر سلا دیتی ہوں۔"

"اروٰی مایوس مت ہو، حانی تمہارا ہے اور صرف تمہارا ہے، بلکہ حانی کے ساتھ ساتھ میں بھی تمہارا ہوں، تم میری زندگی ہو، اور ہم نے زندگی مل کر گزارنی ہے، بس اس کے لئے زندگی کی تمام راہیں صاف کرنا ضروری ہے اور میں بہت جلد ایسا ہی کروں گا۔" وہ اسے یقین دلا رہا تھا۔ مگر وہ کوئی بات بھی دلچسپی سے سنے بغیر اپنے کام کی فائل اٹھا کر چلی گئی تھی اور پھر ایسا

روز ہونے لگا تھا وہ پکارتا رہ جاتا وہ سنی ان سنی کر ڈالتی تھی۔

❁......❁......❁

آج بہروز بھائی کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لئے جانا تھا، اس لئے اروی آفس سے ذرا پہلے ہی آ گئی تھی، دوپہر دو بجے کا وقت تھا، وہ پیدل چلتی ہوئی ایک بس سٹاپ پہ آ رکی تھی، اس بس سٹاپ سے ایک روڈ رہائشی ایریا کی طرف نکلتا تھا، ایک بازار کی طرف اور ایک سنسان علاقے کی طرف، جہاں لوگوں کا بہت ہی کم آنا جانا ہوتا تھا، اس لئے اس طرف ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اروی کو وہاں کھڑے ابھی چھ، سات منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے نسوانی چیخوں کی آواز ماحول کو چیرتی ہوئی سنائی دی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر آگے پیچھے دیکھا، لیکن آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ مگر چیخنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی، بلکہ رفتہ رفتہ قریب آتی سنائی دے رہی تھی، تبھی اروی نے پلٹ کر پچھلے روڈ کی سمت دیکھا، جہاں اس دوپہر اور تیز دھوپ میں ایک لڑکی ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی نظر آئی تھی اور پھر اس کے پیچھے دو، تین لڑکے بائیک پہ آتے نظر آئے تھے، اروی چند سیکنڈز میں ہی ساری سچویشن سمجھ گئی تھی۔

''اے لڑکی اسے ہماری طرف بھیج ورنہ ایک کی بجائے دو شکار کھیلیں گے ہم۔''

بائیک پہ سوار ایک لڑکے نے کافی خباثت سے کہا تھا اور اروی نے اس آواز کے تعاقب میں کافی حیرت سے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

''جرار......؟'' جتنا شدید جھٹکا اروی کو لگا تھا اتنا ہی شدید جھٹکا جرار کو بھی لگا تھا اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

''اروی؟'' اندر سے وہ بری طرح گھبرا گیا تھا جبکہ دوسرے دونوں لڑکے جرار کی حالت سے بے خبر نہ جانے کیا اول فول بک رہے تھے۔

''خبردار جو تم نے اس کو ہاتھ بھی لگایا تو......'' اروی کی غضب ناک آواز پہ وہ ٹھٹک گیا تھا۔

''اوئے کیوں نہ ہاتھ لگاؤں؟'' وہ لڑکا معنی خیزی سے بولا تھا اور جواباً اروی نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

''مسٹر جرار تم اپنی کمینگی میں اس حد تک جا چکے ہو مجھے اندازہ نہیں تھا جی چاہ رہا ہے تمہارے منہ پہ تھوک کر چلی جاؤں......تم لوگوں کی عزتیں داؤ پہ لگاتے پھر رہے ہو گھٹیا بے غیرت انسان تمہیں ذرا شرم نہیں آئی کسی کی بہن اور بیٹی کی عزت پہ ہاتھ ڈالتے ہوئے؟'' وہ اس لڑکی کو تھپڑ مار کر سیدھی جرار کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور ان دونوں لڑکوں کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی بھی حیرت سے دیکھنے لگی تھی کہ وہ دونوں اک دوسرے کو جانتے ہیں؟''

''اروی......وہ......وہ یہ لڑکی۔'' جرار سے کوئی بات کوئی بہانہ نہیں بن پڑا تھا۔

''شٹ اپ اپنی غلیظ ناپاک زبان سے میرا نام بھی مت لینا بدکردار انسان اور آئندہ کبھی ہمارے گھر کا رخ بھی مت کرنا، اور ہاں آئندہ کسی کی عزت سے کھیلنے سے پہلے ذرا یہ سوچ لینا کہ تمہاری اپنی بھی کوئی بہن ہے اگر اسی طرح وہ اس سڑک پہ ننگے سر بھاگ رہی ہو تو تمہیں کیسا لگے گا؟ لیکن میرا خیال ہے تم جیسے بے غیرت کو اپنی بہن کی بھی پروا نہیں ہوگی۔'' وہ انتہائی بلند آواز سے حقارت سے کہتی ہوئی جرار کے پیچھے بیٹھے لڑکے سے اس لڑکی کا دوپٹہ جھپٹ کر واپس پلٹ گئی تھی۔ وہ لڑکی کالج کی سٹوڈنٹ تھی روزانہ یہ لوگ اس کا پیچھا کرتے تھے لیکن وہ اپنی دوستوں کے گروپ کے ساتھ ہوتی تھی اس لئے کبھی ہاتھ نہیں آتی تھی لیکن آج اتفاقاً وہ اکیلی کالج سے واپس جا رہی تھی کہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور قسمت اچھی تھی کہ اس کا ٹاکرا اروی سے ہو گیا تھا ورنہ وہ ان تین شیطان صفت لوگوں سے بچنے والی نہ تھی بس اللہ نے اسے بچانے کا وسیلہ بھیج دیا تھا اور یہ اس کے رب کا بہت بڑا کرم تھا۔

اس لڑکی کے گھر والے اروی کے مشکور ہو رہے تھے اور اروی کو واپس اپنے گھر آتے ہوئے شام ڈھل چکی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا اتنی دیر کیوں کر دی؟ تمہیں پتہ تو تھا کہ بہروز کا آج چیک اپ ہونا تھا؟'' امی پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔

''بس وہ آفس میں کام زیادہ تھا آج اس لئے چھٹی نہیں مل سکی۔'' اروی اصل بات پہ پردہ ڈال گئی تھی۔

لیکن جرار، اروی سے زیادہ تیز نکلا تھا اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی وکالت کے لئے اپنی بہن کو فون کر کے بھڑکا دیا تھا۔

''اروی ادھر آؤ میری بات سنو۔'' رات کو وہ عشاء کی نماز پڑھ کر سونے کی تیاری کر رہی تھی جب ثمینہ بھابی نے اروی کو چھت پہ بلایا تھا اروی فوری طور پر کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھی لیکن جب بھابی کے عین سامنے پہنچی تو ذہن میں دوپہر والی بات کوندے کی طرح لپکی تھی۔

''جی کہیے خیریت ہے نا؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولی تھی۔

''خیریت کہاں ہے بھلا؟ جرار کا فون آیا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس کے دوستوں کی ایک لڑکی سے کافی دنوں سے تو تو، میں میں، چل رہی تھی اس لئے آج وہ لوگ اس لڑکی کو ڈرانے دھمکانے کے ارادے سے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ لڑکی سچ مچ ان سے ڈر کے بھاگ کھڑی ہوئی اور اس کا تم سے ٹکراؤ ہو گیا۔''

''بھابی آپ نے مجھے کس لئے بلایا تھا؟'' ارویٰ ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔

''میں نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ تم جرار کے بارے میں جو کچھ بھی سمجھ رہی ہو وہ سب غلط ہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا اس لئے تم کوئی بے بنیاد الزام لگا کر گھر والوں کو کچھ مت بتانا جو بات جہاں ہے اسے وہاں ہی رہنے دو۔''

''کیوں رہنے دو بھابی؟ کیا وہ آپ کا لاڈلا چہیتا بھائی ہے اس لئے؟ آج ایک شریف خاندان کی عزت وہ دوستوں کے ساتھ مل کر تباہ کرنے جا رہا تھا اس کی کوئی پروا نہیں ہے آپ کو؟ آپ صرف اس پہ یقین کر رہی ہیں جو آپ کا بھائی کہہ رہا ہے؟ ایک لڑکی کے سر سے دوپٹہ چھین لیا جائے اس پہ تشدد کیا جائے اسے سنسان علاقے میں لے جا کر زیادتی کے گھناؤنے عزائم سے زدوکوب کیا جائے اور بعد میں کہا جائے صرف ڈرایا دھمکایا تھا کیا آپ کے خیال میں یہ سب ہی سچ ہے؟'' ارویٰ پھٹ پڑی تھی۔

''آہستہ بولو اروی لوگ سنیں گے۔'' بھابی نے اسے گھورا تھا۔

''جس طرح آپ کو لوگوں کی فکر ہے اسی طرح ہر ماں باپ کو اپنی بیٹیوں کی عزت کی فکر ہے آپ اپنے بھائی کی وجہ سے اس کی غلطی اس کے گناہ سے آنکھ چرا رہی ہیں مگر ساری دنیا تو ایسا نہیں کر سکتی نا؟ وہ تو اس لڑکی کے گھر والے شریف لوگ تھے اس لئے معاملہ پولیس تک نہیں جانے دیا اگر وہ لوگ پولیس کو بتاتے تو میں بھی یقیناً جرار کے خلاف ضرور گواہی دیتی کیونکہ چشم دید گواہ تو میں ہی تھی نا؟''

''دیکھو اروی اللہ کے لئے آہستہ بولو، آس پاس والوں نے یا گھر میں کسی نے سن لیا تو کیا سوچیں گے ٹھیک ہے میں مانتی ہوں کہ وہ غلط ہے اور اس کی غلطی کے لئے میں معافی مانگنے کو تیار ہوں وہ میرا ایک ہی تو بھائی ہے میں اب اس کے ساتھ اور کیا کروں؟'' خلاف توقع

بھابی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا اور انداز میں بے بسی اور شرمندگی اتر آئی تھی۔

اروی نے بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا تھا انہوں نے ہاتھ جوڑ کے اروی کو چپ رہنے کا کہا تھا اور اروی بھلا کب تک کسی کے بندھے ہاتھوں سے نظر چرا سکتی تھی بالآخر خاموش ہو ہی گئی تھی کیونکہ اس کی بھابی رشتے اور عمر دونوں میں اس سے بڑی تھیں اسے کچھ تو لاج رکھنا ہی تھی۔ جب وہ لڑکی جس پہ تشدد ہوا تھا وہ عزت کی وجہ سے چپ ہو کے بیٹھ گئی تھی۔ اروی تو پھر بھی صرف ایک گواہ تھی۔

❂......❂......❂

''عارفین ادھر آؤ میری بات سنو۔'' وہ شاید کہیں باہر جا رہا تھا جب بابا جان کی آواز پہ لاؤنج میں چلا آیا تھا بی بی جان بھی وہاں ہی تھیں اور حانی ان کی گود میں سو رہا تھا۔

''کیا تمہیں اپنی بیوی کی کوئی پروا نہیں ہے؟'' ان کے سوال پہ وہ یکدم چونک گیا تھا اس کا خیال اروی کی سمت گیا تھا۔

''کیا مطلب بابا جان؟'' وہ الجھن بھرے انداز سے بولا تھا۔

''زوئلہ گھر پہ رہے گھر سے باہر رہے، تمہیں کوئی احساس ہی نہیں ہوتا؟ میں دو دن سے دیکھ رہا ہوں وہ دوپہر کے وقت گھر سے نکلتی ہے اور فجر کے قریب واپس آتی ہے اور آج تو وہ واپس بھی نہیں آئی۔'' بابا جان کی بات پہ عارفین گہری سانس کھینچ کے رہ گیا تھا۔

''بابا جان کون سا ایسا مرد ہے جسے بیوی کے گھر سے باہر رہنے کا کوئی احساس ہی نہ ہو؟ احساس ہوتا ہے، مجھے بھی احساس ہوتا ہے۔ مگر میں اس احساس کے بعد کیا کروں؟ وہی کچھ جو میرے باپ نے کیا؟ یا پھر وہ جو ہماری سوسائٹی کے نوے فیصد مرد کر رہے ہیں۔'' عارفین کے جواب پہ بابا جان ٹھٹک گئے تھے اور بی بی جان بھی چونک گئی تھیں۔ بیوی کی عیاشی کے بعد جو کچھ اس کے باپ نے کیا تھا وہ بی بی جان اور بابا جان کے لئے آج بھی ایک تازہ زخم کی مانند تھا اور وہ لوگ پوتے کو بھی اسی راہ پر ڈال رہے تھے؟

وہ دونوں اندر سے دہل گئے تھے حالانکہ بات بھی انہوں نے چھیڑی تھی۔

''دیکھیے بابا جان! میرے والد محترم کی طرح گھر چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے اور نہ ہی باقی مردوں کی طرح بیوی کے کرتوتوں سے چشم پوشی کر لینا اس کا حل ہے۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ یا تو بیوی کو اپنے رشتے میں ایسا باندھ کر رکھو کہ وہ کہیں بھی جانے نہ

پائے، اور اگر چلی جائے تو پھر واپس نہ آئے۔ ایک مشرقی مرد کی زندگی میں عیاش، بدکردار بیوی کی کبھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر پھر بھی وہ اسے اپنی زندگی میں برداشت کرتا ہے، تو اس برداشت کے پیچھے اس مرد کی کوئی بہت بڑی مجبوری یا پھر کمزوری ہوتی ہے، اور زوئلہ کو برداشت کرنے کے پیچھے میری سب سے بڑی مجبوری میری ماں ہے اگر کبھی میری یہ مجبوری پیچھے ہٹ جائے تو زوئلہ کو طلاق کے تین جملے کہنے میں مجھے محض تین منٹ لگیں گے۔'' عارفین آج بات کرتے کرتے یکدم بپھر گیا تھا زوئلہ کی عیاشیوں کو برداشت کر کر کے اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔

''ارے نہیں بیٹا ہم ایسا نہیں کہہ رہے کہ تم زوئلہ کو چھوڑ دو بلکہ ہم تو چاہتے ہیں کہ تم اسے آرام سے سمجھاؤ۔'' بابا جان نے بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

''کیا میری ماں رابعہ شیرازی میرے باپ کے سمجھانے سے سمجھ گئی تھی؟'' عارفین نے تمسخرانہ کہا تھا۔

''بابا جان زوئلہ بھی رابعہ شیرازی کی بھانجی ہے وہ بھی وہی کرتی ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ میں ہر رات سوچتا ہوں کہ کچھ ایسا کروں تا کہ وہ میری زندگی سے دفع ہو جائے لیکن ہر صبح میں بے بس ہو جاتا ہوں کیونکہ میرے سامنے میری نام نہاد ماں کھڑی ہوتی ہے۔ جب ہماری بیوی، سب کی بیوی بنے تو پھر اسے اپنی بیوی بنائے رکھنا سب سے بڑی بے غیرتی ہے اور میں بہت عرصے سے یہ بے غیرتی کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن جس روز برداشت کی حد ختم ہو گئی تب میں نہ کوئی مجبوری دیکھوں گا اور نہ ہی کوئی کمزوری۔''

''مگر بیٹا حانی کا کیا ہو گا؟'' وہ ماں ہے اس کی؟ وہ ماں کے بغیر کیسے رہے گا؟'' بی بی جان نے اسے حانی کا احساس دلایا تھا۔

''بی بی جان اب بھی وہ 'ماں کے بغیر' ہی رہ رہا ہے۔'' عارفین کے کہنے کا مطلب کچھ اور تھا جبکہ وہ لوگ کچھ اور سمجھے تھے۔

''مگر بیٹا......''

''بس بی بی جان جو کچھ جیسا چل رہا ہے فی الحال چلنے دیں انشاء اللہ سب بہتر ہی ہو گا۔'' وہ انہیں تسلی دینے والے انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر سر جھٹک کر باہر نکل گیا تھا وہ دونوں پریشان سے بیٹھے تھے صرف یہ سوچ کر کہ کیا بیٹا، باپ کی تاریخ کو دہرانے والا تھا؟

سبطین شیرازی کی نسبت بچپن سے ہی مہر النساء سے طے ہو چکی تھی لیکن سبطین بہت ہی رنگین مزاج اور حسن پرست مرد تھا جبکہ اس کی چچا زاد کزن مہر النساء اس کے معیار حسن پہ ہرگز پورا نہیں اترتی تھی اس لئے وہ مہر النساء سے کترایا کترایا سا رہتا تھا لیکن بابا جان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ سبطین کا رجحان مہر النساء کی طرف ہی ہو اور اس کے لئے وہ سبطین شیرازی کے روز و شب کا پورا پورا پہرہ دیتے اور اس کا دھیان رکھتے تھے۔

سبطین اور مہر النساء دونوں ہم عمر تھے اس لئے دونوں ایک ساتھ پڑھ رہے تھے حالانکہ سلطین کو مہر النساء کے ساتھ پڑھنے پہ بہت اعتراض ہوتا تھا مگر بابا جان کے سامنے اس کی دال ہرگز نہیں گلتی تھی وہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارتا مگر بچ نہیں پاتا تھا۔ بابا جان کو اپنی بن ماں باپ کی بھتیجی اتنی ہی عزیز تھی جتنا اپنا اکلوتا بیٹا عزیز تھا وہ کبھی بھی اس کی حق تلفی یا پھر ناانصافی نہیں ہونے دیتے تھے اس لئے جب سبطین نے کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو انہوں نے خود بہ خود ہی مہر النساء کا ایڈمیشن بھی اس کے ساتھ کروا دیا تھا۔

اس طرح کر کے بابا جان شاید اس کی آوارہ مزاجی کے آگے بند باندھ رہے تھے مگر کوئی مرد کسی بند باندھنے سے بند جائے ایسا کبھی پہلے ہوا تھا؟ جواب ہوتا؟ سبطین شیرازی کی نظر یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی رابعہ درانی پہ ٹھہری تھی اور اس سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی مہر النساء بہت ہی سادہ سی اپنی ذات میں گم رہنے والی لڑکی تھی اسے ایک ہی یونیورسٹی اور ایک ہی کلاس روم میں رہتے ہوئے کبھی بھی سبطین اور رابعہ درانی کے عشق و عاشقی کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ مگر بابا جان ان سے دور رہتے ہوئے بھی ساری خبر رکھتے تھے انہوں نے ایک روز سبطین شیرازی کو گھیر لیا تھا۔

''سبطین میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ بہت برا انجام ہو گا تمہارا۔'' انہوں نے اسے وارننگ دی تھی۔

''میں رابعہ کو پسند کرتا ہوں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' بالآخر اس نے کہہ دیا تھا۔

''کیا کہا؟'' بابا جان دھاڑ اٹھے تھے۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں مہر النساء کو پسند نہیں کرتا مجھے ایسی دقیانوسی بیوی نہیں چاہئے، میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو میرے قدم سے قدم ملا کر چلے۔ جو میرے ہر مسئلے کا حل ہو نہ کہ خود ایک مسئلہ بن جائے۔'' اس نے مہر النساء کے خیال سے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

''تم ابھی نادان ہو سبطین شیرازی قدم سے قدم ملا کر چلنے والی بیویاں اکثر بہت

آگے نکل جاتی ہیں اور پھر تم جیسے نام نہاد و غیرت مند کبھی بھی ان کے قدم سے قدم نہیں ملا پاتے کیونکہ ان کی رفتار تم لوگوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔'' بابا جان نے بیٹے کو ملامت کی تھی۔

''آپ جو جی چاہے کہہ لیں مگر میری شادی صرف رابعہ سے ہی ہوگی یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' سبطین شیرازی باپ کے سامنے ڈٹ گیا تھا آخر حسن کے جس جال میں وہ پھنسا تھا وہاں کچھ اور نظر آ جاتا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

سبطین شیرازی نے رابعہ درانی کو کورٹ میرج کے لئے اکسایا مگر رابعہ درانی کورٹ میرج نہیں بلکہ پراپر طریقے سے شادی کرنا چاہتی تھی تاکہ پورے شہر اور پوری یونیورسٹی کو پتہ چلتا کہ سبطین شیرازی اسے پسند کرتا ہے اور اسے بیاہنے آیا ہے مگر بابا جان کی یونیورسٹی آمد نے اس کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

''تم لڑکیوں میں سے رابعہ درانی کون ہے؟'' انہوں نے غضب ناکی سے پوچھا تھا۔

''میں ہوں رابعہ درانی آپ کون ہیں؟'' رابعہ درانی تیکھے تیور لئے سامنے آئی تھی۔

''سبطین کہاں ہے دو دن ہو گئے ہیں وہ گھر نہیں آیا۔''

''میں آپ کے سبطین کو اپنے پرس میں لے کر نہیں گھوم رہی، آپ کا بیٹا ہے آپ کو خبر ہونی چاہئے کہ وہ کہاں ہے؟'' وہ چڑ گئی تھی۔

''بیٹا میرا ہے مگر عاشق تو وہ تمہارا ہے نا؟ تم اسے آج کل اپنے پرس میں تو کیا اپنے دوپٹے کے پلو میں بھی لے کر گھوم سکتی ہو تمہارا دم چھلا بنا ہوا ہے۔'' بابا جان کا دل چاہ رہا تھا اس شاطر لڑکی کو کھڑے کھڑے گولی مار دیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ سبطین شیرازی اپنی چچازاد سے انگیج ہے، پھر بھی اس پہ ڈورے ڈال رہی تھی۔

''آپ ذرا دھیان سے بات کریں بزرگوار، آپ کا بیٹا میرے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہے، میں نہیں۔'' وہ نخوت سے بولی تھی۔

''میرے بیٹے کو دعوت نظارہ دیتی ہو تو وہ گھومتا ہے نا؟'' بابا جان کی بات پہ رابعہ درانی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا، وہ کھلم کھلا سب کے سامنے اس کی انسلٹ کر رہے تھے اور پھر دونوں میں اس قدر جھڑپ ہوئی کہ بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

''بابا جان آپ یہاں؟ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' مہر النساء ابھی ابھی کلاس روم سے باہر نکلی تھی اور بابا جان کو رابعہ درانی پہ مشتعل ہوتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

''ہونہہ بڑی آئی بابا جان کی چہیتی، تمہیں تو میں دیکھ لوں گی...... سبطین شیرازی میرا ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گی، دیکھتی ہوں کہ آپ بھی کیا کرتے ہیں؟'' اس نے سب کے سامنے ان کو چیلنج کیا تھا۔

''عیاش عورتیں اسی طرح پوری دنیا میں اعلان کرتی ہیں۔'' بابا جان آج حد پار کر رہے تھے۔

''میں بے شک عیاش ہی سہی، مگر آپ کی اس پاک دامن بی بی کو کبھی سبطین کی بیوی نہیں بننے دوں گی، یہ اس کے نام کو تو کیا صورت دیکھنے کو بھی ترسے گی، میں اس بے عزتی کا بدلہ عمر بھر لوں گی آپ لوگوں سے۔'' رابعہ درانی کا چیلنج سچ ثابت ہوا تھا اس نے اسی دن سبطین شیرازی سے نکاح کر لیا تھا اور اسی رات وہ ''شیرازی ہاؤس'' میں آ گئی تھی جہاں آج کل بابا جان اور مہر النساء ٹھہرے ہوئے تھے۔

''یہ گھٹیا لڑکی میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتی۔'' بابا جان چیخے تھے۔

''بابا جان آہستہ بات کریں، یہ اب آپ کی بہو ہے۔'' سبطین شیرازی کا دوٹوک لہجہ بابا جان کو خاموش کروا گیا تھا۔ رابعہ درانی کا جادو اس کا نشہ سر چڑھ کے بول رہا تھا اور بابا جان مزید کچھ بھی سننے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ وہ اب وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے، روتی بلکتی مہر النساء کو لے کر واپس گاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔

''آئندہ کبھی شیرازی ہاؤس میں قدم مت رکھنے محترمہ مہر النساء...... ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔'' رابعہ درانی نے مہر النساء کے پیچھے فقرہ کسا تھا اور مہر النساء بے مروت سے کھڑے سبطین شیرازی کو اک نظر دیکھ کر شیرازی ہاؤس سے نکل گئی تھی۔ یہ وہ شیرازی ہاؤس تھا جس کے بابا جان نے خواب دیکھے تھے کہ سبطین اور مہر النساء یہاں ایک ساتھ رہیں گے۔ مگر......

رابعہ شیرازی سبطین کے عشق میں ایسی اندھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنا اچھا برا دیکھے بنا اس سے نکاح کر لیتی، اس نے سبطین شیرازی کے اکلوتے پن اور دولت، جائیداد اور جاگیر سب کچھ دیکھ اور پرکھ کر اس کو اپنے دام میں الجھایا تھا اور وہ ''حسن پرست'' بڑی آسانی سے الجھ بھی گیا تھا۔ پورا ایک سال ہو گیا تھا وہ نہ گاؤں گیا تھا نہ ہی کسی سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ ایک سال بعد عارفین کی پیدائش پہ بی بی جان اور بابا جان خود ہی بن بلائے مہمان کی طرح ملنے

آ گئے تھے، لیکن رابعہ شیرازی کا رویہ ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ صرف پوتے سے مل کر ہی واپس چلے گئے تھے اور سبطین شیرازی انہیں روک بھی نہیں پایا تھا۔

وہ رابعہ شیرازی جو عارفین کی پیدائش تک پھونک پھونک کے قدم اٹھاتی آ رہی تھی، ایک بچے کی ماں بننے کے بعد بالکل آزاد ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا احتیاط کا چولا اتار پھینکا تھا۔ اب اس کے دن سوتے تھے اور راتیں جاگتی تھیں۔ عارفین گورنس کے ہاتھوں پل رہا تھا اور سبطین شیرازی اس کے رنگ ڈھنگ اور روٹین دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ رابعہ شیرازی محض پارٹیز میں ہی نہیں جاتی بلکہ اس کے کئی فرینڈز کے ساتھ تعلقات بھی ہیں اور اس کے تعلقات کی نوعیت سامنے آتے ہی اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ لہٰذا رابعہ شیرازی کے کرتوتوں کو جاننے کے بعد آئے روز ان کے بیڈ روم میں جھگڑے ہونے لگے تھے۔ مگر سبطین شیرازی جو اپنی تمام کشتیاں جلا چکا تھا۔ وہ شکست خوردہ سا بیٹھا رہ گیا تھا اور اس مقام پہ آ کر اسے مہرالنساء بہت شدت سے یاد آئی تھی، اور یہ مہرالنساء کی طلب ہی تھی کہ وہ ہر بات بھلا کر واپس حویلی چلا آیا تھا۔ جہاں آج کل مہرالنساء کے رشتے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

''مہرالنساء مجھے معاف کر دو۔'' اس نے مہرالنساء کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''معافی کیسی سبطین؟ تم اپنی زندگی، اپنی مرضی کے مالک تھے، تمہیں جو اچھا لگا تم نے کیا، اس میں معافی کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا؟''

''نہیں مہرالنساء میں تمہارا مجرم ہوں، تم بچپن سے میرے نام سے منسوب تھیں اور میں نے چند دنوں میں اتنا گہرا رشتہ......''

''سبطین خونی رشتوں کے علاوہ کوئی بھی رشتہ گہرا نہیں ہوتا، بس اب یہ ہی دیکھ لو ہم دونوں منگیتر نہیں ہیں، مگر چچازاد کزن اب بھی ہیں۔ ہمارا صرف ایک رشتہ ہے جو حقیقتاً ایک کچا رشتہ تھا اور کچے رشتوں کے ٹوٹنے پہ دل اتنا چھوٹا بھی نہیں کرنا چاہئے کہ بندہ کسی اور کام کا ہی نہ رہے۔ مجھے بھی شروع شروع میں یہی لگا تھا کہ میری دنیا ختم ہو گئی ہے۔ مگر اب پتہ چلا ہے کہ میری دنیا صرف ''تم'' ہی نہیں تھے میری دنیا تو بی بی جان بھی ہیں، میری دنیا تو بابا جان بھی ہیں، میری دنیا یہ حویلی ہے، یہ گاؤں ہے...... میری دنیا بہت وسیع ہے سبطین، ایک تم نہ ہوئے تو کیا ہوا بھلا؟'' مہرالنساء نے اسے اس کی اہمیت جتا کر بھی بے وقعت کر ڈالا تھا۔

''میں تمہاری دنیا نہ سہی مہرالنساء مگر تم میری دنیا ضرور بن چکی ہو، تم مجھے بے شک

اہم نہ جانو، لیکن تم میرے لئے کتنی اہم ہو، میں ان دو سالوں میں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ پلیز مہرالنساء مجھے اپنا لو، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری طرف واپس پلٹنا چاہتا ہوں۔'' ہتھیار ڈال دیئے تھے، مگر مہرالنساء کبھی مر کے بھی کسی کی سوتن نہیں بن سکتی تھی اس نے ہزار منتوں اور واسطوں کے باوجود سبطین شیرازی کو واپس لوٹا دیا تھا اور ساتھ والے گاؤں سے آنے والے پرپوزل کے لئے حامی بھر لی تھی، اس کی شادی کی خبر سن کر سبطین شیرازی ایک بار پھر حویلی بھاگا آیا تھا۔ اس نے مہرالنساء کو ہر ممکن طریقے سے اس شادی سے منع کیا تھا۔ مگر وہ باز نہیں آئی تھی اور مہرالنساء کو ہمیشہ کے لئے کھو دینے کا احساس سبطین شیرازی کو روگ کی طرح لگ گیا تھا۔

رابعہ شیرازی کو شوہر کی دیوانگی کا علم ہوا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دنگا فساد مچایا تھا۔ مگر اس کے اطمینان کے لئے یہ کافی تھا کہ مہرالنساء کی شادی ہو گئی ہے۔

''ابھی تک اپنی چہیتی کا روگ لئے بیٹھے ہیں؟ وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ عیش کر رہی ہو گی اور آپ کو فقیر بنا کے یہاں بٹھا گئی ہے۔'' رابعہ شیرازی نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

''کاش اس نے بہت پہلے مجھے اپنا فقیر بنا دیا ہوتا تو میں آج تمہاری یہ مکروہ شکل بھی نہ دیکھتا۔ کاش مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ میں ایک نایاب ہیرا ٹھکرا کر تم جیسا بدکردار ناکارہ پتھر سینے سے لگا رہا ہوں۔ کاش مہرالنساء میری ہو جاتی۔'' سبطین شیرازی رو، رو کے اپنی قسمت کو کوستا تھا اور رابعہ شیرازی، مہرالنساء کا نام سن سن کر پاگل ہوتی رہتی تھی، اور پھر تین سال رابعہ شیرازی کی بدچلنی کا داغ سینے پہ سہہ کر سبطین شیرازی کو جب کوئی بھی راستہ نہ ملا تو اس نے ایک رات خاموشی سے گھر چھوڑ دیا تھا۔

اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے دکھ، اپنی چوٹیں بابا جان کو دکھاتا۔ اس نے صرف مہرالنساء کو سب دکھایا تھا اور جب وہ بھی پرائی ہو گئی تو اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ بے شک اس کے ماں، باپ اسے دوبارہ قبول بھی کر لیتے، مگر وہ ندامت اور پچھتاوے کا بوجھ لے کر سر اٹھا کے جی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ایک عجیب راہ فرار کا انتخاب کیا تھا جو سننے والوں کو حیران پریشان کر گیا تھا۔

یہ دھچکا بابا جان کے لئے کچھ کم نہیں تھا۔ وہ غصے کے بہت تیز تھے۔ وہ مشتعل ہو کر رابعہ شیرازی کو ''شیرازی ہاؤس'' سے نکال بھی سکتے تھے۔ مگر پوتے کا خیال کر کے انہوں نے رابعہ شیرازی کو بھی برداشت کر لیا تھا اور یہاں آ کر رابعہ شیرازی ایک بار پھر اپنے آپ کو ان پہ

حاوی سمجھنے لگی تھی، کیونکہ ان کے اکلوتے بیٹے کا اکلوتا وارث ان کی مٹھی میں تھا اور پھر اس نے عارفین کی ذات کو ہمیشہ کیش کیا تھا۔ شادی کے چار سال بعد مہر النساء دو بیٹیوں کے ہمراہ بیوگی کی چادر اوڑھے واپس حویلی آ گئی تھی۔ اس کے سسرال والوں کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اس لئے اس نے سسرال والوں کو چھوڑ دیا تھا۔

صرف ایک بابا جان تھے جو ہر دھچکے، ہر مصیبت، ہر دکھ کو دل پہ سہارتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے پوتے کی پرورش کی تھی۔ انہوں نے مہر النساء کو سنبھالا تھا۔ انہوں نے مہر النساء کی بیٹیوں کو سینے سے لگایا تھا اور سب سے بڑی بات کہ اپنی ذات کو کبھی بکھرنے نہیں دیا تھا۔ اتنا سب کچھ سہہ کر بھی ان کا حوصلہ بلند ہی رہتا تھا۔

❁......❁......❁

''کیسی ہو اروٰی؟'' وہ...... گھر میں داخل ہوئی تو جرار، امی اور بہروز بھائی کے پاس بیٹھا نظر آیا تھا۔ اروٰی کے تن بدن کو آگ چھو گئی تھی۔ وہ کتنی دیدہ دلیری سے اسے مخاطب کر رہا تھا۔ یہ سب اس کی بہن ثمینہ بھابی کے کرشمے تھے۔ حالانکہ اروٰی نے اسے اپنے گھر میں داخل ہونے سے منع کیا تھا۔

''لگتا ہے اروٰی کا موڈ آف ہے؟'' جرار بے تکلفی سے بولا تھا۔

''تھکی ہوئی آئی ہے، بیٹا اتنے کام کر کر کے موڈ خراب ہو ہی جاتا ہے، وہ اکیلی ہم سب کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں تو فیشن کرتے نہیں تھکتیں، وہ تو پھر ہمارے اور گھر کے چکروں میں پڑی رہتی ہے۔'' امی کو اس کی تھکن کا بہت احساس ہوتا تھا۔

''اروٰی کی شادی کے لئے بھی کچھ سوچا ہے یا نہیں؟''

''بس بیٹا کوئی اچھا سوالی آ گیا تو اللہ کا احسان مانوں گی۔''

''ہوں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' جرار آہستگی سے بولا تھا اور پھر چند دن بعد ہی اس نے اپنا پرپوزل بھیج دیا تھا۔ جس پہ گھر والے تو پرسکون تھے۔ مگر اروٰی اندر ہی اندر بھڑک گئی تھی اور اس نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر نا صرف جرار کے منہ پہ انکار کیا تھا، بلکہ اچھی خاصی عزت افزائی بھی کر دی ڈالی تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ عارفین اور اروٰی دونوں میڈیا کی زد میں آ گئے تھے اور آج دونوں کو خبر نہیں تھی کہ کون کہاں ہے؟

❁......❁......❁

صبح کا مکھڑا روشن ہو چکا تھا، سورج کی کرنیں صبح کے چہرے کا سنگھار بنی ہوئی تھیں اور اروٰی کے آنسو اس کے رخساروں پہ لکیر کی صورت نقش ہو چکے تھے۔ ساری رات اس نے ہسپتال کے بستر پہ جاگتے گزاری تھی۔ اس کی آنکھیں رتجگے اور آنسوؤں کے بوجھ سے بوجھل اور سوجی ہوئی تھیں، دل کے زخم، آنکھوں کے زخموں سے زیادہ گہرے اور دردناک تھے۔ اسے اپنوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کی غلطی، اس کا گناہ، اس کا قصور جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی، اتنی جلدی اس کے وجود سے آنکھیں چرائی تھیں کہ وہ ان کے آنکھ چرانے کا صدمہ ہی نہ سہہ پا رہی تھی...... اور اس کی آنکھیں بار بار جلتے ہوئے پانیوں سے لبریز ہوئی جا رہی تھیں۔

''بیٹا کس چیز کا دکھ رلا رہا ہے تمہیں؟ اپنوں نے بدل جانے کا؟ یا پھر اکیلے رہ جانے کا؟'' وہ خاتون اپنے آنسو پونچھ کر اس کے سر کو تھپکتے ہوئے بولی تھیں۔

''مجھے خود پتہ نہیں کہ مجھے کس کس چیز کا دکھ رلا رہا ہے؟ اپنا شوہر ہوتے ہوئے بھی اس کے نہ ہونے کا دکھ، اپنی ممتا پیاسی رہ جانے کا دکھ، اپنے گھر والوں کی طوطا چشمی کا دکھ، اپنے بھائی کے سفاک لفظوں کا دکھ، اپنی رسوائی کا دکھ، اپنی در بدری کا دکھ...... میرا دکھ کوئی ایک ہو تو میں بتاؤں نا؟ میں اتنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر ہوں...... میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے، میرا کوئی اپنا نہیں ہے، میرے رہنے کے لئے چھت نہیں ہے، میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے...... کیا کسی کو بھی میرا احساس نہیں؟ کسی کو میری اتنی بھی پروا نہیں کہ میں اکیلی کہاں جاؤں گی؟ کہاں رہوں گی؟ کیا کروں گی؟ کیا یہ ہی ہوتے ہیں اپنے؟'' وہ کہتے کہتے تڑپ تڑپ کر رونے لگی تھی اور وہ خاتون دوبارہ سے اسے سمجھانے اور بہلانے میں لگ گئی تھیں، وہ اسے تسلی دلاسہ دے رہی تھیں، ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ مگر اروٰی کا اتنی جلدی سنبھل جانا بھی آسان نہیں تھا۔

''تم میرے ساتھ چلو، مجھے اپنی ماں سمجھو، میں تمہیں کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچنے دوں گی، جو ہو گیا سو ہو گیا، حوصلہ کرو اب۔'' انہوں نے اروٰی کا سر کندھے سے لگا لیا تھا، اور پھر ڈاکٹرز کے ڈسچارج کرتے ہی انہوں نے رات بھر کے بل پے کئے اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا تھا۔

❁......❁......❁

''صاحب وہ کل شام آپ کی پی اے آئی تھیں آپ سے ملنے، شاید کوئی کام تھا، کافی پریشان لگ رہی تھیں۔'' عارفین ناشتہ کر رہا تھا، جب چوکیدار ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔

''کیا؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' عارفین یک دم پریشان ہوتے ہوئے

ناشتہ وہیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''صاحب کل شام آتے ہی آپ بیڈ روم میں چلے گئے تھے، اس لئے میں بتا نہیں سکا تھا۔''

''اوہ مائی گاڈ پتہ نہیں کس حال میں ہے وہ، اور کیا پریشانی تھی اسے؟'' وہ زیر لب بڑبڑاتا اپنا سیل فون اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ اروی کے نمبر پہ ٹرائی کیا جو مسلسل آف جا رہا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو عارفین؟ تم اس لڑکی کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہے ہو پورے میڈیا میں گندہ کر کے رکھ دیا ہے اس نے...... کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ دو حرف لعنت کے بھیجو اور فارغ کرو اسے۔'' رابعہ شیرازی سیڑھیاں اتر کر قریب آ گئی تھیں۔ عارفین نے پہلے ان کو، پھر زوئلہ کو دیکھا انداز جلا دینے والا تھا۔

''بہت جلد ایسا ہی کروں گا مام فکر مت کریں۔'' وہ دبے لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا اور رابعہ شیرازی کا دل خوش ہو گیا تھا۔ گویا عارفین کو اس رسوائی کے بعد عقل آ گئی تھی۔ وہ اروی سے رابطہ نہ ہونے کی صورت میں دل میں ایک فیصلہ کر کے اروی کے گھر پہنچ گیا تھا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' چھوٹے سے دروازے پہ دستک دے کر انتظار کرنے کھڑا ہوا تو اندر کی بے چینی بڑھنے لگی تھی اور اسی بے چینی کے دوران اسے سارہ کی صورت نظر آئی تھی۔

''ج...... آیئے۔'' وہ چاہ کر بھی اسے انکار کی ہمت نہیں کر پائی تھی اور فوراً پیچھے ہٹ کے اسے راستہ دیا تھا۔

''آپ یہاں؟'' ثمینہ بھابی اور بہروز بھائی، عارفین شیرازی کو دیکھ کر چونک گئے تھے اور پھر اگلے ہی پل بہروز بھائی کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے اور چہرے پہ ناگواری نظر آنے لگی تھی۔

''میں اروی سے ملنے اور آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔'' وہ ڈائریکٹ بہروز بھائی سے مخاطب ہوا تھا۔

''لیکن ہمیں آپ کی کوئی بات نہیں سننی، آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔'' بہروز بھائی کا میٹھا لہجہ آج بہت تلخ ہو رہا تھا۔ انداز میں بے مروتی اور بدلحاظی تھی۔

''میں اروی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' وہ سختی سے بولا تھا۔

''نہیں ہے وہ یہاں، اس کا گندہ ناپاک وجود اس قابل نہیں تھا کہ اسے اپنے پاس رکھا جائے۔ وہ غلیظ آپ کے ساتھ ہی اچھی لگ سکتی ہے، اس لئے اسے آپ کے پاس بھیج دیا

ہم نے...... نکال دیا ہے اس گھر سے...... دفع ہو گئی ہے وہ یہاں سے۔'' ثمینہ بھابی انتہائی حقارت سے بولی تھیں اور عارفین یک دم تڑپ اٹھا تھا۔

''کیا کہا؟ آپ نے اسے گھر سے نکال دیا؟ آپ نے اروی کو گھر سے نکال دیا؟''

وہ حیرت کے مارے پاگل ہونے لگا تھا۔

''ہاں ہاں ہم نے اسے نکال دیا ہے، وہ گند کی پوٹلی۔''

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ...... اپنی زبان کو لگام دیں، ورنہ زبان کھینچ لوں گا آپ کی۔'' وہ یکدم دھاڑ اٹھا تھا۔ آج اس کے صبر، اس کے برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ سب کا لحاظ اور مروت کرتا آ رہا تھا۔ مگر یہ دنیا بدلحاظی اور بے مروتی کی دنیا تھی۔ اس کے ساتھ اس جیسا بن کے رہنا پڑتا تھا۔

''اروی میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی غلط کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اسے گند کی پوٹلی کہنے والے ذرا یہ تو سوچ لیں کہ آپ خود کیا چیز ہیں؟ آپ کا بائیو ڈیٹا کیا ہے آخر؟ اونہہ ایک اوباش بھائی کے سوا اور ہے ہی کون آپ کا؟'' وہ پانچ سیکنڈ میں ثمینہ بھابی کی طبیعت صاف کر چکا تھا اور بہروز بھائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہکا بکا سے بیٹھے عارفین شیرازی کو دیکھ رہے تھے۔

''آپ لوگ اس لڑکی پہ الزام تراشی کر رہے ہیں، جس نے آپ لوگوں کی خاطر اپنا آپ تک بیچ ڈالا؟ آپ کے علاج کی خاطر کہاں کہاں نہیں پہنچی وہ؟ کس کس سے قرض کی بھیک نہیں مانگی اس نے؟ اپنی انا، اپنی عزت نفس، اپنا غرور بیچ کر آپ کا علاج کروایا ہے اس نے، اپنی ذات گروی رکھی تھی اس نے، اپنی ممتا، اپنی اولاد کا سودا کیا تھا اس نے، صرف آپ کی زندگی بچانے کے لئے اور اس خاتون کا سہاگ سلامت رکھنے کے لئے...... اس نے آپ کی ممتا کو دکھ کے عذاب سے بچا لیا۔ مگر اپنی ممتا کو جدائی کے امتحان میں ڈال دیا، صرف آپ لوگوں کی خاطر۔'' وہ کہتے کہتے ماں جی کی طرف پلٹا تھا۔

''آج تک اگر وہ اس گھر کا سہارا نہ بنتی تو کب کے آپ لوگ سڑک پہ آ چکے ہوتے، آپ کو بیوی بچوں سمیت در، در بھیک مانگنا پڑتی۔ اس وقت آپ لوگ مجبور تھے۔ آپ لوگوں کی آنکھوں پہ غربت کی پٹی بندھی ہوئی تھی، اس وقت وہ جھوٹ بھی بولتی تو آپ لوگوں کو سچ لگتا تھا اور آج جب آپ کو لگتا ہے آپ کا مشکل وقت نکل چکا ہے تو آج اس کا سچ بھی آپ کو

جھوٹ لگ رہا ہے؟ اس وقت آپ کی عزت اور غیرت کہاں تھی جب آپ کے گھر کی اک اک چیز بک رہی تھی، جب آپ کا گھر بھی بکنے ہی والا تھا، آپ کوڑی کوڑی کے محتاج تھے۔ تب کہاں تھی آپ کی عزت...... ہر جاننے والے سے، ہر محلے دار سے قرض مانگا تھا آپ نے، تب غیرت کہاں تھی آپ کی؟ آج اس لڑکی کے دامن پہ کسی نے جھوٹا الزام لگا دیا ہے تو آپ کی غیرت جاگ اٹھی ہے؟ ہونہہ آپ لوگوں کی خاطر رات رات بھر جاگتی تھی اور رات رات بھر روتی تھی، آپ لوگوں کے ذکر سے اس کا دن گزرتا تھا، وہ کہتی تھی میرا بھائی، میری ماں، میری بہنیں، میری بھابی...... میرے اپنے، لعنت بھیجتا ہوں ایسے اپنوں کی اپنائیت پہ...... میں سمجھتا تھا میرے گھر والے مفاد پرست اور خود غرض ہیں، مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ میری بیوی کے گھر والے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ صرف میری ماں ہی مطلب پرست نہیں یہاں تو ہر ماں مطلب پرست ہو چکی ہے۔'' اس نے ماں جی کو تلخی سے دیکھ کر سر جھٹکا تھا۔

''آج کل کے دور میں جو بھی اپنوں کے لئے کوئی قربانی دے گا، الٹا وہی اپنوں کا مجرم کہلائے گا۔ آج کے دور میں کسی کے ساتھ بھلا کرنا سب سے بڑا گناہ اور بے غیرتی ہے۔'' عارفین سالوں کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

''مجھے پتہ تھا اروی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوا ہوگا، اس لئے میں سارے پروف ساتھ لے کر آیا ہوں، یہ اروی کے اگیری منٹ پیپر ہیں اور یہ نکاح نامہ۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے رول کئے ہوئے کاغذات بہروز بھائی کی چارپائی پہ پھینک دیئے تھے۔

''اور آج کے بعد کسی نے بھی اس کی طرف انگلی اٹھائی تو میں ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گا۔ اور ہاں جاتے جاتے آپ کو اتنا بتا دوں آپ کا چہیتا بھائی اس وقت جیل میں ہے، اگر چھڑانے کی ہمت ہوئی تو چھڑا لیجئے گا، میں کل رات اس کا سارا بندوبست کر کے آیا تھا جو کام بہت پہلے ہونا چاہیے تھا وہ اب ہوا ہے۔ اللہ حافظ چلتا ہوں، مجھے اروی کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے، کیونکہ میرا بیٹا اپنی ماں کے بغیر رہ رہ کر نڈھال ہو گیا ہے۔'' وہ جاتے جاتے جان بوجھ کر بہت کچھ جتا گیا تھا، جہاں باقی سب دم بخود ششدر سے بیٹھے تھے وہیں ثمینہ بھابی تڑپ اٹھی تھیں کہ ان کا بھائی جیل میں تھا۔

مہر النساء کی گاڑی جیسے ہی حویلی میں داخل ہوئی تھی بابا جان پریشان سے قریب

آ گئے تھے۔

''بیٹا زیادہ پریشانی والی بات تھی تو مجھے بتا دیتیں، میں ہسپتال آ جاتا؟'' وہ اپنی دھن میں بات کرتے کرتے چپ ہو گئے تھے اور اروی گاڑی سے اترتے ہی ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے عارفین کے بابا جان کو چونک کر دیکھا تھا۔

''پریشان مت ہو بیٹا، یہ تمہارا اپنا گھر ہے، تم مالک ہو اس گھر کی۔'' مہر النساء نے مسکرا کر کہا تھا۔

''آپ...... آپ مہر النساء آنٹی ہیں؟'' اروی نے حیرت سے دیکھا تھا۔

''ہاں میں تمہاری اور عارفین کی مہر النساء آنٹی ہوں۔ میں کل شہر ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے گئی تھی اور اتفاق دیکھو کہ اللہ نے تم سے ملا دیا۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگائے اندر آ گئی تھیں۔

''دیکھو بیٹا یہ سارا کھیل رابعہ باجی کا رچایا ہوا کھیل ہے، مجھ سے اور میری بیٹیوں سے بھاگتے ہوئے انہوں نے کبھی ذرا دیر کے لئے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر سوتن ہی بننا ہوتا تو بہت پہلے میں ان کی سوتن بن چکی ہوتی اور آج سبطین شیرازی کی راجدھانی پہ راج کر رہی ہوتی۔ مگر میں کبھی سوتن بننے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایسے کام صرف وہ خود کر سکتی ہیں...... تم سے عارفین کا نکاح کروانے سے پہلے کاش وہ مجھ سے کچھ رابطہ کر لیتیں تو پھر میں ان کو بتاتی جو عورت خود کسی کی سوتن بننا پسند نہیں کرتی وہ اپنی بیٹی کو کسی کی سوتن کیسے بنا سکتی ہے؟ عارفین میری بیٹیوں کے لئے صرف ایک بھائی ہے اور ہمیشہ بھائی بن کے ہی رہے گا۔ صرف مجھ سے بھاگنے کے لئے انہوں نے نہ جانے کیسے کیسے کھیل کھیلے ہیں اور کیا کیا جال بچھائے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ خود اس جال میں پھنس چکی ہیں، ان کا کھیل ناکام ہو چکا ہے۔'' مہر النساء بہت ہی آرام اور تحمل سے بات کرتی تھیں اور اروی حیران بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

رابعہ شیرازی اس عورت سے بھاگ رہی تھیں جو خود اپنی ذات میں انجمن تھی، جس کے سکون پہ رشک آتا تھا۔

''مہر النساء کون ہے یہ لڑکی؟'' بابا جان کوئی کام نبٹا کر اندر آئے تو استفسار کر ہی لیا تھا۔

''آپ کے پوتے کی بیوی ہے یہ، آپ کی بہو ہے۔'' مہر النساء مسکرا رہی تھیں۔

''بہو؟'' وہ اچنبھے سے بولے تھے اور مہر النساء نے ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس بٹھا لیا تھا

اور رفتہ رفتہ عارفین کی داستان حیات سنانا شروع کر دی تھی، بابا جان کی آنکھیں کھلی جا رہی تھیں۔

آج رمضان کا پہلا دن شروع ہو رہا تھا اور ہر طرف رمضان المبارک کی تیاری اور خوشی کی گہما گہمی دیکھنے میں نظر آ رہی تھی۔ حویلی میں بھی تیاریاں عروج پہ تھیں۔ سبھی لوگ خوش تھے۔ مگر بابا جان چپ چپ سے پھر رہے تھے، جو کچھ ان پہ انکشاف ہوئے تھے وہ کچھ کم بھی تو نہیں تھے، سب کچھ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے قبول کرنے والا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ان کی خاموشی، ان کی سنجیدگی بجا تھی۔

"کیا بابا جان میرے وجود کو قبول کرنے کی وجہ سے پریشان۔"

"ارے نہیں بیٹا تم کو غلط فہمی ہو رہی ہے، میں بابا جان کی رگ رگ سے واقف ہوں، وہ تمہاری وجہ سے نہیں صرف عارفین کی وجہ سے پریشان ہیں کہ ماں کے ایسے خطرناک کھیل اور عزائم میں وہ کب تک پھنسا رہے گا؟ کیا کرے گا آخر؟" مہرالنساء نے اروی کا ہاتھ تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔

اروی کو حویلی آئے ہوئے آج چار دن ہو چکے تھے، لیکن ان لوگوں نے ابھی تک عارفین کو اروی کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ کیونکہ بابا جان یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ زندگی کے اس اہم اور حساس موڑ پہ آ کر عارفین خود کیا کرے گا؟ یا پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟ لہٰذا اب فیصلے اور انجام کی باگ عارفین کے ہاتھ میں تھی، اور عارفین کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ وہ بنا کسی چیلنج کے آزمایا جا رہا ہے، اس کے پیارے اسے پرکھ رہے ہیں۔

پورے گاؤں میں شام کے سائے ڈھلے جا رہے تھے اور پورا گاؤں شام کی لپیٹ میں آتا جا رہا تھا۔ آج سب کا پہلا روزہ تھا۔ سبھی گرمی، بھوک اور پیاس سے تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ جب اچانک حویلی میں عارفین کی گاڑی آ کے ٹھہری تھی۔

"عارفین؟" مہرالنساء آنٹی فوراً کرسی چھوڑ کے کھڑی ہو گئی تھیں۔ عارفین نے جھک کر سیٹ پہ سوئے ہوئے حانی کو اٹھایا اور آگے بڑھ آیا تھا۔

"غلامو بابا گاڑی سے میرا سامان نکال کے لے آؤ۔" اس نے اندر بڑھتے ہوئے آواز دی تھی اور اس کی آواز پہ حانی کسمسا کے رہ گیا تھا۔

"عارفین تم اس وقت، سب خیریت ہے نا؟" مہرالنساء آنٹی نے جلدی سے آگے

بڑھ کے حانی کو اٹھا کر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔

"جی خیریت ہے، بابا جان کہاں ہیں؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"اندر ہوں گے۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ ہی آ گئی تھیں۔

"عارفین میرا بچہ!" بی بی جان نے اسے دیکھتے ہی بازو پھیلا دیئے تھے۔

"السلام علیکم بابا جان۔" بی بی سے مل کر وہ ان کی طرف بڑھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" ان کا انداز لیا دیا تھا۔ عارفین نے انہیں چونک کر دیکھا، ان کے مزاج کی خفگی دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔

"یقیناً بابا جان کو بھی کہیں سے خبر ہو گئی ہو گی؟" وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گیا تھا۔

"بابا جان۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"جی کہیے برخوردار، ہم سن رہے ہیں، آپ فرمائیے کیا فرمانا ہے؟" لہجہ سنگین بے لچک اور دو ٹوک تھا۔

"میں نے آج وہ کام کیا ہے جو میرے بابا کو کرنا چاہیے تھا اور جو مجھے بھی بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا۔" عارفین کا سر جھکا ہوا تھا، انداز دھیما تھا، مگر لہجہ مضبوط اور پُرسکون تھا۔

"بتاؤ؟"

"بابا جان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں نے زونلہ کو طلاق دے دی ہے اور شیرازی ہاؤس اپنی ماں کے نام لکھ کر خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گھر کو چھوڑ دیا ہے۔ میری ماں ہمیشہ مجھے گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دے کر اموشنل بلیک میل کرتی تھیں۔ آج میں نے وہ کام کیا ہے کہ ان کو گھر بھی نہیں چھوڑنا پڑے گا اور میں بھی آزاد ہو جاؤں گا، اب وہ اس گھر میں رہیں یا پھر چھوڑ دیں یہ ان کی مرضی...... میں وہ گھر چھوڑ آیا ہوں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہاں آ گیا ہوں جہاں میرے بابا کو ہونا چاہیے تھا۔" عارفین کی بات پہ بابا جان کی آنکھوں میں چمک اتری تھی۔

"کیا یہ سب کر کے تم خوش ہو؟"

"ہاں میں خوش ہوں، کیونکہ اب میں صاف ستھری آزاد زندگی گزاروں گا لیکن بابا جان ابھی میں آپ کا مجرم ہوں، میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ میں نے اپنی ماں کے کہنے پہ آپ سے جھوٹ بولا تھا، آپ سے کچھ چھپایا تھا۔ جس کے لئے میں آپ سے شرمندہ ہوں، آپ پلیز

مجھے معاف کر دیں بابا جان، میں حالات اور واقعات کی وجہ سے مجبور تھا۔'' عارفین نے ان کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور بابا جان دیکھتے رہ گئے۔

ایک یہ عارفین کی شرمندگی تھی جو ہاتھ جوڑ کے معافی کی طلب گار تھی اور ایک اس کے باپ سبطین کی شرمندگی تھی جس نے نظر تک نہ ملائی اور ہمیشہ کے لئے منہ موڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور بابا جان کے خیال میں اس شرمندگی سے یہ شرمندگی بہتر تھی جو اپنے گناہ، اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ گویا کم حوصلہ انسان اگر اچھا کام نہیں کر سکتا تو پھر برا کام بھی نہ کرے۔

''بابا جان پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے دوبارہ کہا تھا اور بابا جان نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

''ارے بیٹا معافی کیسی؟ جتنے اچھے کام تم نے سرانجام دیئے ہیں اس کے لئے تو تم معافی کے نہیں انعام کے حق دار ہو۔ آج تم نے مرد بن کے دکھایا ہے، مردوں والا کام کیا ہے تم نے۔ دل خوش کر دیا ہے تم نے۔'' وہ اس کا کندھا تھپک کر بولے تھے۔

''انعام؟''

''ہاں بیٹا انعام...... ہم نے تمہارے لئے ایک لڑکی پسند کی ہے، بہت جلد ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔ ہماری بہت خواہش تھی کہ تم ہماری پسند سے شادی کرو اور یہ لڑکی ہماری پسند اور تمہارا انعام ہے۔''

''مگر بابا جان...... وہ...... وہ حانی کی ماں۔'' عارفین چکرا گیا تھا۔

''یہ حانی کی ماں ہی ہو گی بیٹا، ایک مکمل پرفیکٹ ماں...... ایک سگی ماں۔'' وہ اسے تسلی دے رہے تھے، لیکن عارفین کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ رابعہ شیرازی سے بچ کے نکلا تو بابا جان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

''ایم سوری میں کوئی شادی نہیں کر سکتا، میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔''

''دیکھو بیٹا سوچ لو۔''

''میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔''

''عارفین مان جاؤ یہ لڑکی بہت اچھی ہے، ہمیں بھی پسند ہے۔'' مہرالنساء نے بھی کہا تھا۔

''میں نہ مان سکتا۔''

''پلیز سر مان جائیں نا۔'' اروی کی دھیمی آواز پہ عارفین نے کرنٹ کھا کے دیکھا تھا، وہ بی بی جان کے پہلو میں بیٹھی دھیمے سے کہتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

''اروی تم...... تم یہاں؟'' وہ بے ساختہ تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے، میں یہاں نہیں آؤں گی تو اور کہاں جاؤں گی؟'' اس نے...... پرسکون اور پراعتماد لہجے میں کہا تھا۔

''مگر...... تمہیں یہاں کا پتہ؟''

''مجھے میری آنٹی لے کر آئی ہیں، آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟'' اروی نے خفگی سے کہا تھا اور عارفین نے حیرت سے مہرالنساء کی سمت دیکھا تھا۔

''باقی ساری تفصیل روزہ افطار کرنے کے بعد سن لینا، چلو اذان کا وقت بس ہوا ہی چاہتا ہے۔'' مہرالنساء نے سب کو فوراً اٹھنے کا حکم دیا تھا اور عارفین نے تو بمشکل افطار کیا تھا اور جلدی جلدی ساری تفصیل پوچھنے لگا تھا کہ اروی یہاں تک کیسے پہنچی؟

عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے بعد وہ حویلی آیا تو سب ہی اپنے اپنے کمروں میں بند آرام کرنے جا چکے تھے۔ اس لئے وہ بھی مزید کہیں ٹھہرے بغیر اپنے بیڈروم کی طرف آ گیا تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ اپنے بیڈروم کی جاتے ہوئے اس کے قدم سرشار، ریلیکس اور بہکے بہکے ہو رہے تھے۔ اس کی چال میں اپنی منزل، اپنی محبت، اپنا سکون پا لینے کا نشہ ہمک رہا تھا۔ دل کی خوشی انگ انگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں سرور سا چھا رہا تھا۔ آج اس کے دل سے اس کے دماغ سے، اس کی ذات سے کئی بوجھ ہٹ گئے تھے۔ آج وہ ایک فریش پرسنالٹی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے آ کر ذرا دیر کے لئے ٹھہر سا گیا تھا۔ اندر سے اروی کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنے جذبوں کا جہان آنکھوں میں آباد کئے اندر داخل ہوا تھا اور پہلی نظر کو ہی قرار آ گیا تھا۔ اروی بیڈ پہ کھیلتے حانی کے اوپر جھکی، اسے بار بار چوم رہی تھی اور وہ اروی کے چہرے کو چھو چھو کر خوش ہو رہا تھا۔ اس کی...... غوں غوں اور قلقاریاں پورے کمرے میں بکھری ہوئی تھیں۔

''کیا سارا پیار آج ہی کرنے کا ارادہ ہے؟'' وہ بھی آ کر حانی کی دوسری سائیڈ پہ

بیٹھ گیا تھا۔

"میں اسے ساری عمر پیار کروں تو میرا پیار ختم نہیں ہوگا میری جان، میرا حانی آئی لو یو سو مچ۔" وہ کہتے کہتے اسے بھینچ کر پھر سے چومنے لگی تھی اور وہ خوش ہو رہا تھا۔

"ایسا ہی اظہار تم مجھ سے نہیں کر سکتیں؟" عارفین نے اروی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے اروی کے ہاتھ بہت پسند تھے۔ وہ اکثر اس کی ہتھیلی پہ پیار کرتا تھا۔

"آپ کو میرے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟" اروی کا انداز خفا سا تھا۔

"اروی مجھے ہی تو تمہارے اظہار کی ضرورت ہے۔ مجھے آج تک کسی نے نہیں چاہا، میں سب کا مفاد بنا رہا ہوں...... تم...... صرف تم ہو جو مجھے چاہو گی اور میری خوشی کی انتہا نہیں رہے گی۔" عارفین کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ اروی بے ساختہ اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"اور پھر مجھے کون چاہے گا؟" اروی نے بھی محبت مانگ لی تھی۔ عارفین مسکرا اٹھا تھا۔

"تم خود ہی تو کہتی ہو سر دل کے حساب رہنے دیں یہ کبھی پورے نہیں ہوتے، دل کا کھاتہ اندھا ہوتا ہے کبھی بھرتا ہی نہیں ہے، چاہے حساب کتاب کے لئے کتنے ہی اوراق سیاہ ہو جائیں، اور آج میں بھی تمہیں یہ ہی کہوں گا کہ حساب دل رہنے دو...... بس محبت کو بغیر حساب کتاب کے چلنے دو۔ جتنی تمہیں میری چاہ ہوئی تم مجھے اتنا چاہ لینا اور جتنی مجھے تم سے محبت ہوئی، میں تمہیں اتنی محبت کر لوں گا، لیکن یار آج تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم سے میرا رشتہ پہلی نظر میں ہی بن گیا تھا اور اس رشتے کا نام محبت تھا۔ یہ مجھے آج معلوم ہو رہا ہے۔" وہ رفتہ رفتہ اسے اپنے قریب کرتا جا رہا تھا۔

"سر ایک بات کہوں آپ سے؟"

"کہو میری جان کیا کہنا ہے؟" وہ گھمبیر بوجھل لہجے میں بولا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی نشہ کر آیا ہو۔

"میں نے ابھی عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنی ہیں، آپ حانی کو سنبھالئے میں وضو کر لوں۔"

"ہائیں۔" عارفین یکدم تڑپ کے حواسوں میں لوٹ آیا تھا۔

"مگر اروی۔"

"سر میں نے صبح روزہ رکھنا ہے۔" وہ سختی سے گھور کر بولی تھی۔

"یار میرے پاس کچھ دیر اور بیٹھو پلیز میں تمہیں گڈ نیوز دیتا ہوں۔"

"کیسی گڈ نیوز؟"

"آج جب میں یہاں آ رہا تھا تب احمر انصاری نے مجھے کال کی تھی وہ تمہاری بہن سارہ کے لئے رشتہ لے کر جا رہے ہیں اور مجھے پوری امید ہے کہ اسے انکار نہیں ہوگا۔ سارہ اور احمر کی انگیج منٹ ہو جائے گی۔" عارفین نے اسے بات بتاتے بتاتے دوبارہ سے بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اروی کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی تھی۔

"مجھے ایسی گڈ نیوز سے کوئی سروکار نہیں ہے، سب کی اپنی اپنی زندگی ہے، جو جیسے چاہے جیسے ہماری بلا سے۔" وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔

"لیکن میں تو ویسے جینا چاہتا ہوں جیسے تم چاہو گی۔" وہ گستاخی پہ مائل تھا۔

"میں بھی ویسے ہی جینا چاہتی ہوں سر...... میرا سب کچھ بھی صرف آپ ہیں۔"

"یار یہ بار بار سر کیوں؟" وہ جھنجھلایا تھا۔

"تو پھر؟" وہ استفہامیہ دیکھنے لگی۔

"عارفین صرف عارفین...... البتہ اگر موڈ ہو تو ساتھ میں 'جانو' کا اضافہ بھی کر سکتی ہو۔" وہ شوخ ہو رہا تھا۔

"نہیں نہیں صرف عارفین ہی کافی ہے۔" وہ گھبرا کے بولی۔

"تو پھر کہو......"

"عارفین۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"جی میری جان۔"

"مجھے جانے دیجئے، میں نے وضو کرنا ہے۔"

"ہائیں، پھر وہی بات؟" وہ چپ ہو کے رہ گیا اور اروی بمشکل اپنا آپ چھڑا کر وضو کرنے چلی گئی اور وہ حانی کے ساتھ کھیلتا ہوا اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

رسم

"طلاق؟" کتنی ہی دیر سے اس کے دماغ میں اس ایک لفظ کی بازگشت ہو رہی تھی اور کتنی ہی دیر سے وہ کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ اس کے لب ہی خاموش نہیں ہوئے تھے وہ تو جیسے سر سے پاؤں تک خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ دوسری طرف سے طلاق کا مطالبہ بھی ہو سکتا ہے۔

"کیوں برخوردار خاموش کیوں ہو گئے؟" سید سراج حسین کی بارعب آواز پہ وہ یکدم چونک کر اس سنگین لفظ کے حصار سے باہر آیا تھا اور محض چند سیکنڈز میں ہی اپنے تمام تاثرات پہ قابو پاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یہ فیصلہ آپ کا ہے یا پھر میری زوجہ محترمہ کا؟" اس کا لہجہ دوبارہ سے پُرسکون اور ہموار ہو چکا تھا۔

"فیصلہ چاہے کسی کا بھی ہو تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔" وہ بھی کافی تحمل سے بولے تھے۔

"کیوں نہیں ہونا چاہئے مرشد سائیں؟ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔" اس نے لفظ "میری زندگی" پہ کافی زور دے کر کہا تھا۔

"یہ تمہاری زندگی کا ہی نہیں برخوردار ہماری عزت، غیرت اور رسم و رواج کا معاملہ بھی ہے، جو بقول تمہارے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، مگر تم یہ نہیں جانتے کہ ہمارے لئے ہماری عزت، غیرت اور رسم و رواج موت اور زندگی کی سی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے لئے ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" ایک پل کے لئے سید سراج حسین کی رنگت غصے کی آنچ سے سرخ پڑ گئی تھی۔

"مرشد سائیں آپ کو شاید میری بات سننے میں غلط فہمی ہوئی ہے، میں آپ کی عزت

و غیرت کو غیر اہم کہنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ البتہ آپ کے رسم و رواج کے خلاف میں کل بھی تھا اور آج بھی ہوں، آپ نہ جانے کب سے اس بے جا رسم پہ عمل کرتے ہوئے کتنی زندگیاں تباہ کر چکے ہیں اور کتنے دلوں کو برباد کیا ہے آپ لوگوں نے؟ لیکن ایک بات یاد رکھیں مرشد سائیں اس بار میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، میں اپنے دل سے وابستہ ایک دل کو عمر بھر کی تنہائی اور خاموشیاں نہیں سونپنے دوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" وہ کافی مضبوط اور سنجیدہ لہجے میں کہتا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"دیکھو لڑکے! آج سے کچھ عرصہ پہلے ایک فیصلہ تم نے کیا تھا اور اپنی بات منوائی تھی، لیکن ہم چپ رہے تھے۔ آج ایک فیصلہ ہم کر رہے ہیں اور اپنی بات منوائیں گے، لیکن تم صرف چپ رہو گے۔" وہ انتہائی دوٹوک اور غصیلے انداز میں بولے تھے، لیکن کسی سے مرعوب ہونے والا اور اپنے مقام سے پیچھے ہٹنے والا وہ بھی نہیں تھا، وہ اگر سید فرید حسین کے بیٹے تھے تو وہ بھی سلطان گردیزی کا اکلوتا لاڈلا پوتا تھا، اپنی وسیع جاگیر کا تنہا وارث!

"میں حق پہ تھا اور میں نے ایک جائز فیصلہ کیا تھا، جبکہ آپ سراسر ظلم کر رہے ہیں۔" وہ ان کی ہر بات، ہر فیصلے سے انکاری تھا۔

"اگر مظلوم خود کہہ دے کہ مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا تو پھر؟" سید سراج حسین فخریہ انداز میں سکون سے بولے تھے، لیکن وہ یکدم بُری طرح سے چونک گیا تھا، ایک پل میں اس کی سوچ کہاں سے کہاں چلی گئی تھی، مگر پھر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"کہنا کیا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے بغور ان کا چہرہ جانچا تھا۔

"جو تم بخوبی سمجھ چکے ہو۔" وہ ابھی بھی پُرسکون تھے۔

"لیکن میں طلاق پھر بھی نہیں دوں گا۔" اس نے سختی سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"دیکھو تم شاید بھول رہے ہو کہ اس وقت بھی تم نے یکطرفہ فیصلہ کیا تھا اور آج بھی تم یکطرفہ فیصلے پہ اڑے ہوئے ہو وہ تمہارے فیصلے میں نہ کل شامل تھی اور نہ آج ہو گی، تمہاری زبردستی کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔" انہوں نے اس کی ہمت توڑنے کی ایک بھرپور کوشش کی تھی، لیکن وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

"میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں، پھر آپ نے جو کہا میں وہی کروں گا، یہ میرا

آپ سے وعدہ ہے، ایک مرد کا وعدہ۔'' اس نے کافی سلیقے سے ان کو اپنی بات پہ لانا چاہا تھا۔

''تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟'' انہوں نے غصے سے کہا تھا۔

''جی میں جانتا ہوں کہ میں ''اپنی بیوی'' سے ملنے کی اجازت اس کے چچا حضور سے مانگ رہا ہوں۔'' اس نے بڑے احترام سے طنز کا تیر چھوڑا تھا۔

''اور اگر ہم اس چیز کی اجازت نہ دیں تو؟'' وہ صوفے پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے تھے انداز میں سختی تھی۔

''تو پھر دوبارہ کبھی طلاق کے لفظ کو سوچئے گا بھی مت!'' وہ ان کے لئے حد سے زیادہ ٹیڑھا ثابت ہو رہا تھا۔

''برخوردار ہم چاہتے ہیں کہ یہ معاملہ گھر کا ہے تو گھر میں ہی نبٹ جائے نہ تمہاری عزت بگڑے اور نہ ہمارا نام اُچھالا جائے، ورنہ کوٹ کچہری تک جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے ہمارے لئے۔'' انہوں نے اسے تقریباً دھمکی دی تھی جیسے کچھ باور کروانا چاہا ہو۔

''ٹھیک ہے مرشد سائیں آپ اگر کورٹ کچہری تک جانے کا شوق بھی پورا کرنا چاہتے ہیں تو یہی کر لیتے ہیں اب میں آپ کی طرف سے عدالتی کارروائی کا منتظر رہوں گا اور دیکھوں گا کہ عدالت اور شریعت کا مجرم کون ہے؟'' وہ ان کے منہ سے عدالت کا ذکر سن کر بہت خوش ہوا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی عدالت کا رخ نہیں کریں گے۔

''لیکن میں آپ سے پھر یہی کہوں گا کہ میں ایک بار روبرو اس سے ملنا چاہتا ہوں، پھر چاہے تو طلاق ہو جائے اور چاہے تو......'' وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا جبکہ سید سراج حسین شدید کشمکش کا شکار نظر آ رہے تھے، جیسے فیصلہ اور اس کا انجام سوچ رہے ہوں۔

''دیکھیے مرشد سائیں میں ایک مرد بچہ ہوں اور اللہ کے فضل و کرم سے عزت دار اور غیرت مند بھی ہوں، اپنا وعدہ، اپنی زبان نبھانا جانتا ہوں، آپ فکر نہ کریں، یکطرفہ فیصلہ اور کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔'' اس نے انہیں بھرپور یقین دہانی کروائی تھی اور وہ کچھ سوچتے ہوئے صوفے سے کھڑے ہو گئے تھے۔ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گئے ہوں۔

''ٹھیک ہے کل تم حویلی آ جانا۔'' وہ کہہ کر رکے نہیں تھے، بلکہ تیزی سے ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے تھے، جہاں ان کے سکیورٹی گارڈز الرٹ کھڑے تھے، جبکہ وہ ڈرائنگ روم کے

بیچوں بیچ گم سم کھڑا تھا، اس کی سوچ کہیں اور تھی، کیونکہ اس سارے قصے میں ایسا ''ایک نقطہ'' بھی تھا جو فراموش نہیں ہو سکتا تھا، مگر اسی نقطے پہ نہ انہوں نے بات کی تھی نہ ہی اس نے خود ذکر کیا تھا، حالانکہ سب سے اہم پوائنٹ وہی تھا اور اسی پہ بات نہیں ہوئی تھی۔

⊛......⊛......⊛

''شہر بانو! سنا ہے تمہاری شادی ہونے والی ہے؟'' سید سراج حسین کی بڑی بیٹی زہرا نے کافی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ نے سنا ہے تو ٹھیک ہی سنا ہوگا۔'' شہر بانو ابھی ابھی وضو کر کے آئی تھی اور نماز پڑھنے کے لئے سر پہ دوپٹہ لپیٹ رہی تھی، جب اس کی چچا زاد بہن اپنے چہرے پر ڈھیروں تجسس سجائے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی، لیکن شہر بانو نے کچھ خاص رسپانس نہیں دیا تھا، بس نارمل سے انداز میں جواب دے کر آگے بڑھ گئی تھی، لیکن زہرا واپس جانے کی بجائے وہیں بیٹھ کر اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی، اسے شہر بانو کی شادی کا سن کر بہت تجسس اور دلچسپی ہو رہی تھی کہ آخر شہر بانو کا کیا بنے گا، وہ کیا کرے گی؟ کیسے رہے گی عمر بھر اس طرح؟ کیونکہ اس شادی، اس رسم کو نبھانا تارک الدنیا ہو جانے کے برابر ہی تھا، ہر دنیاوی چیز کو چھوڑ دینا اتنا آسان کام نہیں تھا جیسے پھوپھو فاطمہ زندگی بسر کر رہی تھی، اسی طرح اب شہر بانو کو بھی زندگی گزارنا تھی۔

''کیا بات ہے زہرا آپی، آپ اس طرح کیوں بیٹھی ہیں؟'' زہرا کی سوچ کا تسلسل شہر بانو کی آواز سے ٹوٹا تھا، جو نماز پڑھ کر آ چکی تھی۔

''کچھ نہیں شہر بانو میں سوچ رہی تھی کہ تم کس طرح سب کچھ چھوڑ دو گی؟ دن رات عبادت میں کیسے گزارو گی؟ زندگی تو پورے گھر میں گزارنے کیلئے ہوتی ہے، گھر کے ایک کونے میں نہیں۔'' زہرا بے چاری سچ ہی تو کہہ رہی تھی، مگر اس رسم کو زندہ جاوید رکھنے والوں کو بھلا کون سمجھاتا؟

''اگر پھوپھی فاطمہ اپنے باپ اور بھائیوں کے لئے یہ سب کر رہی ہیں تو میں بھی کر لوں گی وہ بھی تو میرے جیسی اور میری ہم عمر ہی تھیں جب انہوں نے یہ شادی کی تھی۔'' وہ بے حد نرمی سے بولی تھی، جبکہ زہرا نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''اونہہ میں ہوتی تمہاری جگہ تو میں تو ایسا ہرگز نہ کرتی یہ بھی بھلا کوئی رسم ہے؟'' زہرا اپنے بڑوں کے خلاف تھی اور مزاج میں بھی خاصی تیز طرار تھی، لیکن شہر بانو سب لڑکیوں میں سے خاصی خاموش طبع، ڈھیلی ڈھالی سی نرم فطرت کی لڑکی تھی، کسی سے لڑنا جھگڑنا یا اپنے حق میں

بولنا اسے ہرگز نہیں آتا تھا، وہ کسی بھی ناانصافی اور زیادتی پہ بول ہی نہیں سکتی تھی، بڑوں کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اس کی نظر میں جیسا ہے، جو بھی ہے بس اچھا ہے۔ وہ کبھی کسی چیز پہ اعتراض نہیں کرتی تھی، کچھ لوگ اس کی اس فطرت کو اس کی ''ادا'' سمجھتے تھے، لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس کی خوبصورتی ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ جو بھی کہتی، جو بھی کرتی وہ اس کی ادا بن جاتا تھا۔

''شہر بانو انکار کر دو اس قسم کی شادی سے، صرف کلمے ہی تو پڑھنے ہیں اور پھر عمر بھر کے لئے ایک کوٹھڑی میں بیٹھ جانا ہے۔''

''نہیں زہرا آپی میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''لیکن یار میں ہوتی تو ضرور سوچ سکتی تھی۔''

''مجھ میں اور آپ میں فرق بھی تو بہت ہے، میں سید معراج حسین کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ شہر بانو، جس کے ماتھے پر صدقے کی لکیر ہے اور آپ سید سراج حسین کی سب سے بڑی صاحبزادی سیدہ زہرا بتول ہیں جس کے ماتھے پہ شادی کی لکیر ہے اور یہی لکیر ہمیں ایک دوسرے سے مختلف بناتی ہے۔'' وہ کافی سادگی سے بولی تھی۔

''لیکن شہر بانو......'' زہرا نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

''نہیں زہرا آپی ایسا کچھ نہیں ہو سکتا، میں جانتی ہوں آپ میرے لئے اچھا سوچ رہی ہیں، لیکن ساتھ میں یہ بھی تو ہے کہ میں اپنے باپ اور بھائیوں کے لئے اچھا سوچ رہی ہوں، میری ایسی زندگی بھلا کس کام کی جو میرے اپنوں کے کام نہ آئے، میں تو خوش قسمت ہوں جسے انہوں نے ''صدقہ'' بننے کا اعزاز دیا ہے۔''

شہر بانو نے نرم ملائم لہجے میں کہتے ہوئے زہرا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ سمجھنے والی نہیں تھی، اسی لئے اللہ نے اس کی مدد کے لئے مریم کو بھیج دیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی دونوں کزنز بڑے سنجیدہ موڈ میں لگ رہی ہو؟'' مریم نے مسکراتے ہوئے آ کر شہر بانو کو کہنی ماری تھی۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی باتیں کر رہے تھے۔'' اس نے بات کو ٹال دیا تھا، وہ ہر ایک کے سامنے اس شادی کے ذکر کو چھیڑ کر ان کے سوالوں کا نشانہ نہیں بن سکتی تھی، بلکہ وہ تو ہر ممکنہ طور پہ اس ذکر سے بچنے کی کوشش کرتی تھی۔

''لگتا ہے اس حویلی میں اللہ نے ایک یہی ''سعادت مند'' روح بھیجی ہے، جو سب

چاہتے ہیں وہی کرتی ہے۔'' زہرا نے شہر بانو کو دیکھ کر طنزیہ کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی، شہر بانو چپ کھڑی تھی۔

''اونہہ پاگل!'' وہ سر جھٹک کر چلی گئی تھی۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ بڑی اماں کا پیغام رساں آ گیا۔

''صاحب جی! بڑی اماں نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔'' ملازمہ نے مؤدب سے لہجے میں پیغام دیا تھا، لیکن اسے اس پیغام سے کافی حیرانی ہوئی تھی۔ بھلا اس وقت آدھی رات کو ایسا کون سا ضروری کام آن پڑا تھا کہ انہوں نے اسے اپنے کمرے میں فوری طلب کیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں ابھی آتا ہوں!'' اس نے اپنی حیرت کنٹرول کرتے ہوئے ملازمہ کو جانے کا اشارہ کیا تھا اور پھر جائے نماز سمیٹ کر بیڈ سے اپنی گرم چادر اٹھا کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے خود بھی باہر نکل آیا تھا۔ باہر پوری حویلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راہداری اور ہال کمرے کے تمام فانوس بجھے ہوئے تھے، البتہ نائٹ بلب ہر دیوار پہ روشن تھے، جن کی مدھم روشنی میں وہ مضبوط قدم اٹھاتا سیڑھیاں اتر آیا تھا۔ بڑی اماں کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے ٹیوب لائٹ کی روشنی ایک لکیر کی سی صورت باہر تک آ رہی تھی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' اس نے دستک دے کر اجازت چاہی تھی۔

''آ جاؤ میرے بچے آ جاؤ، اپنی دادی سے اجازت کیسی؟'' بڑی اماں اپنے جہازی سائز بیڈ پہ گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے تسبیح ہاتھ میں پکڑے نیم دراز بیٹھی تھیں، اس کی آواز سن کر اپنی کہنی کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم بڑی اماں آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی تشویش کا اظہار کیا تھا۔

''ہاں پتر میں بالکل ٹھیک ہوں تم یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' انہوں نے کمبل ہٹا کر اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی تھی۔ وہ سعادت مندی سے ان کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا، مگر چونکا وہ اس وقت جب اس کی نظر دائیں دیوار سے لگے صوفے کی سمت اٹھی تھی، جہاں اس وقت اس کے ابا سائیں اور اماں سائیں براجمان تھے اور کافی متفکر نظر آ رہے تھے۔

''خیریت تو ہے بڑی اماں آپ لوگ اس طرح کیوں بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی پریشانی

ہے کیا؟" اس نے گردن موڑ کر بڑی اماں کو دیکھا۔

"ہاں پتر سب خیر ہے، تم پریشان نہ ہو، یہ بتاؤ کیا کر رہے تھے؟ کہیں نیند سے تو نہیں جگا دیا رضیہ نے؟" بڑی اماں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں میں ابھی نماز پڑھ رہا تھا۔"

"اس وقت نماز؟ باجماعت کیوں نہیں پڑھی؟" بڑی اماں نے استفسار کیا تھا۔

"شہر سے واپس گاؤں آتے ہوئے دس بج گئے تھے راستے میں پتہ ہی نہیں چلا اس لئے مسجد نہیں جا سکا۔" اس نے وضاحت دی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟" پتہ نہیں کیوں وہ اس سے چھوٹے چھوٹے سوال کر رہی تھیں، جیسے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھ رہی ہوں۔

"جی نماز پڑھنے سے پہلے کھانا ہی کھایا تھا۔" اب اسے اندر ہی اندر الجھن سی ہونے لگی تھی کہ کیا مسئلہ ہے جو وہ لوگ رات کے اس پہر حل کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں، اس نے ایک نظر اپنے والدین کی سمت دیکھا جو خود کسی کشمکش کا شکار لگ رہے تھے۔

"لگتا ہے تم کچھ تھکے ہوئے ہو؟" بڑی اماں نے اپنے بہو اور بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوتے سے تقریباً چوتھا سوال کیا تھا، وہ خود کچھ الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ جیسے کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کشمکش میں ڈول رہی ہوں۔

"نہیں بڑی اماں ایسی کوئی بات نہیں، تھکن بھلا کیسی؟ آپ بتائیں، آپ نے شاید مجھے کسی کام سے بلایا تھا؟" بالآخر اس نے خود ہی پوچھ لیا تھا، کیونکہ وہ تو ٹال مٹول ہی کرتی نظر آ رہی تھی جیسے اسے بلا کر کچھ بتانے کا ارادہ بدل گیا ہو۔

"ہاں پتر بہت دنوں سے میں تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی، مگر کبھی تم دیر سے گھر آتے تھے اور کبھی شہر ہی رک جاتے تھے، اسی لئے سوچا آج بات کر ہی لوں۔" بڑی اماں بات کرتے کرتے ایک بار پھر وقفہ لینے کے لئے رک گئیں، کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ ان کا لاڈلہ، چہیتا پوتا جتنا سعادت مند، سمجھدار اور اچھا ہے اتنا ہی ضدی اور بااصول بھی ہے، غلط بات تو برداشت ہی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی کسی کی حق تلفی ہوتے دیکھ سکتا تھا، چاہے وہ حق تلفی اس کے اپنے گھر میں اس کے ملازموں کے ساتھ ہو رہی ہوتی تھی وہ ان کے حق میں بھی بول اٹھتا تھا۔

"جی کہیے بڑی اماں میں سن رہا ہوں۔" وہ ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"دیکھو بیٹا میں نے تمہارے پیدا ہونے سے پہلے ایک منت مانی تھی اور اب اس منت کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے، لیکن یہ منت تب تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک تم میرا ساتھ نہ دو۔ اس لئے میں چاہ رہی تھی کہ پہلے تم کو بتا دوں اور تم سے پوچھ لوں۔" انہوں نے کچھ متذبذب سے انداز میں کہا تھا اور وہ اپنی سی بات پہ حیران ہوا تھا۔

"ارے بڑی اماں آپ کی منت میں بھلا میں کیا کہوں گا؟ آپ پوری کر دیں اپنی منت۔" وہ بہت ریلیکس انداز میں بولا تھا۔

"نہیں بیٹا میری منت میں پوری نہیں کر سکتی، میری منت تو تم نے پوری کرنی ہے۔" وہ آہستگی سے بول رہی تھیں اور ان کے چہرے پر چھائی پریشانی اور عاجزی نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ کوئی گمبھیر مسئلہ ہے اور یہ لوگ مجھ سے کہہ نہیں پا رہے۔

"ابا سائیں آپ بتائیں کیا مسئلہ ہے، کیسی منت پوری کروانی ہے بڑی اماں نے؟" اس نے اپنے والد محترم زمان گردیزی کو استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور زمان گردیزی اپنی والدہ محترمہ کو دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"ہارون بیٹا میں تمہیں ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں، لیکن تمہارا کام ہے اسے غور سے سننا اور گہرائی سے سمجھنا، کیونکہ اگر تم گہرائی میں جا کر نہیں سوچو گے تو پھر تم اپنی دادی، اپنی ماں اور اپنے خاندان کے احساسات نہیں سمجھ سکو گے جو تمہارے پیدا ہونے سے پہلے تھے۔" انہوں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے بات شروع کرنے سے پہلے ذرا سی تمہید باندھی۔

"جی میں سن بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی رہا ہوں آپ بات شروع کریں۔" اس نے انہیں تسلی دلائی۔

"تمہارے دادا جان سلطان گردیزی کے صرف دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، رحمان گردیزی، زمان گردیزی اور رابعہ گردیزی۔ تمہارے دادا جان سلطان گردیزی کی جاگیرداری اور سیاست کے میدان میں اپنی ایک ساکھ تھی ان کا اپنے گاؤں میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے علاقے میں بھی اچھا خاصا دبدبہ اور ایک نام تھا، وہ بہت بااصول، انصاف پسند اور نرم دل انسان تھے، اپنی زندگی اور جاگیرداری سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ انہوں نے جدی پشتی حکمرانی کی بنا پر کبھی کوئی محرومی یا کمی نہیں دیکھی تھی، یہی چیز ان کو مطمئن رکھتی تھی، لیکن ان کا یہ اطمینان اور خوشی اس وقت رخصت ہو گئے تھے جب انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کی شادیاں کی تھیں، لیکن

شادیوں کے سات سال بعد بھی انہیں اپنی حویلی میں کسی بچے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

دونوں بیٹے اولاد کے لئے ترس رہے تھے، رحمان گردیزی کے ہاں تو سات سال سے کوئی بچہ ہوا ہی نہیں تھا، جبکہ زمان گردیزی کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن وہ چار، پانچ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ پائے تھے اور بچوں کی پیدائش کے چار، پانچ دن بعد کا یہ صدمہ پوری حویلی کو توڑ کے رکھ دیتا تھا۔ سلطان گردیزی اور بڑی اماں (دادی) کے دلوں میں پوتے، پوتی کی خواہش کسی روگ کی طرح چمٹی ہوئی تھی جو ان کو اندر ہی اندر ترسا رہا تھا، لاشعوری طور پر حویلی کے ہر فرد کو بچے کی خواہش نے گھیر رکھا تھا۔ رحمان گردیزی اور ان کی بیوی بھی بچے کی آواز کو ترس رہے تھے، سلطان گردیزی اور بڑی اماں کو بھی ایک وارث کی شدید خواہش تھی ارمان تھا، اور زمان گردیزی بھی اپنے ہونے والے بچوں کے لیے زندگی کی دعا مانگتے تھے، اور یہ دعاؤں کا ہی اثر تھا کہ اللہ نے ایک بار پھر امید کی کرن دکھا دی اور سبھی اپنی اپنی جگہ منتیں اور مرادیں ماننے لگے تھے کہ اللہ ہمارے ہونے والے بچے کو زندگی دے اور ہماری دُعائیں قبول فرمائے۔

سلطان گردیزی نے اپنی چھوٹی بہو کی پریگننسی کی خبر سنتے ہی صدقہ اور خیرات دینا شروع کر دیا تھا، کئی پیروں، فقیروں کے پاس گئے، کئی دیگیں چڑھائی تھیں اور کتنے ہی نوافل پڑھ ڈالے تھے، اسی طرح بڑی اماں بھی کبھی کسی ملنگ سے دعا کروانے چلی جاتیں، کبھی کسی مزار پہ دھاگے سے گرہ باندھ آتیں اور یہی سب کرتے کرتے ایک روز وہ اپنے مرشد سائیں پیر فرید حسین کے پاس جا پہنچیں جو اپنے باپ، دادا کے سجادہ نشین تھے اور مزار کے ساتھ بنے حجرے میں تشریف فرما ہوتے تھے، جہاں وہ اپنے مریدوں کے دکھ، پریشانیاں اور مسئلے مسائل سنتے تھے اور ان کا حل بتاتے تھے، ان کے لئے دعا کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر تعویذ وغیرہ بھی لکھ دیتے تھے، بڑی اماں اتنے لوگوں کے رش میں اپنی باری کا انتظار کرتی رہیں اور جب باری آئی تب شام ہو چکی تھی، بڑی اماں نے کچھ کہنے کے لئے اپنی مشکل اپنا دکھ بتانے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا تھا۔

''بی بی تمہیں ایک وارث چاہیے جو تمہاری نسل کو آگے بڑھا سکے اور تمہارے خاندان کا نام سلامت رکھے۔'' انہوں نے بڑی اماں کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی اور بڑی اماں کا عقیدہ پل میں پختہ ہو گیا تھا، وہ ان کے سامنے شدت سے رو پڑی تھیں۔

''مرشد سائیں میری جھولی بھر دو، میری مراد اللہ سے پوری کرا دو، میں آ

آپ کی غلام بن جاؤں گی، آپ جو کہیں گے وہی کروں گی، آپ جو کہو گے وہی چڑھاوا دوں گی۔'' پیر فرید حسین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ مسکرائے تھے ان کے پرشفقت نورانی چہرے پہ عجیب سا تاثر تھا، کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ کبھی کبھی چڑھاوا دینا اور منتیں، مرادیں پوری کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

''نیک بی بی سوچ لو ایک بار۔'' انہوں نے بڑی اماں کو سوچنے کی مہلت دی، مگر وہ مہلت لینے پر راضی نہیں تھیں۔

''آپ جو بھی کہہ دیں گے میرے لئے وہ پتھر پہ لکیر ہوگا، آپ سے منکر نہیں ہو سکتی۔'' بڑی اماں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

''نیک بی بی ہمارے خاندان میں صدیوں سے یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ ہر لڑی (ہر نسل) میں سب سے بڑا بیٹا سجادہ نشین ہوتا ہے اور اس سجادہ نشین کی بیٹی کو صدقہ کیا جاتا ہے، اس کے باپ اور بھائیوں کا صدقہ۔ یعنی اس کا نکاح کر کے ایک دن کے لئے دلہن بنا کر رخصت کیا جاتا ہے اور پھر شادی کے دوسرے روز ہی اسے واپس گھر لے آتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، پھر وہ بیٹی تمام عمر عبادت میں گزار دیتی ہے، دنیاوی کاموں سے دور ہٹ جاتی ہے اور دینوی کاموں کو اپنا لیتی ہے، اس کے شوہر کا، اس کے باپ، دادا اور بہن، بھائیوں کا اس پہ کوئی حق اور اختیار نہیں رہتا، وہ بس اللہ کی راہ پہ لگ جاتی ہے، کیونکہ وہ صدقہ کر دی جاتی ہے۔ ہماری لڑی میں ہماری بیٹی صدقہ کی گئی تھی جو آج تک عبادت میں وقت گزار رہی ہے اور اب ہمارے بیٹوں میں سے معراج حسین کی بیٹی صدقہ کی جائے گی جس کا نکاح تمہارے خاندان میں ہوگا اور نکاح کے دوسرے روز ہی ہماری بیٹی ہمارے گھر آ جائے گی۔'' انہوں نے تفصیل سے بتایا تھا۔

''ہمارے خاندان میں؟ کس کے ساتھ مرشد سائیں؟'' بڑی اماں کو حیرت ہوئی تھی۔

''تمہارے ہونے والے پوتے کے ساتھ، اور تم یہ منت مان چکی ہو تم یہ چڑھاوا ضرور دو گی، ہمارے بڑے بیٹے کی صاحبزادی کا نکاح تمہارے پوتے سے ہوگا، ہاں ایک بات اور بتا دیں کہ تمہارا پوتا کبھی ہماری صاحبزادی کو طلاق نہیں دے گا اور نہ ہی کبھی اس پہ اپنا حق جتائے گا، نہ شادی کے دن، نہ باقی ساری زندگی، البتہ وہ جہاں چاہے اپنی دوسری شادی کر سکتا ہے، ہماری طرف سے کوئی پابندی یا رکاوٹ نہیں ہوگی، بس تمہارا چڑھاوا یہی ہوگا کہ ہماری بیٹی ہماری عزت تمہارے پوتے سے منسوب رہے گی اور ساری زندگی آپ لوگوں سے کچھ طلب

نہیں کیا جائیگا۔'' وہ بڑی اماں کو اس رسم کو ہر اونچ نیچ سے آگاہ کر رہے تھے، بڑی اماں جو متفکر سی لگ رہی تھیں ان کی باتوں سے کچھ پرسکون سی ہوگئی تھیں۔

''لیکن مرشد سائیں یہ رسم، یہ منت کب پوری کرنی ہوگی؟'' وہ آہستگی سے بولیں۔

''جب ہمارے بچے جوان ہو جائیں گے، ابھی تو نہ تمہارا پوتا پیدا ہوا ہے اور نہ ہمارے بیٹے کی صاحبزادی، لیکن ہماری اس رسم میں یہ رشتہ پیدا ہونے سے پہلے ہی طے کیا جاتا ہے جو آج ہم نے کر دیا ہے، بس دعائے خیر کرنی ہے۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور بڑی اماں واپس گھر آگئیں۔

''اور پھر اس منت کے بعد تم پیدا ہوئے اور تمہارے پیدا ہونے کے بعد لالہ سائیں (رحمان گردیزی) کے ہاں بھی دو بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں، تم جان سکتے ہو کہ اس کے بعد بڑی اماں کا یا پھر ہمارے خاندان کا مرشد سائیں پہ کتنا پکا عقیدہ ہو چکا ہوگا اور وہ منت پوری کرنا بھی ہمارے لئے لازم ہو گیا تھا، لیکن ان کے بیٹے سید معراج حسین کے تین صاحبزادے تھے، اس لئے آٹھ سال تک یہ رسم ڈانوا ڈول سی رہی تھی، مگر جب تم آٹھ سال کے ہوئے تو ان کے ہاں صاحبزادی کی پیدائش ہوئی اور تمہارے لئے مانی جانے والی منت پکی ہوگئی تھی۔ لہٰذا رسم کے مطابق سید معراج حسین اور پیر فرید حسین چاہتے تھے کہ شادی تب ہو جب لڑکی بیس سال کی ہو جائے۔ تو بیٹا تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم ہماری اور اپنی بڑی اماں کی مجبوری سمجھ سکو، کیونکہ وہ لوگ چند دنوں تک نکاح کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی صرف ایک دن کے لئے۔'' زمان گردیزی نے تفصیل سے ساری بات بتانے کے بعد پلٹ کر ہارون کو دیکھا۔ جوان کی تفصیلی بات سننے کے بعد ششدر سا بیٹھا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے ان سب سے۔

''ہارون ہم تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں بیٹا؟'' انہوں نے دوبارہ اسے متوجہ کیا تھا، بڑی اماں متفکر سی بیٹھی تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اور دعا مانگ رہی تھیں کہ ان کا پوتا ان کی لاج رکھ لے۔

''ہارون......'' زمان گردیزی نے قریب آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور یکدم اس شاک سے باہر آیا تھا۔

''ایم سوری ابا سائیں میں آپ کی ایسی کوئی منت نہیں پوری کر سکتا، میں یہ نکاح نہیں کروں گا، ایک لڑکی کو اپنی عزت، اپنی غیرت بنانے کے بعد اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتا؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا انداز دوٹوک تھا۔ بے لچک اور بے مروت۔

''یہ کیا کہہ رہو بیٹا؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں آپ لوگ انہیں انکار کر دیں، وہ اس کام کے لئے کسی اور کو ڈھونڈ لیں میری طرف سے انکار ہے۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا، بڑی اماں کا بوڑھا چہرہ پریشانی سے پیلا پڑ گیا تھا، زمان گردیزی اور ان کی بیوی بھی چپ رہ گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی وہ شہر کے لئے روانہ ہو گیا تھا اور زمان گردیزی اس سے دوبارہ بات کرنے کا سوچتے رہ گئے تھے۔

''ہارون سے بات کی آپ لوگوں نے؟ کیا کہتا ہے وہ؟'' صبح ناشتے کی میز پہ لالہ سائیں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''ہاں کی تھی، لیکن وہ ماننے کو تیار نہیں ہے۔'' وہ بیٹے کی ضد کو جانتے تھے، تبھی آہستگی سے بولے تھے۔

''اماں سائیں کیا کہتی ہیں؟'' انہوں نے دوسری پارٹی کا پوچھا، لہجہ کچھ متبسم تھا، شاید انہیں پہلے سے ہی پتہ تھا کہ ہارون نہیں مانے گا۔

''وہ رات سے بہت پریشان ہیں اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہی ہیں، اپنے مرنے کی دعائیں کر رہی ہیں کہ وہ اپنے مرشد سائیں کو کیا منہ دکھائیں گی؟'' زمان گردیزی یوں بات کر رہے تھے جیسے بڑی اماں کے وہی مجرم ہوں۔

''ہمیں تو ہارون کے بچپن سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ یہ شادی نہیں کرے گا۔ اولاد کے طور طریقے اور تیور دیکھ کر ہی اس کے مزاج کا پتہ چل جاتا ہے زمان گردیزی۔ بیٹا تو وہ تمہارا ہے لیکن سمجھتے اسے ہم ہیں۔ تم فکر نہ کرو وہ مان جائے گا ہم اسے سمجھائیں گے۔'' انہوں نے اطمینان سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

''مجھے بس اماں سائیں کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ کہ وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔ یہ منت بھی تو انہوں نے ہمارے لئے ہی مانی تھی نا۔''

''ارے ٹھیک ہے، بس تم پریشان نہ ہو اماں سائیں کو بھی تسلی دو اور مرشد سائیں سے کہہ دو ہم اس شادی کے لئے تیار ہیں اور وہ دن بتا دیں تا کہ ہم دلہن کے لئے کچھ سامان خرید لیں۔''

''مگر لالہ سائیں؟''

''بس زمان گردیزی ہم نے کہہ جو دیا ہے ہارون کو ہم سنبھال لیں گے۔'' وہ کندھا تھپک کر وہاں سے چلے گئے تھے، انہوں نے اپنے مزارعوں کے ساتھ آج زمینوں پہ جانا تھا، جہاں منجھی (چاول کی فصل) بونے کا کام ہو رہا تھا، زمان گردیزی لالہ سائیں کو دیکھتے رہ گئے اور یہ سچ تھا کہ دونوں تایا بھتیجے میں کافی انڈرسٹینڈنگ تھی، دونوں کے خیالات ملتے تھے اور دونوں کی گپ شپ ہمیشہ دوستوں کی طرح ہوتی تھی۔

''کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟'' رحمان گردیزی نے اس کے آفس روم کے دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب کی تھی اور ہارون گردیزی اس وقت ایک بہت اہم فائل پہ کافی مصروف سے انداز میں کام کر رہا تھا، ان کی آواز سن کر یکدم احترام سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔''

''چچا سائیں اندر آئیں، آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں۔''

وہ اپنی فائل چھوڑ کر سیٹ سے اٹھ آیا تھا اور قریب آ کر رحمان گردیزی کو آگے بڑھنے کو کہا۔

رشتے اور عمر کے لحاظ سے وہ اس کے تایا ابا تھے، لیکن وہ ہمیشہ سے ان کو چچا سائیں کہہ کے بلاتا تھا۔

''بیٹھئے چچا سائیں آج مجھ سے ملنے کا خیال کیسے آ گیا؟'' وہ صوفے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کافی دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہارون گردیزی نہ تم معصوم بچے ہو اور نہ ہم۔ ایک ماہ سے گھر پہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں، مگر تم روز آج اور کل پہ ٹالے جا رہے تھے، ہم نے تو آخر آنا ہی تھا، کیونکہ تم سے کام ہمیں تھا، تمہیں تو نہیں۔'' وہ ہارون پر چوٹ کرتے ہوئے بولے تھے، وہ سچ مچ شرمندہ ہو کے رہ گیا تھا۔

''ایم سوری چچا سائیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی، دراصل یہاں کام ہی کچھ اتنا زیادہ تھا کہ گاؤں جانے کا ٹائم ہی نہیں ملا، انشاء اللہ چار، پانچ روز تک چکر لگاؤں گا۔'' اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

''اب تمہیں چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اب ہم جو یہاں آ گئے ہیں۔'' وہ دلچسپی سے بولے تھے۔

''یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ اور سنائیں بڑی اماں اور باقی سب کیسے ہیں؟ رابعہ پھوپھو سے ملاقات ہوئی آپ کی؟'' اس نے سب کی خیریت پوچھی، حالانکہ روز حویلی فون کر

کے گاؤں کی خیر خبر لیتا رہا تھا۔

''سب سے ملاقات ہو جائے گی پہلے تم سے تو ہو جائے...... اور بڑی اماں کا تو تمہیں پتہ ہے انہیں آج کل کیا روگ لگا ہوا ہے؟'' رحمان گردیزی کی یہ بہت اچھی عادت تھی کہ وہ بڑی سے بڑی بات بھی بہت ریلیکس انداز میں کہہ جاتے تھے اور بہت نرمی سے بات منوا بھی لیتے تھے اور انہیں اپنا یہ اکلوتا بھتیجا اپنے بیٹے کی طرح عزیز تھا، وہ اسے ایک باپ کی طرح ہی چاہتے تھے۔ ہارون بڑی اماں کے متعلق سن کر چپ سا ہو گیا تھا، کیونکہ وہ ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا، ان کی منت بہت کڑی منت تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو تم؟''

''کچھ نہیں چچا سائیں۔''

''کچھ تو سوچا ہے تم نے؟''

''ہاں، مگر جو میں نے سوچا ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔

''تم پیر فرید حسین کی اس رسم کے تاریک پہلو پہ غور کر رہے ہو، اسے روشن کرنے کا سوچ رہے ہو تو بیان کیوں نہیں کر سکتے؟'' رحمان گردیزی کی بات پہ ہارون کے یکدم کرنٹ کھا کے ان کی سمت دیکھا تھا، ان کا چہرہ وہی کچھ بیان کر رہا تھا جو ہارون دل میں سوچ رہا تھا۔

''چچا سائیں آپ بھی وہی سوچتے ہیں جو میں؟'' وہ بے یقین سا ہونے لگا تھا۔

''تم باقی سب چھوڑو یہ بتاؤ کہ اپنی بڑی اماں کی منت پوری کرو گے یا نہیں؟ ہم آج اسی لئے آئے ہیں، آج تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا۔'' وہ اپنے تاثرات غائب کرتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔ ہارون نے پانچ منٹ سوچا ہر پہلو پہ ایک بار پھر غور کیا اور پھر رضامندی دے دی تھی۔

''ٹھیک ہے میں اس شادی کے لئے تیار ہوں، آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا اور جو میں کہوں گا وہ آپ کو بھی کرنا ہو گا۔'' اس نے ہامی بھر لی اور رحمان گردیزی مسکرا دیئے تھے۔

آج شہر بانو کی مہندی اور تیل کی رسم تھی، وہ لوگ یہ ایک دن کی شادی بھی تمام رسموں اور پورے اہتمام کے ساتھ کرتے تھے اپنے طور پہ وہ بیٹی کا ہر حق ادا کرتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح قربانی کے جانور کا حق ادا کیا جاتا تھا اور پھر قربانی کے دن دھوم دھام سے اسے ذبح کر کے قربان کر دیا جاتا تھا اور آج اس قربانی کے لئے شہر بانو کو تیار کیا جا رہا تھا، بس

فرق یہ تھا کہ وہ جانوروں کی قربانی ہوتی تھی وہ بھی اللہ کی راہ میں اور اللہ کی رضا پہ ہوتی تھی، جبکہ یہ انسانوں کی قربانی تھی اور وہ بھی صرف بیٹیوں کی جو باپ اور بھائی کے لئے قربانی ہو جاتی تھیں، ہر نسل میں ایک بیٹی اس رسم کی بھینٹ چڑھا دی جاتی تھی اور اب باری شہر بانو کی تھی جو تین بھائیوں سے چھوٹی اور اکلوتی بہن تھی، لیکن پھر بھی اس کی ماں اسے اس رسم سے نہیں بچا سکتی تھی، کیونکہ صدیوں سے اور کئی نسلوں سے چلی آنے والی یہ رسم تو آخر نبھانا ہی تھی، حالانکہ ان کا اپنی نازک پھولوں سی بیٹی کے لئے بہت دل تڑپتا تھا کہ وہ جیتے جی دنیا سے کٹ کے رہ جائے گی! یہی سوچیں اور یہی دکھ آج کل ان کو نڈھال کئے رکھتا تھا وہ بہت چپ چپ سی رہتی تھیں۔

''تائی اماں آپ یہاں بیٹھی ہیں؟ چلیں آپ کو سب نیچے بلا رہے ہیں، شہر بانو کو مہندی لگنے والی ہے۔'' مریم نے ان کے کمرے میں آتے ہی پیغام دیا تھا۔ لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہیں۔

''تائی اماں چلیں نا سب کو دیر ہو رہی ہے۔'' مریم نے مزید کہتے ہوئے ان کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا اور وہ گم سم افسردہ سی اٹھ کر اس کے ساتھ آ گئیں جہاں نازک، گداز سرخ گلابوں سی شہر بانو زرد لباس میں اپنی تمام تر پاکیزگی اور سادگی کے ساتھ چہرہ جھکائے بیٹھی تھی اور سبھی اس کی ماں کے انتظار میں بیٹھے تھے، کیونکہ بیٹی کو تیل اور مہندی لگانے کا آغاز انہوں نے ہی کرنا تھا۔

''آئیے بھر جائی شہر بانو کو مہندی لگائیے اتنا ٹائم ہو رہا ہے۔'' ان کی دیورانی سید سراج حسین کی بیوی نے انہیں آگے بڑھنے کا کہا، لیکن ان کے دل پہ کیا گزر رہی تھی، کوئی کیسے جان سکتا تھا، ان کا بس چلتا تو وہ یہ رسم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتیں، مگر بس چلتا تب نا! انہوں نے آگے بڑھ کے کھڑے کھڑے بیٹی کو مہندی اور تیل لگایا اور پلٹ کر واپس چلی گئیں۔ بعد میں کیا کچھ ہوتا رہا انہیں کوئی خبر نہیں تھی، وہ سر درد کا کہہ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔

''شہر بانو تمہیں کوئی دکھ تو نہیں اندر سے؟ کیا اس رسم پہ اداس ہو؟'' مومنہ پھوپھو کی بیٹی فروا نے کافی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''فروا بی بی شہر بانو تو اللہ کی گائے ہے اسے بھلا کوئی دکھ یا اداسی کیوں ہونے لگی؟ وہ سب کی خوشی میں خوش رہتی ہے، ہاں دکھ یا اداسی تو ہمیں ہوتی تھی، اگر اس کی بجائے ہمارا نکاح ہو رہا ہوتا۔ صرف نام نہاد نکاح۔'' زہرا نے ہنستے ہوئے طنز کیا تھا۔ اسے شہر بانو کی چپ رہنے کی عادت پہ کافی غصہ آتا تھا، وہ چاہتی تھی کہ شہر بانو اپنے حق میں آواز اٹھائے، وہ ان پڑھ لڑکیوں کی طرح اس فرسودہ رسم کی بھینٹ نہ چڑھے، مگر شہر بانو اس قسم کی گستاخی یا سرکشی

کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی، اس نے کبھی بھی زہرا کی گفتگو کو دل پہ نہیں لیا تھا۔

''کاش کہ یہ صدقہ کی رسم تم پہ آئی ہوتی!'' مریم نے زہرا کو چھیڑا تھا۔

''قسم سے یار میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ کاش شہر بانو کی جگہ میں ہوتی اور پھر سب کو بتاتی کہ ایک انسان کو صدقہ کیسے کیا جاتا ہے؟ اونہہ عقل ٹھکانے لگا دیتی سب کی!'' زہرا نے بے بسی سے مٹھی بھینچ کر کہا تھا اور اس کے انداز پہ سب ہنس پڑی تھیں، لیکن شہر بانو ابھی بھی خاموش بیٹھی تھی، حالانکہ اس کی بڑی پھوپھو کی بیٹیاں فروا، اور اقراء اس کے ہاتھوں پہ مہندی لگانے اور مذاق کرنے میں مشغول تھیں، پھر بھی اس کا دھیان نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا ہوا تھا۔

''فروا یہاں ہتھیلی پہ شہر بانو کے شوہر کا نام بھی لکھ دو۔'' زہرا نے پھر مداخلت کی۔

''کیا نام ہے ان کا؟'' فروا نے پوچھا۔

''ہارون گردیزی!'' شہر بانو نے یکدم فروا کے ہاتھ سے اپنی ہتھیلی کھینچ لی تھی، مبادا وہ سچ مچ ہی اس کا نام نہ لکھ ڈالے۔

''ہاتھ کیوں کھینچ لیا شہر بانو؟ اسی کا نام لکھنے کا کہا ہے نا جس کے نام تم اپنی پوری زندگی لکھنے جا رہی ہو؟''

''پلیز آپی مجھے ڈسٹرب نہ کریں میرے ساتھ جو ہو رہا ہے ہونے دیں، اگر ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا جا رہا تو اس کا خیال ہمارے ماں، باپ اور بڑوں کو کرنا چاہئے ہمیں نہیں، کیونکہ جن کو بن کہے کوئی احساس نہیں ہوتا انہیں ہمارے کہنے پہ بھی کوئی احساس نہیں ہوگا، مجھے میرے بابا اور بھائیوں نے ہمیشہ بہت پیار دیا ہے لاڈلہ بنا کے رکھا ہے میری ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں تو آج اگر میں ان کے لئے قربان ہو جاؤں گی تو کوئی نقصان کی بات نہیں ہوگی، بلکہ میرے لئے تو فخر ہے کہ میں اپنے بھائیوں اور بابا کا صدقہ بن رہی ہوں ان کے نام پر سے واری جا رہی ہوں۔ اتنی چاہتوں کے بدلے یہ کام تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور زہرا کو سمجھانا چاہا تھا جو ہمیشہ ہی شہر بانو کی بات نہیں سمجھتی تھی۔

اور پھر نکاح کا دن بھی آ گیا۔ شادی کا جوڑا پورے اہتمام کے ساتھ اس کے سسرال سے آیا تھا بڑی اماں نے بہوؤں سے کہہ کر ہر چیز بہت شوق اور بڑے چاؤ کے ساتھ خریدی تھی اپنی طرف سے ہر شگن پورا کیا تھا، رابعہ گردیزی بھی اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ شریک ہوئی تھیں حویلی کے سبھی افراد اس رسم میں شامل ہونے جا رہے تھے...... سید معراج حسین کی

طرف سے بہت سے لوگ اس شادی میں شریک ہوئے تھے اور سبھی لوگ اس شادی کی نوعیت کو جانتے تھے کہ یہ ایک رسم کی تحت ہو رہی ہے، اسی لئے ماحول بھی کچھ رسمی سا تھا۔

ہارون نے بس اپنے چند ایک جاننے والوں کو اور دو، تین دوستوں کو ہی انوائیٹ کیا ہوا تھا، مغرب کے بعد ان کا نکاح ہوا، پھر کھانا وغیرہ کھایا گیا اور ایک دو رسم ادا کی گئی تھیں تب جا کر رخصتی کا وقت آیا۔ باقی سب تو شہر بانو کے گلے لگ کے بہت نارمل سے انداز میں ملی تھیں کہ کل صبح شہر بانو نے دوبارہ گھر جو آ جانا ہے، لیکن شہر بانو کی ماں، بیٹی کو گلے لگا کر بہت شدت سے روئی تھیں، کیونکہ صرف انہی کو تو احساس تھا کہ ان کی بیٹی قربان ہو گئی ہے بے شک اس نے کل صبح سلامت واپس گھر آ جانا تھا، لیکن ساتھ یہ دکھ بھی تو تھا کہ وہ پوری دنیا سے کٹ...... جائے گی۔ ہارون کی بڑی اماں نے آگے بڑھ کر ان کو الگ کیا اور بہوؤں کو اشارہ کیا کہ وہ شہر بانو کو گاڑی میں بٹھائیں۔

''مرشد سائیں ہمیں اب اجازت دیں۔'' بڑی اماں نے احترام سے کہا، البتہ ان کے لہجے میں بے پناہ خوشی تھی کہ انہوں نے اپنی منت پوری کر لی ہے۔

''اجازت ہے بڑی اماں ہماری امانت آپ کے حوالے ہے۔'' سید معراج بھی جواباً کافی ادب سے بولے تھے اور ان کی بات پہ ہارون نہ جانے کیوں نظریں پھیر کر دوسری سمت دیکھنے لگا جہاں اس وقت تمام سیدزادیاں کھڑی اپنی لاڈلی صاحبزادی کی رخصتی کا منظر دیکھ رہی تھیں زہرا، مریم، فروا اور سکینہ وغیرہ نے ہارون گردیزی کو دیکھتے ہی اس کی شاندار پرسنالٹی کو خوب سراہا تھا، بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس اپنے چچا سائیں کے ہمراہ کھڑا اس وقت، نہ جانے کیا بات کر رہا تھا، وہ بھی اسے دیکھتی رہ گئیں، یہاں تک کہ ماں جی نے بھی اپنے داماد کو دل ہی دل میں بے حد سراہا تھا، مگر کیا فائدہ اس سب کا؟ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بلیک مرسڈیز میں بیٹھا اور دلہن کے ساتھ روانہ ہو گیا تھا۔

''ہارون یہ کہاں جا رہے ہو تم؟'' وہ اپنے کوٹ کے بٹن کھول کر اسے بازو پہ ڈالتا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، جب زینی آپا کی آواز نے اچانک اس کے قدم روک دیے تھے، اس نے سیڑھیوں پہ کھڑے کھڑے گردن موڑ کر ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑی زینی آپا کو تعجب بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

''اپنے بیڈروم میں اور کہاں؟'' اس نے کافی لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

''کیا؟ بیڈروم میں؟ مگر تم بھلا بیڈروم میں کیسے جا سکتے ہو؟ وہاں تو'' وہ کہتے کہتے یکدم خاموش سی ہو گئیں اور گھبراہٹ ان کے پورے چہرے سے جھلکنے لگی تھی، کیونکہ انہیں احساس ہو چکا تھا کہ وہ شہر بانو کو ہارون کے بیڈروم میں بٹھا کر کتنی بڑی اور کتنی سنگین غلطی کر چکی ہیں۔

''وہاں کون ہے؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بنا تھا۔

''وہ......وہ شہر بانو!'' زینی آپا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہارون کو کیسے ہینڈل کریں۔

''کون شہر بانو؟'' اس نے پھر سوال کیا تھا۔

''وہ جس کے ساتھ آج تمہاری شادی ہوئی ہے۔'' زینی آپا کو مجبوراً کہنا ہی پڑا تھا کیونکہ اور کوئی جواب بھی تو نہیں تھا اور انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔

''جس کے ساتھ آج میری شادی ہوئی ہے، پھر وہ تو میری 'بیوی' ہوئی نا؟ میری منکوحہ! اس لحاظ سے میرا اپنے بیڈروم میں جانا کوئی غلط بات تو نہیں ہے، آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں؟'' وہ پلٹ کر سیڑھیاں اتر آیا تھا۔

''لیکن ہارون تم نہیں جا سکتے اس کا اختیار نہیں ہے۔''

''عجیب بات ہے زینی آپا؟ گھر میرا ہے، بیڈروم میرا ہے، بیوی میری ہے، اور مجھے ہی اختیار نہیں ہے؟ یہ بھلا کس کتاب میں لکھا ہے؟'' اس نے کافی خفگی اور حیرانی کا اظہار کیا تھا۔

''ہارون تم جانتے تو ہو یہ شادی ایک رسم ادا کرنے کے لئے ہوئی ہے، یہ ویسا رشتہ نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو، تمہارا شہر بانو پہ کوئی حق نہیں ہے، وہ اپنے باپ، دادا کی رسم کے مطابق صدقہ کی گئی ہے۔'' زینی آپا کے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا ہارون کو سمجھانا، کیونکہ وہ ان کی ہر بات ہر جواز میں نقص نکال رہا تھا اور اپنی دلیلیں دے رہا تھا۔

''ایک انسان کی قربانی، ایک انسانی صدقہ تو اللہ تعالیٰ نے بھی نہیں لیا جو بڑی اماں کے مرشد سائیں لے رہے ہیں، اگر ایسا ممکن ہوتا تو سب سے پہلے انسان کی قربانی کی صورت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام قربان ہوتے اور پھر ہر سال ہر انسان کو اپنے پیارے اللہ کی راہ میں قربان کرنا پڑتے، کچھ سوچیے زینی آپا پیر فرید حسین کی خاندان میں یہ رسم نہیں ظلم ہو رہا ہے اور میں یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا میں نے یہ شادی اسی لئے کی ہے کہ ان کی اس رسم کو مٹایا جا سکے، سو پلیز ہیلپ می، میں اپنے بیڈروم میں جا رہا ہوں، گڈ نائٹ کل ملاقات ہو گی۔'' وہ نرمی

سے کہتا زینی آپا کا کندھا تھپک کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا، لیکن زینی آپا کا دل نہیں مان رہا تھا، انہوں نے جا کر بڑی اماں اور چچا سائیں زمان گردیزی کے سروں پہ بم پھوڑ دیا تھا، بڑی اماں نے تو دو ہتڑ سے اپنا سینہ پیٹ لیا تھا، جبکہ زمان گردیزی اور ان کی بیوی اپنی اپنی جگہ پہ ساکت سے ہو گئے تھے کہ اب کیا ہوگا؟ البتہ رحمان گردیزی نے ذرا کم ہی نوٹس لیا تھا۔

❁......❁......❁

ہارون گردیزی کی تایا زاد بہن زینی آپا اسے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اس بیڈ روم میں چھوڑ کر گئی تھیں، لیکن اسے نہیں پتہ تھا کہ یہ بیڈ روم کس کا ہے، اسی لئے اس بیڈ روم کو تھوڑی دیر کے لئے اپنی آرام گاہ سمجھ کر دن بھر کی اکڑی ہوئی کمر کو ریلیکس کرنے کی غرض سے ذرا سی نیم دراز ہوگئی تھی اور زینی آپا کا انتظار کرنے لگی جو اسے تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر گئی تھیں، لیکن پھر آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی نہیں آئی تھی، اب شہر بانو کو اپنے بناؤ سنگھار سے کوفت سی ہونے لگی، تبھی وہ زینی آپا کا انتظار کرتے کرتے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ابھی وہ آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پہ رکھی تصویر کی سمت اٹھ گئی تھی اس نے ہارون گردیزی کو ٹھیک طرح سے دیکھا تو نہیں تھا، مگر رخصتی کے دوران ایک سرسری سی نظر تو اس پہ پڑی ہی تھی اسی لئے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ تصویر ہارون گردیزی کی ہے! اور بے ساختہ ہی وہ اس خوبصورت فریم میں سجی ہارون گردیزی کی متاثر کن پرسنالٹی کو دیکھے گئی، اور ساتھ یہ بھی احساس ہوگیا کہ یہ کمرہ ہارون گردیزی کا ہی ہے۔

وہ شہر بانو کو رخصت کرا کے حویلی لے جانے کی بجائے اپنے شہر والے گھر میں لے کر آیا تھا، البتہ حویلی جانے کے لئے اس کے کیا ارادے تھے، ابھی کچھ پتہ نہیں تھا شہر بانو نے کھڑے کھڑے پورے کمرے کا جائزہ لے ڈالا تھا، اس دروان وہ چلتی ہوئی کمرے کے بیچوں بیچ آ کھڑی ہوئی تھی کہ اچانک ہی ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ بھی کھل گیا تھا۔ آنے والے کے قدموں کی آہٹ اُبھری تھی، شہر بانو نے گھبرا کر رخ موڑ لیا تھا، کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ اندر آنے والا مرد ہے عورت نہیں! تقریباً تین یا چار سیکنڈ کے وقفے کے بعد دروازہ دوبارہ بند ہوگیا تھا۔

”السلام علیکم!“ ہارون نے اپنا کوٹ بیڈ پہ ڈالتے ہوئے اپنی نئی نویلی اجنبی دلہن کو سلام کیا جو اس کی سمت پشت کئے کھڑی تھی۔

”آ......آپ کون؟“ وہ گھبرائی ہوئی بولی تھی۔

”جس سے آپ کی ساری زندگی منسوب ہو چکی ہے۔“ وہ سکون سے کہتا اپنی گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ رہا تھا۔

”مگر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ بے شک شہر بانو بہت نازک اور خاموش طبع تھی، مگر ایسی حرکت برداشت نہیں کر سکتی تھی ذرا ترشی سے بولی تھی۔

”اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“ اس نے اپنا والٹ اور موبائل نکال کر وہ بھی سائیڈ پہ ڈال دیئے تھے، شہر بانو اس کے سوال پہ ٹھٹک گئی تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی اسے اپنا دفاع کرنا تھا۔

”میں یہاں مہمان ہوں۔“ وہ مضبوطی سے بولی تھی۔

”حالانکہ میں آپ کو مالک سمجھ رہا ہوں، کیونکہ یہ گھر آپ کا ہے، یہ کمرہ آپ کا ہے اور سب سے بڑی بات کہ میں بھی آپ کا ہوں پھر آپ مہمان کیسے ہوگئیں؟“ وہ دلچسپی سے کہتا عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، جہاں شہر بانو کا رنگ فق ہوا تھا، وہیں ہارون گردیزی کی نگاہیں بھی ایسی دلکشی پہ اپنی ذات بھلا بیٹھی تھیں، کتنے ہی لمحے ہارون کی نظروں کی نذر ہو گئے تھے، لیکن شہر بانو کی بدحواسی نے یکدم اس کی یہ سحرزدہ سی کیفیت خاک میں ملا ڈالی تھی، وہ تیزی سے پلٹ کر دروازے کی سمت لپکی تھی اور اسی تیزی سے ہینڈل گھما کر لاک کھولنے کی ناکام کوشش کی تھی، کیونکہ وہ لاک کے ساتھ ساتھ بولٹ بھی چڑھا آیا تھا۔

”یہ بھاگنے دوڑنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک بار آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لیں۔“ ہارون نے قریب آتے ہوئے کہا تھا، شہر بانو ڈری سہمی کھڑی تھی، اس کے قریب آنے سے تھوڑی اور دور ہٹ گئی۔

”میں آپ کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ آپ یہاں سے چلے جائیں یا مجھے جانے دیں۔“ شہر بانو نے بہت سی ہمت مجتمع کر کے جواب دیا تھا، ورنہ تو اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے، پورا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور دودھیا پیشانی پہ پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے، دل کی دھڑکنیں اسی طرح دھڑ دھڑا رہی تھیں جیسے کوئی دروازے پہ دستک دے رہا ہو! اور یہ دستک ذرا فاصلے پہ کھڑے ہارون گردیزی کو بھی با آسانی محسوس ہو رہی تھی۔

”آپ میری بات نہیں سننا چاہتیں تو کوئی بات نہیں، لیکن یہاں سے چلے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ہم دونوں نے اب یہاں ہی رہنا ہے آج بھی، کل بھی اور آئندہ

ساری زندگی بھی، وہ اس لئے کہ میں آپ کو ایک دن کے لئے نہیں اپنی پوری زندگی کے لئے اپنی ہمسفر بنا کے لایا ہوں، اب میں اچھا ہوں یا بُرا ہوں آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتیں اور آپ اچھی ہیں یا بری میں بھی آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، بے شک میں آپ کو جانتا نہیں تھا میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی آپ کو چاہا تھا، لیکن مجھے امید ہے کہ میں آپ کو جاننے لگا، دیکھنے لگا تو پھر چاہنے بھی لگوں گا، بہت جلد مجھے آپ سے محبت بھی ہو جائے گی۔ کیونکہ محبت کے آثار تو مجھے ابھی سے نظر آنے لگے ہیں، میرا دل محبت پہ مائل سا لگ رہا ہے۔'' وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی دلکشی سے کہتا اپنے پورے استحقاق سے شہر بانو کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر چکا تھا، ہارون گردیزی کی قربت کی تپش سے شہر بانو کا جسم ہی نہیں روح بھی جل اٹھی تھی، وہ اسے اپنے مضبوط بازو کے حلقے میں لے کر بیڈ تک لے آیا تھا۔

''پلیز ہارون؟'' ہارون نے جیسے ہی اس کی چوڑیاں اتاریں وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔

''جیولری تو آپ نے اتارنی ہی ہے ابھی یا تھوڑی دیر بعد۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''آپ میری اجازت اور میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔'' وہ یکدم اپنا ہاتھ چھڑا کر دور ہٹ گئی تھی۔

''میں بہت چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہ کروں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ آج زبردستی کئے بغیر گزارا نہیں ہوگا، کیونکہ آپ میرے حق میں نظر نہیں آ رہیں۔'' وہ بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپ میرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے، کیونکہ میرا آپ سے ہمیشہ کا رشتہ نہیں ہے۔'' وہ سختی سے بولی، اس نے بڑی ہمت سے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔

''اوکے فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارا رشتہ ہمیشہ کا نہیں لیکن ایک رات کے لئے تو ہے نا؟'' اس نے شہر بانو کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کافی ذو معنی لہجے میں کہا تھا۔

''لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں۔'' شہر بانو نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ ہارون نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر خاموش کرا دیا۔

''دیکھئے محترمہ شہر بانو میں اس وقت آپ کی سب باتیں سن بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی رہا ہوں، مجھے آپ کی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو رہا ہے، لیکن اس کے باوجود میں آپ کو ایک بات سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ میں کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اور نہ ہی اپنا ''حق'' تلف ہونے دیتا

ہوں۔ لہٰذا آپ یہ بھول جائیں کہ میں آپ کو پرائی امانت، کسی کا صدقہ یا پھر شجر ممنوعہ سمجھ کر چھوڑ دوں گا، آپ پر میرا پورا پورا حق ہے اور میں اپنا ہر حق وصول کروں گا چاہے زبردستی کرنا پڑے، چاہے آپ کی رضا سے، کیونکہ آپ ہر طرح سے مجھ پہ حلال ہو چکی ہیں۔'' وہ بہت ہی نپے تلے الفاظ میں کہتا شہر بانو کو بہت کچھ باور کروا چکا تھا، وہ اپنی جگہ پہ جوں کی توں کھڑی رہ گئی اور وہ اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا کر کپڑے چینج کرنے چلا گیا تھا، واپس آیا تو وہ ابھی تک وہیں کی وہیں تھی، اس نے زیرو پاور کا بلب جلا کر بیڈ روم کی تمام لائٹس آف کر ڈالی تھیں اور شہر بانو کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس لے آیا تھا۔

''ایم سوری شہر بانو میں اس طرح کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن جس طرح ایک پرندے کو اپنے پاس رکھنے کے لئے اس کے پر کاٹنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے لئے بھی یہ سب بہت ضروری ہے، میں تمہیں سرتا پا اپنی ذات، اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں، تاکہ تمہاری واپسی کے سارے راستے بند ہو جائیں۔'' ہارون اس کی ساری جیولری اتار چکا تھا اور شہر بانو کے آنسو بے اختیار ہو گئے تھے، اس نے ہر ممکن طریقے سے ہارون کو باز رکھنے کی کوشش کی تھی کتنی بار ٹوٹے پھوٹے سے بے ربط الفاظ میں اسے روکنا چاہا تھا مگر وہ جو ٹھان چکا تھا اس سے باز کیسے آ جاتا؟ شہر بانو کی سسکیاں اس کے مضبوط کشادہ سینے میں دب کے رہ گئی تھیں اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی تھی، اس کی مضبوط گرفت کے سامنے۔

۞......۞......۞

وہ تو اپنی من مانی کر چکا تھا، لیکن صبح پوری حویلی میں جیسے صف ماتم بچھی ہوئی تھی، بڑی اماں کا بی پی ہائی ہو چکا تھا، زمان گردیزی غصے کی حالت میں تھے، جبکہ اماں سائیں، زینی آپا، رابعہ پھوپھو اور تائی اماں چپ چپ اور خفا خفا سی دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا آج ناشتہ نہیں ملے گا؟'' اس نے زینی آپا کو دیکھ کر کہا، شاید وہ ہارون سے کچھ کہتیں، لیکن ابا سائیں (رحمان گردیزی) کے اشارے پہ خاموشی سے ہارون کے لئے ناشتہ لینے چلی گئیں۔

''کیسی طبیعت ہے صاحبزادے؟'' رحمان گردیزی نے اخبار پھیلاتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''آپ کی دعائیں ہیں چچا سائیں!'' وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"اور ہماری بہو کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے!" اس نے شرارت بھرے انداز میں کہہ کر اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کی، لیکن چچا سائیں اس کی یہ شرارت یہ سرشاری بھانپ چکے تھے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"میں اسے زینی آپا اور تائی ماں کے ساتھ گاؤں بھیج رہا ہوں۔" زینی آپا ناشتہ رکھ کے گئیں تو اس نے اپنی بات شروع کی۔

"اور تم خود؟ میں بعد میں چلا جاؤں گا۔" وہ ناشتے کے دوران باتیں بھی کر رہے تھے۔

"مرشد سائیں سے کیا کہو گے؟ تھوڑی دیر تک تو وہ لوگ شہر بانو کو لینے کے لئے آتے ہوں گے؟"

"بس آپ میرے حق میں دعا کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔" دونوں چچا، بھتیجا ہی بہت ریلیکس تھے، جیسے انہیں کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے، پھر تم ان لوگوں کو بھیجنے کی تیاری کرو، ہم تب تک اماں سائیں کی خیریت معلوم کرتے ہیں۔" وہ اخبار سمیت کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اتنے میں ہارون بھی ناشتہ کر چکا تھا۔

"زینی آپا۔" اس نے ڈرائنگ روم کی سمت جاتی زینی آپا کو آواز دی جو عمر میں ہارون سے پورا ایک سال چھوٹی تھیں، لیکن ہارون اور باقی کزنز ان کے سگھڑاپے، بردباری اور مزاج کی وجہ سے انہیں زینی آپا کہتے تھے، ورنہ کزنز میں سب سے بڑا ہارون ہی تھا۔

"جی فرمایئے؟" وہ خفگی کا اظہار کر رہی تھیں۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو محترمہ شہر بانو کو بھی ناشتہ کروا دیجئے، کیونکہ میرے خیال میں انہوں نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔"

وہ بڑے سکون سے کہتا نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور زینی آپا کو یکدم شہر بانو کا خیال آتے ہی اپنی کوتاہی کا دوبارہ سے احساس ہوا تھا، ایک غلطی انہوں نے رات کو کی تھی، اسے ہارون کے بیڈ روم میں چھوڑ کر اور ایک غلطی ابھی ابھی کی تھی کہ صبح سے اس کی کوئی خیر خبر ہی نہ لی تھی، ہارون سے خفگی کا اظہار کرتے کرتے وہ شہر بانو کو ہی بھول بیٹھی تھیں جو اس گھر میں بالکل انجان تھی، ناسمجھ اور اکیلی تھی۔

"ہائے میں مرجاواں۔" وہ اپنے سر پہ ہاتھ مارتی فوراً سیڑھیوں کی سمت بھاگی تھیں

اور ہارون ان کی یہ بوکھلاہٹ دیکھتا رہ گیا تھا۔ زینی آپا ادھ کھلے دروازے کو دھکیلتی ہوئیں عجلت میں اندر آئی تھیں۔

"شہر بانو...... شہر بانو تم ٹھیک تو ہو؟" انہوں نے شہر بانو کو کسی بت کی طرح بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہوئے دیکھا تو مزید گھبرا گئیں۔

"شہر بانو بولو نا کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟" زینی آپا نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا چہرہ تھپکا تو ان کی سوچ کی محویت ٹوٹ گئی اور وہ اگلے ہی پل زینی آپا کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

"شہر بانو اپنے آپ کو سنبھالو تمہاری قسمت میں ہارون کا ساتھ شاید اسی طرح لکھا تھا، ورنہ تمہاری شادی کہیں اور بھی تو ہو سکتی تھی۔" وہ شہر بانو کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے، فراڈ کیا ہے آپ کے گھر والوں نے اور آپ کے بھائی نے۔" وہ روتے روتے ان سے الگ ہو گئی تھی۔

"تم شاید یقین نہیں کرو گی شہر بانو گھر والوں کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، یہ فیصلہ سراسر ہارون کا اپنا فیصلہ تھا، بڑی اماں، چچا سائیں، اور چچی اماں کو تو پتہ بھی نہیں تھا وہ تو رات کو میں نے جا کر بتایا تھا کہ ہارون اپنا ارادہ، اپنی نیت بدل چکا ہے، ورنہ کل تک تو وہ بالکل نارمل تھا بڑی اماں کے فیصلے پہ راضی تھا اچانک پتہ نہیں کیسے اور کیوں یہ سب سوچ لیا؟" زینی آپا نے سب کی طرف سے صفائی پیش کی تھی۔

"بہت برا ہوا ہے یہ سب ابا سائیں اور چچا سائیں کبھی معاف نہیں کریں گے آپ لوگوں کو۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی، زینی آپا جز بز سی ہو رہی تھیں کہ اس سے بھلا اور کیا کہیں۔

"السلام علیکم!" اچانک دروازے پر دستک کے بعد جانی پہچانی سی آواز ابھری تھی۔

"زہرا آپی!" شہر بانو بے تابی سے پکاری اور بیڈ سے اٹھ کر ان کے گلے لگ گئی، زہرا کے پیچھے چچی بیگم بھی تھیں۔ (زہرا کی والدہ سید سراج حسین کی بیوی)

"آرام سے شہر بانو آرام سے، اس طرح پاگل کیوں ہو رہی ہو ابھی رات کو ہی تو ملے تھے ہم۔" زہرا نے اسے مسکرا کر اپنے سے الگ کیا تھا، لیکن اس کے کھلے سیاہ گھنے...... نم بال، دھلا دھلایا سا سراپا، سرخ روئی روئی سی آنکھیں اور اس کے جسم سے اٹھتی کسی اور جسم کی مہک نے چونکا کے رکھ دیا تھا، زینی آپا ان سے کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی تھیں۔

''شہر بانو یہ سب؟'' زہرہ کا اشارہ اس کے سراپے اس کی حالت کی طرف تھا۔

''ہارون گردیزی نے دھوکہ کیا ہے ہمارے ساتھ۔ آپی اس نے مجھے داغ دار کر ڈالا ہے!'' وہ بلک بلک کر روتی سب بتا رہی تھی اور چچی بیگم دھک سے رہ گئیں، البتہ زہرا نے دل ہی دل میں ایک نعرہ لگایا تھا۔ ''یا ہو!'' اس کا جی چاہا وہ ہارون گردیزی کا کندھا تھپک کر اسے اس کارنامے پہ شاباشی دے اور پھولوں کا ہار پہنائے جو رسم آج تک بے زبان جانور کی طرح ان کا ہر مرید نبھاتا آیا تھا وہ رسم ہارون گردیزی نے اپنی مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک رات میں توڑ ڈالی تھی، زہرا بہت خوش ہوئی تھی، وہ اب بار بار شہر بانو کو شرارتی نظروں سے دیکھ کر پرکھ رہی تھی چھیڑ رہی تھی، جبکہ چچی بیگم معاملے کی سنگینی کا سوچ کر ہی کانپ گئی تھیں، ان کے ساتھ شہر بانو کو لینے کے لئے سید سراج حسین آئے ہوئے تھے۔

❁......❁......❁

''یہ کیا بکواس ہے؟'' وہ یکدم مشتعل ہو کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ بکواس نہیں میرا حق ہے مرشد سائیں ہر میاں، بیوی کو ایک ساتھ رہنے کا حق اللہ تعالیٰ نے خود دیا ہے آپ بھلا کیسے روک سکتے ہیں؟ آپ بھی تو اپنی بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں، ہم نے اگر یہ بات کر لی تو کیا بُرا ہے، ہر مرد اپنی بیوی کو اپنی عزت کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ میری بیوی میرے گھر میں میرے ساتھ رہے گی اور کہیں نہیں جائے گی۔'' ہارون اپنے فیصلے پہ جم چکا تھا، سید سراج حسین کا غیض و غضب سے بُرا حال ہونے لگا۔

''ہم نے یہ شادی صرف ایک رسم کے تحت کی تھی۔''

''لیکن میں نے یہ شادی عمر بھر کا ساتھ نبھانے کے لئے کی تھی، میں آپ کی صاحبزادی (بھتیجی) کو شرعی بیوی مان چکا ہوں۔'' اس نے انہیں جیسے کچھ باور کروانا چاہا تھا۔

''ہارون گردیزی تم نہیں جانتے کہ ہماری رسمیں ہمارے لئے کیا ہیں؟'' وہ دانت پیس کر بولے تھے۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کی رسمیں آپ کے لئے کیا ہیں؟ جو صرف بیٹیوں سے شروع ہو کر بیٹیوں پہ ہی ختم ہو جاتی ہیں، کبھی ان کو کاری کر دیا جاتا ہے، کبھی قرآن سے نکاح کر کے کونے میں ڈال دیا جاتا ہے اور کبھی نام نہاد مقدس ڈھونگ رچا کر جیتے جاگتے مار دیا جاتا ہے! مجھے صرف اتنا بتا دیں مرشد سائیں کہ آپ کی نسل، ایک لڑی میں کبھی کسی بیٹے کو کاری

کیا گیا ہے؟ کبھی کسی بیٹے کا صدقہ دیا گیا ہے اسی طرح؟ اونہہ یہ سب رسمیں آپ کی خود ساختہ رسمیں ہیں اور صرف اور صرف دنیا کی نظر میں منفرد بننے کے لئے، اپنے مریدوں کو متاثر کرنے کے لئے، جبھی تو آپ جس بیٹی کو صدقہ کرنے کے لئے شادی کرتے ہیں اس کی شادی میں ہزاروں لوگوں کو انوائیٹ کرتے ہیں تاکہ لوگوں پہ آپ کی دھاک بیٹھ جائے کہ آپ اپنے اصولوں کے بہت پکے ہیں، اور آپ کے اصولوں اور رسموں سے آپ پر بھلا کیا اثر پڑتا ہے؟ زندگی تو بیٹی کی تباہ ہو جاتی ہے نا؟ اور اس شخص کی ذہنی کیفیت کا اندازہ آپ کو بھلا کیسے ہو سکتا ہے جو آپ کی بیٹیوں سے شادی کر کے عمر بھر ان کا نام بھی نہیں لے سکتا، حالانکہ جتنا حق اسے ہوتا ہے اتنا تو آپ کا بھی نہیں ہوتا، بے شک وہ آپ کی بیٹی ہوتی ہے، اور ہاں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ رسم یہ نکاح اپنے خاندان کے کسی مرد کے ساتھ کیوں نہیں کرتے؟ کیا اس میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا؟ یا پھر آپ کو اس پہ اعتماد نہیں ہوتا؟'' ہارون بولنے پہ آیا تو سبھی دیکھتے رہ گئے تھے، زمان گردیزی کی بھی آنکھیں کھل گئی تھیں، اور سید سراج حسین کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالیں۔

''مرشد سائیں پیر، فقیر بننا تو بہت آسان ہے، مگر کسی کا مرشد بننا بہت مشکل ہوتا ہے اپنی خوشی اور اپنے غم کے لئے تو انسان کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ان کے غموں کو اپنا ہتھیار نہیں بنانا چاہیے میری بڑی اماں آپ لوگوں کے پاس ایک آس ایک امید لے کر گئی تھیں کہ آپ اُن کے لئے اللہ سے دعا کریں گے، آپ ان کی دعا کا وسیلہ بنیں گے، انہیں دعا دیں گے، مگر آپ لوگوں نے دعا کے بدلے پوری زندگی کی قیمت مانگ لی؟ آپ نے دعا کا سودا کیا۔ کیا کبھی دعا بھی بیچی جاتی ہے؟ انسان کا چڑھاوا، انسان کا صدقہ تو اللہ تعالیٰ نے بھی نہیں لیا، آپ کیسے لے سکتے ہیں؟

بے شک آپ سید زادے ہیں، میں آپ کا اور آپ کی آل اولاد کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتا ہوں، مگر آپ کے اس ظلم میں کسی بھی مروت اور لحاظ سے کام نہیں لوں گا، لہٰذا آپ سمجھ جائیں کہ شہر بانو میری بیوی ہے اور آپ کے ساتھ نہیں جائے گی، یہ میرا فیصلہ ہے۔'' وہ بات ختم کرتے ہوئے بولا تھا اور سید سراج حسین نہ جانے کیا سوچتے ہوئے اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لے کر واپس چلے گئے تھے، شہر بانو روتی بلکتی رہ گئی تھی، ہارون گردیزی نے اسے اس کے اپنوں سے جدا کر ڈالا تھا۔

❁......❁......❁

اس نے شادی کے دوسرے روز ہی شہر بانو کو باقی سب کے ساتھ حویلی بھیج دیا تھا،

البتہ خود وہ شہر ہی رک گیا تھا، اسے اپنا ایک بہت اہم کام نبٹانا تھا، حالانکہ رحمان گردیزی نے اسے بھی ساتھ چلنے کے لئے بہت اصرار کیا تھا، مگر وہ چاہتے ہوئے بھی گاؤں نہیں جا سکا تھا، بڑی اماں ابھی بھی ہارون سے ناراض تھیں اور ان کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی، لیکن شہر بانو کے ساتھ ان کا رویہ بہت اپنائیت بھرا تھا، بلکہ اندر سے شہر بانو کے سامنے آ کر اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کرتی تھیں، وہ اپنے آپ کو مجرم گردانتی تھیں، مگر وہ یہ نہیں سوچتی تھیں کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں، شاید یہ بھی اللہ کی طرف سے حکم ہی تھا کہ شہر بانو کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی تھی۔ اور شہر بانو؟ اسے تو ایسی چپ لگی تھی کہ زہرا آپی اور چچی بیگم کے جانے کے بعد سے اب تک زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، وہ تو جیسے گم سم ہو کر رہ گئی تھی، زینی آپا نے اسے چادر اوڑھائی اور ساری چیزیں سمیٹ کر اسے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ راستے کے دوران بھی زینی آپا نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی، مگر اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

وہ لوگ حویلی پہنچے تو رحمان گردیزی کی چھوٹی بیٹی ثانیہ جو اپنے پیپر کی تیاری کی وجہ سے ان کے ساتھ شادی میں نہیں جا سکی تھی، تمام ملازموں اور گاؤں کی چند عورتوں کے ہمراہ پھولوں سے بھری پلیٹیں لئے اپنی نئی نویلی بھابی کا استقبال کرنے کیلئے تیار کھڑی تھی۔

''ہائے بھابی کیسی ہیں آپ؟'' شہر بانو گاڑی سے اتری تو سب نے پھولوں کی برسات کر ڈالی تھی، ثانیہ جلدی سے پھولوں کی پلیٹ زینی آپا کو تھما کر شہر بانو کے پاس آ کر بہت خوشی سے چہکی تھی، جیسے برسوں سے جان پہچان ہو! اب بھابی نے کچھ کہا ہے یا نہیں وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اس کے گلے لگ گئی تھی، اسے تو یہی دیکھ کر بے پناہ خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی بھابی اتنی خوبصورت ہیں ہارون بھائی کی جوڑی بہت سجے گی۔

''ثانیہ اب بس کرو شہر بانو اتنا سفر کر کے آئی ہے، تھکی ہوئی ہے، راستہ دو اسے!'' زینی آپا نے ثانیہ کو گھورا اور ایک ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹایا تھا۔

''آیئے بھابی اندر آیئے!'' وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی تھی، رحمان گردیزی اس کی عجلت اور خوشی پہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

''چلو نا بیٹا رک کیوں گئی ہو؟'' زمان گردیزی اور خدیجہ بیگم نے اسے آگے بڑھنے کا کہا، وہ خاموشی سے کسی سوچ میں ڈوبی افسردہ سی اندر آ گئی تھی۔

''تم گاؤں کب آ رہے ہو؟'' ایک ہفتہ ہو گیا تھا ان لوگوں کو حویلی آئے ہوئے، لیکن ہارون ایک بار بھی نہیں آیا تھا۔

''بس کام ختم ہوتے ہی آ جاؤں گا، کیوں خیریت تو ہے نا؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا، کیونکہ رحمان گردیزی کافی سختی سے پوچھ رہے تھے۔

''کام ختم کرواور جلدی آؤ، بلکہ کل ہی آ جاؤ، کام وام پھر بھی ہوتے رہیں گے۔'' وہ جھنجھلا کر بولے تھے۔

''لیکن چچا سائیں کچھ بتائیں تو سہی؟ ایسی کیا آفت آن پڑی ہے؟''

''صاحبزادے تمہیں پتہ تو ہے بیویاں بھی کسی آفت سے کم نہیں ہوتیں۔''

''اوہ اچھا...... اچھا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہماری آفت...... سوری ''بیوی'' کو کیا ہوا ہے؟'' وہ کافی دلچسپی اور شرارت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''بیٹا یہی تو مسئلہ ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوتا، وہ ہر بات پہ چپ رہتی ہے، اس کا پورا دن خاموشی میں گزر جاتا ہے، کمرے میں کھانا کھاتی ہے، نماز پڑھتی ہے اور سو جاتی ہے، بس یہی اس کی زندگی ہے اور اماں سائیں اسے دیکھ کر جلتی رہتی ہیں، ان کی طبیعت بھی مسلسل خراب ہے۔'' رحمان گردیزی اب کچھ متفکر سا بول رہے تھے۔

''او کے میں کوشش کرتا ہوں جلدی آنے کی، آپ پریشان نہ ہوں آ کر سب ٹھیک کر لوں گا۔'' وہ کہتے کہتے پھر شرارت سے کہہ گیا تھا۔

''ہاں ہمیں بھی پتہ ہے کہ تمہارے آنے سے سب ٹھیک ہو جائے گا، اسی لئے تو تمہیں آنے کا کہہ رہے ہیں۔'' وہ بھی ہنس دیئے تھے۔

''انشاءاللہ آ رہا ہوں۔''

''اور سناؤ مرشد سائیں کی طرف سے کوئی رسپانس ملا؟''

''نہیں ان لوگوں نے تو دوبارہ کوئی رابطہ ہی نہیں کیا، اب پتہ نہیں وہ میری بات سمجھ گئے ہیں یا پھر کوئی ری ایکشن سوچ رہے ہیں؟'' ہارون نے لاپرواہی سے کہا تھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن تم پھر بھی اپنا خیال رکھا کرو، ایسے لوگ بدلہ لینا بھی نہیں بھولتے، کہیں کوئی نقصان نہ کر دیں۔'' رحمان گردیزی فکرمند ہونے لگے۔

''ڈونٹ وری چچا سائیں اللہ سب بہتر کرے گا۔'' اس نے انہیں تسلی دے کر فون

بند کر دیا تھا۔

⊛......⊛......⊛

ایک ہفتے کا کہتے کہتے اسے دو ہفتے لگ گئے تھے اور وہ شام ڈھلے اتنے طویل سفر کے بعد تھکا ہارا گھر آیا تو اتفاقاً پہلا سامنا شہر بانو سے ہی ہوا تھا، وہ حویلی کے لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی، جب اتنی بڑی روش پہ پھیلی ہارون کی بلیک مرسڈیز سیڑھیوں کے قریب ہی آ رکی تھی، اس نے ہارن پہ ہاتھ رکھ کر شہر بانو کی ساری محویت توڑ ڈالی تھی، اس نے چونک کر چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی گاڑی کو دیکھا، اتنے میں وہ خود بھی گاڑی سے اتر آیا تھا، گرے کلر کے سمپل سے شلوار سوٹ میں ملبوس وہ سچ مچ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ لیکن شہر بانو کو سامنے دیکھ کر اس کی تھکن میں کافی حد تک کمی آئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ قریب آ کر کچھ بولا ہی تھا کہ شہر بانو یکدم اٹھ کر اندر بھاگ گئی تھی اور وہ دیکھتا رہ گیا، اسے اس استقبال کی امید تو بالکل نہیں تھی، لیکن خیر!

"ہارون، تم کب آئے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟" تائی اماں نہ جانے کس کام سے باہر نکلی تھیں، ہارون کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

"ابھی آیا ہوں تائی اماں آپ سنائیں کیسی ہیں؟" وہ سر جھٹک کر ان کے ساتھ اندر آ گیا۔

"ہارون بھائی!" ثانیہ اسے دیکھ کر یکدم صوفے سے اتری تھی، اس کا لہجہ خوشی سے بھر گیا تھا۔

"کیسی ہو چھوٹی؟ کیا کر رہی ہو آج کل؟" ہارون اسے بازو کے گھیرے میں لے کر صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"سلام اماں سائیں۔" خدیجہ بیگم کو دیکھ کر اسے ایک بار پھر صوفے سے اٹھنا پڑا تھا۔

"جیتے رہو، آباد رہو!" وہ دو ہفتے بعد بیٹے کی صورت دیکھ رہی تھی، لہٰذا ساری خفگی بھلا کر اس کے ماتھے پہ پیار دیئے بنا نہ رہ سکیں۔

"بھائی اتنی دیر کیوں لگا دی؟ بھابی تو ہم سے بات بھی نہیں کرتیں، میں تو بلا بلا کر تھک جاتی ہوں، میں بہت مس کر رہی تھی آپ کو!" ثانیہ نے اپنا قصہ شروع کر ڈالا اور وہ دلچسپی سے بیٹھ کر ہنستا رہا تھا۔

"اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہے تو اپنے بھائی کو کمرے میں جانے دو وہ تھکا ہوا آیا

ہے اس نے ابھی کپڑے بھی تبدیل کرنے ہوں گے!" تائی اماں دوبارہ ڈرائنگ روم میں آئیں تو بیٹی کی حماقت پہ اسے ڈانٹنے لگیں۔

"اوہ سوری بھائی مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ بھابی آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ شرمندہ ہونے لگی۔

"ارے پاگل ایسی کوئی بات نہیں، بیٹھو تم۔"

"نہیں آپ پہلے کپڑے چینج کر لیں۔"

"او کے سویٹ ہارٹ۔" وہ اس کا گال تھپک کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا اور اپنے بیڈ روم میں آتے ہوئے اس کی چال کچھ اور ہو چکی تھی جیسے ہلکا سا خمار چھو کے گزر گیا ہو۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ خالی نظر آیا تھا۔ ایک پل کے لئے اسے تشویش سی ہوئی، لیکن اگلے ہی پل باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر مطمئن ہو گیا تھا اور تھکے تھکے سے انداز میں بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا، اسے اسی طرح چاروں شانے چت لیٹے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی، لیکن شہر بانو واش روم سے باہر نہیں آئی تھی، ابھی وہ اسے پکارنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی باہر آ گئی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ بھیگا ہوا تھا، یقیناً وہ وضو کر کے آئی تھی۔

"لگتا ہے مجھ سے ناراض ہیں آپ؟" وہ جائے نماز لے کر پلٹی ہی تھی کہ ہارون بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"راستہ دیں مجھے!"

"پہلے آپ میری بات کا جواب دیں۔"

"میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں پیچھے ہٹیں۔" شہر بانو خفگی سے بولی۔

"نماز پڑھنے تو مجھے بھی جانا ہے ابھی مغرب کی اذان ہونے میں بھی دس منٹ باقی ہیں، زوجہ محترمہ آپ کو نماز کی اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے؟" اس نے شہر بانو کے ہاتھ سے جائے نماز لے کر ٹیبل پہ رکھ دی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے۔

"اس لئے کہ میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتی!" وہ غصے سے کہتی اپنے ہاتھ چھڑا کر رخ موڑ گئی تھی، جبکہ ہارون کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا تھا شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح بے ساختہ اور دل کھول کے ہنسا تھا۔

"اوہ تو آپ مجھے چھوڑ کر نماز میں پناہ ڈھونڈ رہی ہیں؟ لیکن آپ کو ایک بات بتا

دوں کہ اگر آپ مجھے نہیں دیکھیں گی تو اللہ تعالیٰ آپ کو نہیں دیکھے گا۔ آپ ابھی میرے حقوق نہیں جانتیں زوجہ محترمہ!'' اس نے رخ موڑ کے کھڑی شہر بانو کو بہت نرمی اور استحقاق سے بانہوں میں بھر لیا تھا اور شہر بانو اس کی اس قدر بے باک حرکت پہ گھبرا گئی تھی، اس کے پہلے سے بھیگے ہاتھوں میں پسینہ اتر آیا تھا، یوں لگ رہا تھا شہر بانو کی جان ہارون کی بانہوں کے گھیرے میں بندھ گئی ہو، اس کا دل سینے کے پنجرے سے ٹکرا ٹکرا کر پاگل ہونے لگا تھا، شرم سے گال تپ اٹھے تھے۔

''آپ کو کیسے بتاؤں میری جان میں نے آپ کا کچھ سنوارا ہی ہے بگاڑا نہیں، پھر بھی آپ مجھ سے ہی خفا ہیں؟'' اس نے عقب سے شہر بانو کے کان میں کافی گمبھیر لہجے میں کہا تھا، جبکہ شہر بانو اس کے حصار میں جکڑی کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

''پلیز مجھے جانے دیں نماز کا وقت ہو رہا ہے!'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بمشکل بولی تھی۔

نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم!
نہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے!

وہ بہت ہی دلکش لہجے میں کہتا اپنے لفظوں، اپنی وجاہت اور مردانگی کا سحر اس کے چہار سو بکھرا رہا تھا، وہ ازل سے کمزور دل کی نرم کومل سی ڈھیلی ڈھالی لڑکی بے بسی سے اپنی دھڑکنیں سنبھالتی رہ گئی تھی۔

''اللہ کو پالینے کی طلب میں، اس کے دیے ہوئے رشتوں سے منہ پھیر لینا بھی اللہ کو پسند نہیں شہر بانو.....'' اس نے بانہوں کا حصار کھولتے ہوئے شہر بانو کا رخ اپنی سمت موڑ لیا تھا، وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی۔

''ہم لوگ صرف نماز ادا کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارا رب ہم سے خوش ہو گیا ہے اور ہم نے جنت خرید لی ہے، لیکن ہم یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ہمارے رب کی خوشی تو اور بھی بہت سے کاموں میں ہے، جیسے ایک میاں، بیوی کے خوشگوار تعلقات میں، جیسے گھر میں موجود بڑوں کا احترام کرنے میں، جیسے ہر کام کو رب کی رضا ماننے میں، جیسے ساس، سسر کو بھی اپنا ماں، باپ سمجھنے میں اور جیسے ایک اچھی بیوی بننے میں۔''

اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی تھی اور شہر بانو نے اگلے ہی پل چونک کر اسے دیکھا تھا۔ لیکن وہ گہری سانس خارج کرتا سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

''تم نماز پڑھو، تب تک میں بھی وضو کر لیتا ہوں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر وارڈ روب

سے کپڑے نکالنے لگا، شہر بانو کھوئی کھوئی سی آگے بڑھ گئی، وہ کپڑے بدل کر وضو کر کے نکلا، تب جا کر اذان کی آواز سنائی دی تھی، وہ جو اتنی دیر سے نماز، نماز پکار رہی تھی، اب اذان ہوئی تو نظریں چرانے پہ مجبور ہو گئی تھی، البتہ وہ کچھ بھی جتائے بغیر اپنی جیب سے سفید ٹوپی نکالتا باہر نکل گیا تھا۔ اسے مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد جانا تھا اور مسجد ان کی حویلی سے کافی زیادہ دور تھی۔

شہر بانو نے ہارون کی اتنی گہری بات کا اثر بھی کافی گہرائی سے ہی لیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صبح ثانیہ کے بلانے پہ ناشتا کرنے چلی آئی، حالانکہ وہ اتنے دنوں سے اکیلی بیڈ روم میں ہی ناشتہ اور کھانا وغیرہ لیتی تھی اور ثانیہ روزانہ اسے بلانے آتی اور ناامید لوٹ جاتی تھی۔ لیکن آج تو ثانیہ کے دل کی کلی بھی کھل اٹھی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے ٹیبل پہ موجود افراد کو سلام کیا تھا اور وہ سب پہلی بار اس کی آواز سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔

''جیتی رہو بیٹا خوش رہو!'' رحمان گردیزی نے باقاعدہ اُٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

''السلام علیکم۔'' زمان گردیزی ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو اس نے انہیں بھی سلام کیا تھا اور زمان گردیزی اسے سب کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے تھے۔

اور خوش تو بڑی اماں بھی بہت ہو رہی تھیں وہ جو اتنے دنوں سے اپنے مرشد سائیں سے دھوکے کا روگ لئے بیٹھی تھیں، آج کچھ دیر کے اس روگ کو بھی بھول گئی تھیں۔

''السلام علیکم کیا ہو رہا ہے؟'' ہارون وائٹ کھدر کے شلوار کرتا میں ملبوس بہت فریش موڈ کے ساتھ اپنے کف لنکس بند کرتا اندر داخل ہوا تھا۔

''والسلام بیٹا، جیتے رہو!'' رحمان گردیزی مسکرا کر بولے تھے۔ لیکن بڑی اماں کا موڈ پھر سے خفا خفا سا ہو گیا تھا، ہارون کو سامنے دیکھ کر۔

''سلام عرض کرتا ہوں بڑی اماں!'' اس نے ان کی سمت جھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں تیرے سلام پہنچے ہوئے ہیں مجھے!'' وہ رخ موڑ گئیں۔

''جو بھی دیکھو مجھ سے ہی خفا ہے، اب آپ تو مجھ سے ناراض نہ ہوں بڑی اماں۔ میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا، آپ کو ایک عدد بہو ہی لا کر دی ہے، وہ بھی آپ کی اپنی پسند کردہ۔''

اس نے بڑی اماں کے گھٹنے تھام لئے تھے اور وہ جو اس پوتے کے لئے پتہ نہیں کہاں کہاں دھکے

کھا چکی تھیں، اب اس کے اس طرح گھٹنے پکڑ لینے پہ اسے دھکا کیسے دے سکتی تھیں؟ ذرا سے منانے پہ ہی مان گئی تھیں اور اس کی پیشانی چوم کر کندھا تھپکنے لگیں، پھر انہوں نے شہر بانو کو بھی اسی طرح پیار اور شفقت سے نوازا تھا۔

''اللہ نظر بد سے بچائے!'' چچی بیگم نے فوراً کہا تھا۔

لیکن نظر جب لگتی ہے تو چاہے کچھ بھی کر لو بس لگ جاتی ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی لگ گئی تھی یوں اکٹھے بیٹھے ہوئے۔ وہ سبھی ناشتہ کر رہے تھے، جب ان کی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

''سائیں آپ سے ملنے کے لئے کچھ لوگ آئے ہیں۔'' اس نے پیغام دیا۔

''کون لوگ؟'' ہارون نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا، لہجہ کافی سرسری سا تھا۔

''سید سراج حسین اور سید قاسم حسین ہیں!''

''کیا؟'' ملازمہ کے بتانے پہ شہر بانو کے ہاتھ میں چائے کا کپ لرز گیا اور چائے ٹیبل پہ چھلک گئی تھی۔ ہارون کے ساتھ ساتھ رحمان گردیزی اور زمان گردیزی بھی یکدم چونک گئے تھے۔ کیونکہ اتنے دنوں سے ان لوگوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور آج اچانک ان کے گاؤں چلے آئے تھے، یقیناً وہ کوئی خاص مقصد کے لئے ہی آئے ہوں گے۔ ہارون گہری سانس کھینچتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا، لیکن شہر بانو ہارون سے بھی زیادہ تیزی سے اٹھ کر باہر کو لپکی تھی، مگر اس سے پہلے کہ ڈائننگ روم کی حد پار کرتی ہارون نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی تھی۔

''کہاں جا رہی ہیں آپ؟'' ہارون کا لہجہ بے لچک ہو چکا تھا۔

''وہ میرے چچا سائیں اور لالہ جی آئے ہیں میں ان سے ملنے.....''

''ابھی نہیں ابھی ہم لوگ ملنے جا رہے ہیں، انہوں نے اگر آپ سے ملنا ہوا تو تھوڑی دیر بعد مل لیں گے، آپ فی الحال کمرے میں جائیں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے بولا تھا۔

''لیکن وہ.....!''

''میں کہہ رہا ہوں آپ کمرے میں جائیں۔'' اب کی بار اس کی آواز قدرے بلند تھی اور شہر بانو وہاں موجود تمام افراد پہ نگاہ ڈالتی، آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے چلی گئی تھی اور ہارون ابا سائیں اور چچا سائیں کے ساتھ حویلی کے مردان خانے میں آ گیا تھا، جہاں سید سراج حسین اور سید قاسم حسین ان کے منتظر بیٹھے تھے۔

''السلام علیکم مرشد سائیں۔'' ہارون نے سلام میں پہل کی تھی۔ سید سراج حسین سے

تو وہ لوگ واقف تھے، البتہ سید قاسم حسین سے پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی، کیونکہ وہ تقریباً چھ، سات روز قبل ہی انگلینڈ سے واپس آئے تھے اور یہاں ہونے والے کارنامے کا انہیں ابھی پتہ چلا تھا، وہ شہر بانو کے سب سے بڑے بھائی تھے، جنہیں وہ لالہ جی کہتی تھی۔

''کیسے ہیں مرشد سائیں؟ آج ہمیں کیسے یاد کر لیا؟'' ہارون نے بہت اچھے طریقے سے ماحول میں رچی سنگین خاموشی کو توڑا تھا اور بات کا آغاز کیا۔

''تم اپنی سناؤ برخوردار تم کس حال میں ہو؟ اور ہم تمہیں کیسے بھول سکتے ہیں تم نے ہمارے ساتھ کیا ہی کچھ ایسا ہے کہ بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ لب بھینچتے ہوئے بولے تھے۔

''میں نے آپ کے ساتھ کچھ نہیں کیا، بس آپ کی رسم کے خلاف قدم اٹھایا ہے، مرشد سائیں میں نے ایک لڑکی کی زندگی برباد ہونے سے بچائی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا میں نے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے موقف پہ ڈٹا ہوا تھا۔

''تم نے ہماری لڑی میں صدیوں سے چلی آنے والی رسم کو توڑا ہے، ہمارے بڑے بزرگوں کے رواج اور روایات کو داغ لگایا ہے تم نے اچھا نہیں کیا۔ خیر چھوڑو اس بات کو شہر بانو کہاں ہے بلاؤ اس کو۔'' وہ بہت ہی بے نیازی سے بولے تھے۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں اس سے ملنے کی؟'' اس نے استفسار کیا تھا۔

''وہ ہماری بیٹی ہے، کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے؟'' وہ بہت ضبط کرتے ہوئے بولے۔

''آپ کی بیٹی اب میری بیوی ہے، اس لئے میرا حق ہے کہ میں اس سے ملنے والے ہر بندے سے وجہ پوچھ سکوں۔'' وہ بھی بحث کرنے پہ آتا تو پھر کچھ بھی نہیں دیکھتا تھا۔

''ہارون بیٹا چھوڑو ان سب باتوں کو جاؤ شہر بانو کو لے کر آؤ۔'' رحمان گردیزی نے درمیان میں بول کر ہارون کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی، مجبوراً وہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا جہاں وہ اکیلی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

''چلیئے زوجہ محترمہ آپ کی ملاقات آئی ہے۔'' وہ اسے آنسو بہاتے دیکھ کر نہ جانے کیوں طنز کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''کون آیا ہے؟'' وہ بے تابی سے استفسار کر رہی تھی۔

''چل کر خود دیکھ لیجئے۔'' وہ دروازے کا ہینڈل پکڑے کھڑا تھا، شہر بانو جلدی سے چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی۔ رحمان گردیزی اور زمان گردیزی ان کو تنہائی فراہم کرتے تھوڑی

دیر کے لئے باہر نکل گئے تھے، البتہ ہارون اندر ہی صوفے پہ براجمان تھا، شہر بانو اپنے لالہ جی اور چچا سائیں سے گلے مل کر خوب روئی تھی، یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"صبر سے کام لو بیٹا صبر سے، ہم تمہیں لینے کے لئے ہی آئے ہیں۔" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی تھی، جبکہ ہارون نے بُری طرح چونک کر ان کو دیکھا تھا، وہ جیسے کچھ سوچ کر آئے تھے وہاں۔ اتنے میں ہارون کا سیل فون بج اٹھا تھا، کال یقیناً خاصی اہم تھی، تبھی وہ اٹھ کر راہداری کی سمت چلا آیا تھا، اب سید سراج حسین، سید قاسم حسین اور شہر بانو کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ تقریباً پانچ منٹ کال سننے اور پانچ منٹ اپنا کوئی کام نبٹانے کے بعد دوبارہ اندر داخل ہوا تو وہ لوگ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"شہر بانو ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔"

"کس سے پوچھ کر؟" اس کا انداز سرد تھا۔ اس کے اس انداز پہ شہر بانو اور سید قاسم نے ٹھٹک کر دیکھا تھا۔

"ایک بیٹی کے باپ کی طبیعت خراب ہو اور وہ ہسپتال میں پڑا ہو تو ہمارا خیال ہے کوئی بھی روکنے کا حق نہیں رکھے گا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ اسے روکنے کا کوئی بھی حق نہیں رکھتا، سوائے اس کے شوہر کے۔" وہ کافی سخت لہجے میں بول رہا تھا۔

"برخوردار تم جان بوجھ کر......"

"دیکھئے مرشد سائیں آپ چاہے جو بھی جتن کر لیں، میں اپنی بیوی کو آپ کے ساتھ نہیں بھیج سکتا، چاہے اس کے والد محترم بیمار پڑ جائیں، چاہے پورا خاندان۔" "ہم اسے لے کر جا رہے ہیں۔"

"اوکے اگر آپ میری اجازت کے بغیر اسے یہاں سے لے کر جا سکتے ہیں تو ٹھیک ہے جائیے۔" وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گیا تھا، لیکن اس کے خاص ملازم کافی بھاری بھرکم اسلحہ لئے کھڑے تھے، وہ لوگ اس وقت نشانے کی زد میں تھے۔ شہر بانو کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"اللہ کے لئے ہارون آپ کچھ خیال کریں۔" شہر بانو پہلی بار اس طرح مخاطب ہوئی تھی، وہ کسی اور موڈ میں ہوتا تو ضرور انجوائے کرتا، مگر اس وقت سرد مہری کے سوا کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔

"پلیز ہارون میرے بابا سائیں کی طبیعت خراب ہے، مجھے جانے دیں پلیز۔" وہ

کوئی بدمزگی نہیں کروانا چاہتی تھی، جب ہی لجاجت سے کام لیا تھا۔

"آپ آج کی گئی کبھی واپس نہیں آئیں گی، شہر بانو لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ کہیں نہ جائیں۔" وہ کسی طور ماننے والا نہیں تھا، یہاں تک کہ شہر بانو نے ہاتھ بھی جوڑ دیئے تھے۔

"ٹھیک ہے ہارون گردیزی آپ نے جو چاہا وہ کیا۔ اب جو ہم چاہیں گے وہ ہو گا، چلئے چچا سائیں چلتے ہیں اب۔" سید قاسم حسین پہلی بار بولے تھے اور فیصلہ کن بولے تھے شہر بانو کا ہاتھ چھوڑ کر انہیں چلنے کا کہا تھا اور وہ بھی خاموشی سے لب بھینچ کر وہاں سے چل پڑے تھے۔

"چچا سائیں، لالہ جی۔" وہ پیچھے سے پکاری تھی، لیکن سید قاسم حسین نے اسے روک دیا تھا، خود تیزی سے باہر نکل گئے تھے، ہارون نے اپنے آدمیوں کو جانے کا اشارہ کیا اور اس کی سمت پلٹا، مگر وہ لہرا کر فرش پہ آ رہی تھی، اسے ان کے چلے جانے کا اتنا گہرا صدمہ ہوا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اور ہارون کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

⁂......⁂......⁂

کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی گنگنا رہی تھی اور گہرا سناٹا دم سادھے کھڑا تھا، جب بمشکل اس کی آنکھ کھلی تھی، اس نے کچھ یاد آنے پہ چونک کر گردن موڑی، ہارون چند انچ کے فاصلے پہ لیٹا سو رہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ شہر بانو کے اوپر پورے استحقاق سے رکھا تھا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کے لمس، اس کی اتنی قربت سے یکدم تڑپ کے اٹھ جاتی، لیکن آج کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کے لمس کی وجہ سے نہیں اپنے اندر اُمڈنے والی نفرت کی وجہ سے اٹھ بیٹھی تھی اور اس کے اس طرح یکدم جھٹکے سے اٹھ جانے کی وجہ سے ہارون کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی۔ صبح وہ گہرے صدمے کی وجہ سے بلڈ پریشر لو ہو جانے کی بنا پر بے ہوش ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے اس کے لئے ڈرپ تجویز کی تھی، اس لئے دوائی کے زیر اثر وہ رات گئے تک غنودگی میں رہی تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" ہارون نے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے اس کی کلائی چھو کر دیکھی۔

"پلیز مجھے ہاتھ مت لگائیں۔" وہ ناگوار لہجے میں بولی تھی۔

"کیوں ہاتھ نہ لگاؤں؟ یہی تو وقت ہوتا ہے آپ کو ہاتھ لگانے کا۔" اس نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے شہر بانو کو بازو سے پکڑ کر اپنی سمت جھکا لیا تھا، کمرے میں نیم تاریکی کی وجہ سے وہ ابھی تک اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پایا تھا۔

"مگر مجھے آپ کا لمس اذیت دیتا ہے، بُرا لگتا ہے، نفرت ہوتی ہے مجھے آپ سے۔

آپ انسان نہیں بہت بے رحم اور بے حس جانور......

"شہر بانو" یکدم ہارون کا ہاتھ اٹھا تھا اور شہر بانو کے چہرے پہ نشان چھوڑ گیا تھا۔

"کبھی کسی اور کی وجہ سے مجھ سے اونچی آواز میں بات کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔ ہاں اگر تمہارے ساتھ کچھ ناانصافی یا کچھ بُرا کروں تو پھر چاہے کچھ بھی کر لینا، کچھ بھی۔" وہ لفظ چبا چبا کر کہتا بستر سے اُٹھ گیا تھا۔ شہر بانو روتی ہوئی دوبارہ تکیے پہ گر گئی تھی، جبکہ ہارون دروازہ کھول کر ٹیرس پہ چلا گیا تھا اور اس نے ساری رات ٹھنڈک میں ٹیرس پہ کھڑے کھڑے گزار دی تھی، فجر کی اذان ہوئی تو وہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد چلا گیا۔

◈......◈......◈

وہ دوبارہ اس سے کوئی بات کئے بغیر شہر واپس چلا گیا تھا، اتنی جاگیر، اتنی جائیداد ہونے کے باوجود وہ اپنا بزنس کرتا تھا، اسے باپ، دادا کی کمائی پہ عمر بھر عیش کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا، حالانکہ رحمان گردیزی اور زمان گردیزی اسے منع کرتے تھے کہ اور کاموں میں پڑنے کی بجائے وہ اپنی جاگیر سنبھالے تو انہیں خوشی ہوگی، لیکن اسے ابھی سے جاگیرداری کے جھنجٹ میں پڑنا پسند نہیں تھا۔ اگرچہ وہ لوگ اصرار بھی کرتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے ان کا اکلوتا لاڈلا سپوت ہر وقت حویلی میں نظر آتا رہے، مگر وہ...... وہ جو پہلے ایک، دو ہفتے بعد آجاتا تھا، اب دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی حویلی آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

شہر بانو مسلسل دو ماہ سے اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی، اس نے سب سے ترکِ تعلق کر رکھا تھا، یہاں تک کہ ثانیہ اور زینی آپی سے بات بھی نہیں کرتی تھی، حالانکہ زینی آپا دوبارہ اپنے سسرال سے بطورِ خاص اس سے ملنے کے لئے آئی تھیں، لیکن وہ تو جیسے گونگے کا گڑ کھا بیٹھی تھی۔

"شہر بانو تم بتاتی کیوں نہیں بولو کیا ہوا ہے، کوئی ناراضی ہوئی ہے تم دونوں میں؟ اس نے تم سے کچھ کہا ہے؟ اللہ کے لئے کچھ تو بتاؤ، ہم سے بات تو کرو۔" زینی آپا نے بالآخر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"کیوں کروں آپ سے بات؟ کیا رشتہ ہے میرا اور آپ کا؟ کس حیثیت سے مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں؟ اونہہ جس حوالے سے آپ مجھے دیکھ رہی ہیں اس حوالے کو دو ماہ سے میں نے تسلیم کرنا چھوڑ دیا ہے، آپ سب لوگ دھوکے باز، دوغلے اور انتہائی بے رحم لوگ ہیں، انسانیت ختم ہو چکی ہے آپ لوگوں سے...... میں آپ سب کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی، چلی

جائیں یہاں سے، آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھنے اور بات کرنے سے بہتر ہے میں اکیلی خاموش کمرے میں بیٹھی رہوں۔" وہ یکدم پھٹ پڑی تھی اور اس کے اندر اُبلنے والا زہر پوری شدت سے باہر آیا تھا، زینی آپا کتنے ہی لمحے ششدر سی بیٹھی رہ گئی تھیں، اس کے الفاظ، اس کا لہجہ سن کر وہ بے یقین سی ہو رہی تھیں کہ کیا یہ سب کچھ شہر بانو نے ہی کہا ہے نا؟ وہ شہر بانو جو ذرا سا اونچا بولتے ہوئے بھی سو بار سوچتی تھی، جس کا لہجہ ہی اتنا ملائم ہوتا تھا کہ ہر بات میٹھی لگتی تھی۔

"لیکن شہر بانو اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی نا؟ آخر ہوا کیا ہے؟" زینی آپا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے دوبارہ سے سلسلہ کلام جوڑا تھا۔

"جب آپ کا بھائی میرے گھر والوں کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے، میرے بابا کی طبیعت خراب کا سن کر بھی اس پہ کوئی اثر نہیں ہو سکتا، میرے رشتوں کی عزت نہیں کر سکتا، میرے بڑے بزرگوں کی رسم و روایات توڑ سکتا ہے تو میں بھی ایسا کر سکتی ہوں، میں بھی اس کے رشتے ناطے نبھانے کی پابند نہیں ہوں۔" وہ چیخ گئی تھی اور زینی آپا کو سارا معاملہ سمجھ آ گیا کہ وہ کس وجہ سے ایسی ہو رہی ہے۔

"شہر بانو وہ بھی تو تمہارا بھلا ہی چاہتا ہے تمہاری زندگی کو بے رنگ ہونے سے بچا رہا ہے، بلکہ تمہیں ہی نہیں تمہاری آئندہ نسل میں پیدا ہونے والی بیٹیوں کو بھی بچانے کی کوشش کر رہا ہے، آج اگر تم اس رسم کی بھینٹ چڑھ جاتیں تو کل تمہارے بڑے بھائی کی بیٹی کو بھی اس رسم کے نام پہ قربان کیا جا سکتا تھا، کیا تم چاہو گی کہ تمہاری بھتیجی کے ساتھ ایسا کچھ ہو؟" زینی آپا نے اسے آئندہ کا منظر دکھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی بھتیجی کا سن کر چونک گئی تھی۔

"تم اپنے بارے میں نہ سوچو، مگر ایک بار آنے والی نسل کی بیٹیوں کو سوچو، ان کا کیا حال ہوگا؟ اور پھر یہ بھی سوچنا کہ ہارون کس حد تک غلط ہے؟" وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر چلی گئیں اور شہر بانو حقیقتاً ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ اپنے سے آگے تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی بھتیجی بھی؟

◈......◈......◈

چند دنوں سے اس کی طبیعت کچھ بوجھل بوجھل سی ہو رہی تھی، لیکن نہ تو وہ کمرے سے باہر نکلی تھی اور نہ ہی کسی اور کو طبیعت کی خرابی کا بتایا تھا، اسی لئے دن گزرتے رہے اور اس کی صحت گرتی رہی، اسے اپنی کمزوری اور نقاہت کا احساس تو تھا، مگر اپنا خیال رکھنے کا احساس نہیں تھا، اسے بس اپنوں سے جدائی اور رسم اور روایات کے ٹوٹنے کا غم کھائے جا رہا تھا، وہ دن بھر

بس یہی سوچتی رہتی تھی، اب تو دماغ بھی چکرانے لگا تھا۔ پہلے اس کی یہ حالت گھر والوں نے نوٹ کی تھی اور آج...... آج تو ہارون بھی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

ظہر کا وقت تھا جب وہ شہر سے گاؤں آیا تھا، پہلی ملاقات چچا سائیں اور ابا سائیں سے ہوئی تھی، وہ لوگ کسی پنچائیت سے واپس آئے تھے، ان سے مل کر بڑی اماں کو سلام کرتا وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ شہر بانو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتی ہوئی گہری سوچ میں گم تھی، دروازہ کھلنے کی آہٹ پہ بھی اس کی سوچ کا تسلسل نہیں ٹوٹا تھا۔ ہارون اسے اس حال میں دیکھ کر چونک ہی تو گیا تھا، کیونکہ وہ اسے اچھے بھلے حال میں چھوڑ گیا تھا، اس کی صحت بھی ٹھیک ٹھاک تھی، لیکن اب تو وہ کافی بیمار نظر آ رہی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے اپنے اور شہر بانو کے درمیان موجود خفگی اور غصے کی دیوار کے باوجود سلام کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا، شہر بانو نے یکدم چونکتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس کی طرف سے سلام کا جواب نہ پا کر اس نے دوسرا سوال کر ڈالا، مگر یہاں تو دوسرے سوال کا جواب بھی ندارد...... ہارون بیڈ کی پائنتی والی سائیڈ سے گھوم کر اس کی سائیڈ میں آیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

''لگتا ہے آپ کی طبیعت خراب رہی ہے؟ آپ کی صحت بہت ڈاؤن لگ رہی ہے۔'' اس نے بہت ہی نارمل سے انداز میں فوراً ہی اپنی تشویش کا اظہار کر دیا تھا۔

''میری صحت ڈاؤن ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ زندہ تو ہوں۔'' وہ تلخی سے کہتی بیڈ سے اٹھنے لگی تھی کہ ہارون نے اس کا ہاتھ سختی سے تھام لیا تھا۔

''شہر بانو آپ کی اس بدگمانی اور خفگی کی وجہ سے میں اتنے دن حویلی نہیں آیا، مجھے پتہ ہے کہ آپ کو مجھ سے چڑ ہو گی، مجھ پہ بار بار غصہ آئے گا، جس کی وجہ سے میرا موڈ بھی آف ہو گا۔ تو اس سے بہتر تھا کہ ہم لوگوں کا سامنا ہی نہ ہوتا، لیکن ایک انسان اپنے گھر سے کتنی دیر دور رہ سکتا ہے۔ میں بھی آج چلا آیا، آپ کی خفگی اور بدگمانی مٹانے کے ارادے سے۔'' وہ اس کا ہاتھ نرمی سے دبا رہا تھا۔

''اونہہ بدگمانی مٹانے کے ارادے سے جس طرح آپ اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکتے تھے، اسی طرح میں بھی نہیں رہ سکتی، میرا بھی دل چاہتا ہے اپنوں سے ملنے کو، اپنے گھر

جانے کو، سب کو دیکھنے کے لئے میں بھی تڑپتی ہوں۔'' وہ دبے لہجے میں چیخ کر کہتی اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

''میں آپ کو اپنوں سے ملنے سے کبھی نہ روکتا، اگر ان کے عزائم اچھے ہوتے، اگر وہ آپ کو دوبارہ میرے پاس آنے دیتے، میں آپ کا جانا تھوڑی دیر کے لئے تو افورڈ کر سکتا ہوں، مگر ہمیشہ کے لئے نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''مگر میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''مگر میں آپ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے ہاتھ کو نرمی سے قریب کرتے ہوئے ہاتھ کی پشت پہ بوسہ دے چکا تھا، شہر بانو گنگ سی ہو گئی تھی، اس کے ہونٹوں کا لمس جسم میں سنسنی سی بھر گیا تھا، اس کے سارے احتجاج اور بدگمانیاں جیسے ٹھٹھر کے رہ گئی تھیں کہ یہ کیا ہوا ہے؟

''پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔'' وہ مرے مرے لہجے میں بمشکل بولی تھی۔

''اتنے دنوں بعد آیا ہوں، ملیں گی نہیں مجھ سے؟'' اس کے کہنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ شہر بانو چہرہ جھکانے پہ مجبور ہو گئی تھی اور ہارون نے اتنے نازک فسوں خیز لمحوں کو رفتہ رفتہ اپنی دسترس میں لینا شروع کر دیا تھا۔ مسلسل اتنے دنوں سے ذہنی جنگ لڑ لڑ کر دونوں ہی تھک چکے تھے، اک دوسرے کے قرب کا سہارا ملا تو انکار نہیں ہو سکا تھا۔ شہر بانو تو تھی ہی نرم مزاج، وہ سختی کا خول چڑھا ہی نہیں سکتی تھی، بس باپ کی بیماری کا سن کر اتنی تلخ ہو گئی تھی اور یہ تو اس کا حق بنتا تھا کہ اس طرح غصہ کرے کیونکہ ایسے حالات میں تو بندہ نہ جانے کیا کیا کر ڈالتا ہے، اس نے تو پھر صرف غصہ ہی کیا تھا، اور ہارون کو بھی اس کے غصہ ختم ہونے کا انتظار تھا، تاکہ وہ آرام سے اسے دوبارہ سمجھا سکے، لیکن پہلے اس نے پیار بھرے انداز میں سمجھانا شروع کیا تھا۔

۞......۞......۞

''بیٹا تم اور کچھ نہ کرو بس شہر بانو کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، اس کا چیک اپ کرواؤ، کیا مسئلہ ہے اسے، وہ اتنی کمزور اور زرد کیوں ہو رہی ہے؟'' اماں سائیں نے ناشتے کی میز پہ پہلا ذکر یہی کیا تھا کہ شہر بانو بیمار لگتی ہے، جواباً سبھی نے ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''ٹھیک ہے اس بار شہر جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔'' آپ بھی ساتھ چلئے گا، پھر آپ لوگوں کو واپس بھیج دوں گا اور خود وہیں رک جاؤں گا۔'' اس نے پروگرام ترتیب دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کے لئے چائے بنانے لگیں۔

مگر وہ لوگ ابھی پروگرام ہی بنا رہے تھے کہ شہر بانو کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، آج صبح سے اسے بار بار ابکائی آ رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ مزید نقاہت کا شکار ہوئی تھی اور بلڈ پریشر بھی لو ہوگیا تھا، ملازمہ معمول کے مطابق اس کا ناشتہ دینے کمرے میں گئی تو اس کو نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر الٹے پیر بھاگی تھی۔

"صاحب جی! وہ بی بی جی بہت بیمار ہیں بے ہوش پڑی ہیں۔" رضیہ ہانپ رہی تھی، ہارون پریشان ہوتا فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا، اماں سائیں، چچی اماں اور ثانیہ بھی اٹھ کھڑی ہوگئی تھیں، ہارون صبح سویرے ہی بیڈ روم سے نکل آتا تھا، کبھی زمینوں کی طرف نکل جاتا تھا اور کبھی حویلی کے لان میں ہی گھاس اور شبنم کو روندتے ہوئے باتوں میں وقت گزار دیتا تھا، آج بھی وہ زمینوں کی طرف گیا تھا اور واپسی پہ ان کے ساتھ ہی ناشتہ کرنے بیٹھ گیا تھا اور اب اس کی طبیعت کی خرابی کا پتہ چلا تو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تھا، کیونکہ شہر بانو کی طبیعت فجر سے ہی خراب لگ رہی تھی، وہ دوبارہ اٹھ کر باتھ روم گئی تھی اور وہ اسے میڈیسن لینے کا مشورہ دے کر باہر چلا آیا تھا۔

"کیا ہوا ہے شہر بانو؟ بیٹا آنکھیں کھولو۔" ہارون نے اسے بیڈ پہ ڈالا تو اماں سائیں نے فکر مندی سے اس کا ہاتھ تھام کر سہلایا تھا، اس کا گال تھپکا۔

"رضیہ ادھر آؤ۔" چچی اماں نے شہر بانو کو اک نظر دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"جاؤ وہ لیڈی ڈاکٹر ہمارے گاؤں میں رہتی ہے اسے بلا کر لاؤ۔" لیڈی ڈاکٹر کے ذکر پہ اماں سائیں اور ہارون بیک وقت چونکے تھے۔

"چچی اماں؟" ہارون نے کچھ کہنا چاہا، مگر انہوں نے روک دیا تھا۔

"تم باہر جاؤ بیٹا، یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" ہارون ان کے ٹوکنے پہ شرمندہ سا ہو کر آ گیا تھا اور پھر سچ مچ چچی اماں کے شک نے انہیں ایک خوشخبری سنا ڈالی تھی، جس سے وہ سبھی لوگ ہی نہیں ہارون بھی بے انتہا خوش ہوا تھا اور بڑی اماں تو واری صدقے ہو رہی تھیں، انہوں نے بے ہوش پڑی شہر بانو کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔

✿ ...... ✿ ...... ✿

"لگتا ہے آپ اس خوشخبری سے خوش نہیں ہیں؟" ہارون پہلی نظر میں ہی شہر بانو کا کم سم رویہ دیکھ کر جان گیا تھا۔ وہ کچھ بھی کہنے کی بجائے خاموش رہی تھی، آج وہ لوگ شہر جا رہے تھے، اماں سائیں اس کا مکمل چیک اپ کروانا چاہتی تھیں، اس کے لئے بیڈ ریسٹ اور غذا وغیرہ

کی تفصیل جاننا چاہتی تھیں، جبکہ شہر بانو کو اس چیز کی کوئی خوشی نہیں تھی، الٹا اپنا آپ قیدی نظر آنے لگا تھا۔

"مگر شہر بانو میں بہت خوش ہوں، اللہ نے میری بہت بڑی خواہش پوری کی ہے، ہمارا بچہ ہماری تکمیل کرے گا اور ہمیں مزید قریب لے کر آئے گا، ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط ہوگا، ہماری زندگی مکمل ہو جائے گی۔" وہ دل کی گہرائیوں سے اظہار کرتا اسے دونوں کندھوں سے تھام چکا تھا، جبکہ وہ تو ہارون کی شکل دیکھنے سے بھی کتراتی تھی اس وقت بھی نظر چرا گئی تھی۔

"شہر بانو مجھے اپنا سمجھو، میں تمہارا ہوں اور کبھی تمہارا برا نہیں چاہوں گا، تم مجھ سے بدگمان نہ رہا کرو، میرا دل بجھ جاتا ہے۔" وہ اتنی بڑی خوشخبری پا کر جذباتی پن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور آج پہلی بار آپ سے "تم" تک آیا تھا، شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اب ان کے بیچ کے فاصلے مٹ گئے ہیں، مگر اماں سائیں ساتھ جانے سے کترا تو رہی تھیں، مگر ہارون تسلی کے لئے زبردستی ان کو ساتھ لے آیا تھا، پہلا دن تو انہوں نے گھر پہ ہی گزارا تھا اور ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا تھا۔ دوسرے دن عصر اور مغرب کے درمیان وہ لوگ ہسپتال جانے کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

"ہسپتال اچھا ہے نا؟" اماں سائیں کے سوال پہ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"نہیں میں آپ کو سرکاری ہسپتال لے کر جا رہا ہوں، وہ بھلا اچھا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"پگلے میرے کہنے کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر تو ماہر ہے نا؟ کئی ایسی بھی ہوتی ہیں جو نئی نئی سیکھ رہی ہوتی ہیں اور لوگوں کی جان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔" اماں سائیں نے مسکرا کر کہا۔

"اماں سائیں جس طرح میں آپ کو بہت پیارا ہوں اسی طرح مجھے بھی تو اپنی اولاد پیاری ہے۔" اس نے دلچسپی سے کہتے ہوئے شہر بانو کی طرف دیکھا جو ماں، بیٹے کی گفتگو سے یکسر انجان اور لاتعلق بنی بیٹھی تھی، سارا راستہ یونہی کٹ گیا تھا، ہسپتال پہنچ کر ہارون پھر اپنے سنجیدہ موڈ میں آ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت اور چیک اپ کے مطابق چند ابتدائی ٹیسٹ کروائے، الٹرا ساؤنڈ کروایا اور پھر مثبت رپورٹ لے کر وہ لوگ وہاں سے نکلے تھے، البتہ شہر بانو کی کمزوری کے پیش نظر ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں تجویز کی تھیں جو ہسپتال سے فوری نہیں مل سکی تھیں، لہٰذا ہارون نے سڑک پار بنے چند میڈیکل سٹورز کی طرف رجوع کیا تھا۔

"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں میں دوائی لے کر آتا ہوں۔" وہ دروازہ کھول کر ان کو بٹھا کے سڑک کراس کر گیا تھا۔

ابھی اسے گئے چھ، سات منٹ ہی ہوئے تھے کہ ان کی گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔

''لالہ جی!'' شہر بانو چکرا گئی تھی۔

''نیچے اترو شہر بانو!'' وہ عجلت میں بولے تھے۔

''مگر لالہ جی.....''

''شہر بانو نیچے اترو۔'' وہ اس کی بات سنے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی سمت کھینچ چکے تھے، ایسے میں اماں سائیں تڑپ اٹھی تھیں، وہ شہر بانو کی حالت سے واقف جو تھیں، ''ماں جی آپ آرام سے بیٹھی رہیں، ہم آپ کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ مگر اپنے بیٹے کو اتنا بتا دیجئے گا کہ کسی پہ اچانک حملہ نہیں کرنا چاہئے، بندہ سنبھل نہیں پاتا۔'' وہ ایک ہی بات میں اپنا حملہ اور ہارون کا حملہ بھی واضح کر گئے تھے، اماں سائیں نے انہیں روکنے کی پیچھے جانے کی کوشش کی، مگر ان کے ساتھ مسلح افراد تھے، شہر بانو کبھی اماں سائیں کی تڑپ اور کبھی لالہ جی کا غصہ دیکھتی گھسٹتی چلی گئی تھی، اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوا ہے؟ وہ تو یہ بھی نہ جان سکی کہ اچھا ہوا یا بُرا؟

❁......❁......❁

ہارون کے لئے سچ مچ یہ حملہ بہت کاری تھا اور اس سے حملے سے سنبھلنا بھی بہت مشکل کام تھا، مگر ہارون نے یہ حملہ سہہ کر دوسروں کو بھی سنبھالا تھا اور اپنے آپ کو بھی...... وہ چاہتا تو ان کے اس ایکشن کا ری ایکشن لے سکتا تھا، وہ پولیس کی مدد سے بھی اپنی بیوی، اپنی منکوحہ پہ حق جتا سکتا تھا، مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا، کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ لوگ شہر بانو کی کنڈیشن جان لینے کے بعد زیادہ دن اپنے پاس نہیں رکھیں گے اور ویسے بھی وہ اس مسئلے کو اچھالنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ شہر بانو اب ان کی نہیں ہارون کی اپنی عزت تھی اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ جس زنجیر میں شہر بانو بندھ چکی ہے وہ اتنی کمزور نہیں کہ اس سے رہائی ممکن ہو...... شاید اسی لئے وہ کافی حد تک ریلیکس تھا، کیونکہ اگر وہ لوگ کوئی حتمی فیصلہ کرنا بھی چاہتے تو انہیں سو بار سوچنا تھا۔

اور یہ سچ ہی تو تھا شہر بانو کے واپس آنے کی خوشی سب کو ہوئی تھی، سبھی باری باری اس سے ملنے آئے تھے اور سبھی کو اس کی کمزور حالت اور زرد رنگت پہ افسوس ہوا تھا کہ ان کی بیٹی غم میں گھل کر آدھی رہ گئی ہے، مگر جب عورتوں پہ اصل بات کا انکشاف ہوا تو وہ بدک کے رہ گئی تھیں۔

''بچہ؟ اس کم بخت کا بچہ اٹھا لائی ہو تم؟ تمہیں شرم نہیں آئی؟ تم اپنے بھائیوں کا، اپنے باپ کا صدقہ تھیں، تم اپنا آپ بھی نہ سنبھال سکیں؟ داغ لگا کے رکھ دیا ہے اس لڑکی (نسل) کو۔'' چچی بیگم نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا تھا اور شہر بانو گھبرا کر ان کی شکل دیکھنے لگی اور پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سب عورتوں کا جمگھٹا سا لگ گیا تھا، جس میں مجرم شہر بانو سر جھکائے شرمندہ سی مرجانے کو تیار بیٹھی تھی۔

''کاش تم مر جاؤ، ہارون گردیزی تم نے مجھے میرے اپنوں کی نظروں میں گرا دیا ہے، میں مجرم بن گئی ہوں۔'' اس نے دل ہی دل میں ہارون کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی، مگر دل اتنا بھر آیا تھا کہ آنسوؤں کو رکنے کے لئے جگہ نہ ملی تھی اور وہ چھلک آئے تھے۔

''امی کیا ضروری ہے کہ آپ ہر کام میں مداخلت کریں؟ اس میں شہر بانو کا کیا قصور ہے؟'' زہرا اس کے قریب آتے ہوئے اس کی ڈھال بن گئی تھی اور اپنی ماں سے خفا ہونے لگی۔

''ارے قصور کیوں نہیں ہے؟ یہ اسے منع بھی تو......''

''پلیز امی اللہ کے لئے کچھ تو خیال کر لیں یہاں کنواری، غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی ہیں۔'' اس نے سب کی سمت اشارہ کیا تھا جو شہر بانو کا تماشا دیکھنے کے لئے دلچسپی سے کھڑی تھیں۔

''ٹھیک ہے بی بی میں کچھ نہیں کہتی، مرد لوگ خود کہہ لیں گے۔'' وہ تنفر سے کہتی کھڑی ہو گئیں۔

''مرد لوگ کیا کہیں گے؟ یہ اس کی بیوی بن کے گئی تھی بہن نہیں، اور بیوی پہ وہ ہر حق جتا سکتا تھا، ایک چھت تلے رہتے ہوئے وہ اتنا بھی مولوی یا پرہیز گار نہیں تھا کہ اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا، اور عورت کہاں اور کب تک بھاگ سکتی ہے؟ مرد سے؟'' زہرا نے لڑکیوں کے جاتے ہی اپنی ماں کو صاف صاف سنائی تھیں۔

شہر بانو اور ماں جی تو زہرا کی مشکور ہو گئی تھیں، لیکن زہرا بے شک زبان کی تلخ و تیز تھی، مگر دل کی کھری تھی، وہ پہلے بھی شہر بانو کا بھلا ہی چاہتی تھی اور اب بھی وہ اسی کے حق میں بول رہی تھی، وہ اسے ساتھ لے کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی، جبکہ پیچھے سرگوشیاں اور باتیں شروع ہو گئی تھیں۔

❁......❁......❁

شہر بانو کو واپس آئے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے، مگر ان تین ماہ میں اس نے جی بھر کے خفت، شرمندگی اور ذلت دیکھی تھی، وہ اپنے ہی گھر میں ”چوروں اور مجرموں“ کی طرح رہ رہی تھی، گھر کے کسی بھی مرد کے سامنے نہیں جا سکتی تھی، کسی خوشی اور غمی کا حصہ نہیں بن سکتی تھی، تینوں چچیاں اور دونوں پھوپھیاں بھی اس کو دھتکار بیٹھی تھیں، صرف ماں جی اس کے لئے سسکتی اور تڑپتی تھیں، انہیں پتہ تھا وہ کس حالت میں ہے، مگر پھر بھی پریشان اور فکر مند رہتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی صحت بہت ہی خراب رہنے لگی تھی، وہ اسے بہت سمجھاتی تھیں، تسلی دیتیں، مگر اسے یوں سب کی نظروں سے گر کر جینا بہت محال لگنے لگا تھا، وہ اپنے لئے بددعائیں مانگتی تھی اور ماں جی کا کلیجہ کانپ جاتا تھا۔

اسی پریشانی اور ٹینشن میں سارے دن گزر گئے اور شہر بانو کے ہاں بہت ہی پیارا سا بیٹا پیدا ہوا تھا، جس کی پیدائش کی خبر سن کر سب حویلی والوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

”مبارک ہو شہر بانو تمہارا بیٹا بہت ہی پیارا ہے، اپنے ماں، باپ پہ گیا ہے۔“ زہرا نے کھلے دل سے سراہا اور نومولود بچے کو اٹھا کر پیار بھی کیا تھا۔ شہر بانو بے ساختہ رو پڑی تھی۔ اتنے بھرے پڑے خاندان میں سے اس کی ساعتوں کو صرف ایک مبارک سننے کو ملی تھی۔

”کہتے ہیں بیٹے، باپ کا عکس ہوتے ہیں اور بیٹیاں ماں کا......یہ بھی اپنے باپ کا عکس ہی لگ رہا ہے۔“ زہرا بچے کو بغور دیکھ کر مسکرائی تھی اور پھر شہر بانو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ اور بچے کے معصوم چہرے پہ جیسے ہی شہر بانو کی نظر پڑی اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی، اسے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اگر یہی بچہ ہارون گردیزی کی حویلی میں پیدا ہوا ہوتا تو کئی دن تک پورے گاؤں میں جشن منایا جاتا، صدقے دیئے جاتے، نظر اتاری جاتی، لیکن یہاں اس کی پیدائش کی خبر سن کر ہر ماتھے پہ سلوٹ اور ہر چہرے پہ ناگواری کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا، سوائے ماں جی اور زہرا کے۔

”شہر بانو پاگل ہوگئی ہو کیا؟“ زہرا نے اس کا کندھا ہلایا تھا، شہر بانو کے آنسو بچے کے نرم و ملائم چہرے پہ تواتر سے گر رہے تھے اور اس نے کسمسانا شروع کر دیا۔

”کاش ہارون گردیزی نے ہمیں دھوکہ نہ دیا ہوتا۔ اور اگر دے ہی دیا تھا تو پھر میں یہاں دوبارہ واپس نہ آئی ہوتی، زہرا آپی مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا، سب مجھے قصوروار سمجھتے ہیں، کیا میں نے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ایسا کچھ کرے؟ پہلے سب کی ناگواری میرے

لئے تھی، اب......اب میرے بچے کے لئے ہوگی، میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“ وہ پھر سے بلک اٹھی تھی۔

”اس کے پاس واپس چلی جاؤ؟“ زہرا نے سیدھا سیدھا حل بتایا۔

”کیا؟“ وہ بدک گئی تھی۔

”ہاں شہر بانو اب اگر تم مر بھی جاؤ تو تمہیں وہ پہلے جیسا مقام حاصل نہیں ہو سکتا، قاسم لالہ تمہیں تمہاری چاہت یا اپنائیت میں واپس نہیں لے آئے، بلکہ ہارون گردیزی کی ضد اور انتقام میں واپس لے کر آئے ہیں، تاکہ اسے شکست دے سکیں۔ لیکن شہر بانو جو شخص ساری زندگی تمہیں جانتا تک نہیں تھا، تمہارا نام بھی پتہ نہیں تھا، پھر بھی وہ تمہارے بھلے کے لیے تمہاری زندگی کو ایک فضول رسم سے بچانے کے لئے سب کے سامنے ڈٹ گیا تھا اور اپنے فیصلے پہ قائم بھی رہا۔ پلیز......پلیز شہر بانو اسے شکست سے دوچار مت کرنا، اسے ہارنے مت دینا، پلیز میری بات پہ دھیان دینا اور اس کے فیصلے میں اس کا ساتھ دے کر اپنے رشتے کو مزید مضبوط بنا دو، ورنہ تم نہ یہاں کی رہو گی نہ وہاں کی۔“ زہرا نے اسے سمجھاتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں تم سب کو چھوڑ کر اپنے بچے کے بارے میں سوچو، جس کو تم یہاں اس حویلی میں رہ کر کبھی کوئی مقام نہیں دلا سکو گی، جو اتنے بڑے خاندان اور جاگیر کا وارث ہے وہ یہاں ایک ملازم بن کر رہ جائے گا، صرف تمہاری نادانی کی وجہ سے، کیونکہ بیٹیاں تو ہمیشہ ہی ماں، باپ کا گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں، ہر بیٹی کو رخصت ہونا ہی ہوتا ہے، تم انوکھی تو نہیں ہو جو یہاں سے جاؤ گی، ہر بیٹی پہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ماں، باپ کا کہا مانے اور ان کی عزت کی لاج رکھے، تم نے بھی یہ سب کیا، ان کے کہنے پہ ہارون گردیزی سے شادی کی اور ان کی لاج رکھی۔ اب یہ ہارون گردیزی کا مسئلہ تھا کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تم اس کی بیوی ہو اور بیوی ہونے کے ناطے تم پہ فرض ہے کہ تم اس کا کہنا مانو اور اس کا ساتھ دو، اب تم پہ زیادہ حق تمہارے ماں، باپ کا نہیں تمہارے شوہر کا ہے اور تمہارا شوہر غلط بھی نہیں ہے، اس نے اگر ہماری اس ”صدقہ رسم“ کو توڑا ہے تو اچھا کیا ہے، کیونکہ اس رسم کا ذکر نہ تو ہم نے قرآن پاک میں پڑھا ہے اور نہ ہی حدیث وغیرہ میں، یہ سراسر خودساختہ رسم ہے جو ہم لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ جس نے پھوپھی فاطمہ کو نگل لیا ہے، جس سے تم بچ گئی ہو اور جو قاسم لالہ کی بیٹی

زرینہ کو نگلنے کے لئے تیار کھڑی ہے، شہر بانو اپنے اور اپنے بچے کے بارے میں نہ سہی، مگر ایک بار دس سالہ زرینہ کے بارے میں ضرور سوچنا جو آئندہ اس رسم کی بھینٹ چڑھنے والی ہے، اور ہاں یہ سب میں تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ قاسم لالہ کے کہنے پہ میرے ابا سائیں (سید سراج حسین) چند دنوں تک ہارون گردیزی سے تمہاری طلاق کی بات کرنے جا رہے ہیں، اب یہ فیصلہ تم پہ ہے کہ تم نے طلاق لینی ہے یا اس کے ساتھ اس کی سہاگن بن کے رہنا ہے؟ اور یہ کبھی مت بھولنا کہ میں اور تائی اماں تمہارے ساتھ ہیں۔'' زہرا صاف صاف لفظوں میں سب کچھ کہہ کر اسے بیچ منجدھار چھوڑ کر چلی گئی تھی، شہر بانو سوچ کے سمندر میں اکیلی ڈوب رہی تھی اور اس سمندر میں ایک ہی جزیرہ تھا۔ ''ہارون گردیزی'' جو اسے پناہ دے سکتا تھا، کھلے دل سے! اور اس سمندر میں ایک ہی بھنور تھا۔ ''طلاق'' جس میں ڈوب کر وہ اور بھی بیٹیوں کو ڈبو سکتی تھی!

سید معراج حسین بیٹی کی طلاق کے حق میں نہیں تھے، انہوں نے سید سراج حسین اور سید قاسم حسین کا فیصلہ سنا تو انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ قائل نہیں ہوئے تھے، حالانکہ انہوں نے بہت کوشش کی تھی۔

''جو بات جہاں ہے اسے وہاں ہی رہنے دو قاسم حسین ہماری لڑی میں طلاق کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے اور یہ بُرا عمل شہر بانو کے پلو سے مت باندھو۔'' وہ تھکے تھکے سے بولے تھے۔

''ہماری لڑی میں تو صدقہ رسم کے ٹوٹنے کو بھی بُرا سمجھا جاتا ہے ابا سائیں؟''

''لیکن قاسم حسین بہتر ہے کہ اس معاملے کو دبا رہنے دو، کیوں چھیڑ رہے ہو دوبارہ سے؟''

''اس لئے چھیڑ رہا ہوں کہ ہارون گردیزی بہت سکون کی زندگی جی رہا ہے، وہ ابھی بھی شہر بانو کو اپنا حق سمجھے بیٹھا ہے، لیکن میں اس کا ہر حق ختم کر دینا چاہتا ہوں ہمیشہ کے لئے۔'' قاسم حسین کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

''شہر بانو سے پوچھا تم نے؟ وہ کیا چاہتی ہے؟'' سید معراج حسین بہت سمجھ دار آدمی تھے، انہیں پتہ تھا کہ شہر بانو اب اکیلی نہیں ہے اس کا بیٹا بھی ہے۔

''وہ خود اس سے نفرت کرتی ہے، وہ بھی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور اگر ایسا کرے گی تو ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے مر جائے گی۔'' سید قاسم حسین غصے سے لال ہو رہے تھے اور سید معراج حسین چپ سے ہو گئے تھے اور پھر سید قاسم کے کہنے پہ سید سراج حسین نے ہارون

گردیزی کے ساتھ ایک میٹنگ طے کی اور مقررہ وقت پہ اس کے شہر والے گھر پہ چلے آئے تھے۔

طلاق کا لفظ ابھی بھی ہارون کے دماغ کو چبھن دے رہا تھا، جب سے سید سراج حسین گئے تھے وہ مسلسل اسی لفظ کے متعلق سوچ رہا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ بھی خدشہ پل رہا تھا کہ اگر شہر بانو نے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو پھر، پھر میں اسے کیسے کنوینس کروں گا؟ اور میرے بیٹے کا کیا ہوگا؟ وہ ساری زندگی یا تو ماں کے پاس رہے گا یا پھر باپ کے پاس، اُف خدایا، اپنا کرم کرنا مجھ پر!

وہ راکنگ چیئر پہ جھولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام چکا تھا۔ اسے صبح حویلی جانا تھا شہر بانو سے ملنے، اور ابھی تک سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس مسئلے کا اصل حل کیا ہوگا؟ شہر بانو کو یہاں سے گئے ہوئے سات ماہ ہو چکے تھے اور اب تو اس کا بیٹا تقریباً دو ماہ کا ہونے والا تھا اور ہارون نے ابھی تک نہ شہر بانو کو ممتا بھرے انداز میں دیکھا تھا اور نہ ہی بیٹے کی شکل دیکھ کر دل سیراب کیا تھا، بلکہ ایسا دل سیراب کرنے کے لئے تو ہارون گردیزی کے گھر والے بھی ترستے تھے، رحان گردیزی، زمان گردیزی اور بڑی اماں تو بات بات پہ اپنے پوتے کا ذکر کرتے تھے جو انہیں چاہ کر بھی مل نہیں رہا تھا اور یہی بات ہارون کو ڈسٹرب کئے ہوئے تھی، وہ حقیقتاً پریشان تھا کہ فیصلہ کیا ہوگا، کیونکہ وہ خود بھی سید سراج حسین سے وعدہ کر چکا تھا، مردوں والا وعدہ!

''بی بی جی آپ کو چھوٹے سائیں نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔'' شہر بانو صبح صبح بچے کو ماں جی کے حوالے کر کے قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ جاتی تھی اور سورج کی کرنیں نکلنے تک تلاوت کرتی رہتی تھی، ابھی بھی وہ سیپارہ ختم کرتے ہوئے قرآن پاک جزدان میں لپیٹ رہی تھی، جب ملازمہ نے آ کر اطلاع دی تھی اور چچا سائیں کے بلاوے کا سن کر شہر بانو کا دل کانپ گیا تھا، اتنے عرصے میں پہلی بار انہوں نے اسے بلایا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو بیٹا؟''

''وہ ماں جی چچا سائیں نے بلایا ہے۔'' شہر بانو جاتے جاتے ٹھہر گئی تھی۔

''خیریت تو ہے؟''

''پتہ نہیں ماں جی میں بات سن کر آتی ہوں، آپ عثمان کا خیال رکھئے گا۔'' وہ کہہ کر

چلی گئی تھی، لیکن ماں جی کے ماتھے پہ تفکر کی لکیریں بن گئی تھیں۔

''میں اندر آسکتی ہوں چچا سائیں؟'' اس نے دستک دے کر پوچھا تھا۔

''آجاؤ شہر بانو، بیٹھو یہاں۔'' انہوں نے سامنے صوفے کی سمت اشارہ کیا تھا۔

''جی آپ نے بلایا تھا مجھے؟'' اس نے سر جھکاتے ہوئے بمشکل پوچھا۔

''ہاں تمہیں یہ بتانے کے لئے بلایا تھا کہ آج دوپہر کو ہارون گردیزی یہاں حویلی آرہا ہے تم سے ملنے اور شاید کوئی بات کرنے، لیکن بیٹا ہم نے تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ ہم نے تمہاری طلاق کا مطالبہ کیا ہے اس سے اور اب تم نے ہماری ہاں میں ہاں ملا کر ہمارے فیصلے اور مطالبے کی تصدیق کرنی ہے، اسے ہر حال میں طلاق دینا ہی پڑے گی، وہ چاہے کچھ بھی کہے، اس کی باتوں میں مت آنا، ہم اس سے کہہ چکے ہیں کہ تم بھی اس فیصلے میں رضامند ہو، تم اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔'' سید سراج حسین نے اپنے کہے کو سچ ثابت کرنے کے لئے شہر بانو کو جھوٹ پہ اکسایا تھا، وہ بھی کافی رعب اور بے نیازی سے۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ، جب وہ آئے گا تو تمہیں بلالیں گے۔'' شہر بانو کو فیصلے کی سولی پہ لٹکا کر وہاں سے جانے کا حکم دے دیا تھا اور فیصلہ بھی کیسا؟ جس پہ عمل پیرا تو وہ پہلے ہی ہو چکے تھے، اب تو آخری قدم باقی تھا، لیکن اس آخری قدم کا سن کر شہر بانو کے قدم واپس اپنے کمرے میں جاتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے، اس کے ہاتھ برف ہونے لگے تھے۔

''شہر بانو۔'' پیچھے سے زہرا نے پکارا۔

''صبح صبح ابا سائیں کے کمرے میں؟ خیریت تو ہے نا؟'' وہ خود ہی اس کے قریب آگئی تھی، لیکن شہر بانو نے کچھ بھی کہنے کی بجائے اس کی سمت خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا، گم سم اور ناسمجھ سے انداز میں دیکھنے کے بعد وہ خاموشی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں عثمان نے رو رو کر بُرا حال کر رکھا تھا اور ماں جی اسے چپ کراتے ہوئے ہلکان ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے شہر بانو؟ ابا سائیں نے کس لئے بلایا تھا؟'' زہرا اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

''بولو نا کیا بات کہی انہوں نے؟'' اسے بے چینی ہونے لگی تھی۔

''ہارون گردیزی سے میری طلاق کی بات کر کے آئے ہیں اور وہ آج یہاں حویلی آرہا ہے مجھ سے تصدیق حاصل کرنے کے لئے کہ کیا میں طلاق چاہتی ہوں یا نہیں؟'' اس نے

سپاٹ سے انداز میں بتایا تھا۔

''اور بابا سائیں نے کیا کہا تم سے؟''

''کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں اس فیصلے میں برابر کی شریک ہوں۔''

شہر بانو نے کہتے ہوئے اک نظر روتے بلکتے عثمان کی سمت دیکھا۔

''نہیں شہر بانو تم ان کے فیصلے میں ہرگز شریک نہیں ہو۔'' زہرا نے سختی سے تردید کی تھی اور ماں جی بھی حد سے زیادہ پریشان ہوگئی تھیں۔

گھر سے نکلتے وقت ہارون نے ابا سائیں اور چچا سائیں کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ شہر بانو سے ملنے حویلی جا رہا ہے اور کسی حتمی فیصلے کے لئے جا رہا ہے۔ وہ سن کر خوش تو ہوئے ہی تھے، لیکن پریشان بھی ہوگئے تھے کہ وہ ان کی حویلی اکیلا مت جائے، انتقام میں لوگ کچھ بھی کر ڈالتے ہیں، اس کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے اور تنہا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا، مگر ہارون نے انہیں تسلی دی تھی کہ وہ تمام بندوبست کر کے جا رہا ہے، اسے نقصان پہنچانے کی صورت میں وہ لوگ خود بُری طرح پھنس سکتے تھے، اور وہ ہر طرف سے مطمئن ہو کر شام چار بجے حویلی پہنچ کر حویلی کے بڑے سے گیٹ پہ ہارن دے رہا تھا۔ ''حویلی والوں'' کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی اس لئے گیٹ کھلتا چلا گیا تھا...... حویلی کے بڑے سے لان کی سائیڈ میں بنی روش پہ چکر کاٹ کے اس کی مرسڈیز گاڑیوں کے ساتھ آرکی تھی جہاں ایک ملازمہ اس کی مدد کے لئے پہلے سے تیار کھڑی تھی، وہ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ وہ آگے بڑھ آئی تھی۔

''آئیے صاحب جی۔'' وہ سر ہلا کر ملازمہ کے پیچھے چل دیا تھا، طویل راہداری اور ڈرائنگ روم کا احاطہ گزرنے کے بعد ملازمہ اسے گیسٹ روم میں چھوڑ گئی تھی، جہاں سید سراج حسین اور سید قاسم حسین پہلے سے موجود تھے۔

''بیٹھو'' انہوں نے صوفے کی سمت اشارہ کیا تھا۔

''شکریہ۔'' وہ ریلیکس سے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

''کچھ سوچا تم نے؟'' انہوں نے نپے تلے انداز میں پوچھا تھا۔

''جو کچھ آپ سے کہہ چکا ہوں اس کے بعد سوچنے کی گنجائش نہیں نکلتی مرشد سائیں۔ اگر میری بیوی میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو آپ اسے...... مر کے بھی نہیں روک سکتے اور اگر وہ

میرے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو میں آج ہی طلاق نامے پہ سائن کردوں گا۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''ٹھیک ہے اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو ہم سے سارے رشتے توڑ کر ہمیشہ کے لئے جاسکتی ہے اور اگر وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو تمہیں یہ رشتہ توڑ کر جانا ہو گا۔ طلاق کے کاغذات تیار رکھے ہیں ان پہ سائن کردینا۔ چلو قاسم حسین اسے فیصلہ کرنے دو۔'' وہ ٹیبل پہ رکھے کاغذات اور پین کی سمت اشارہ کرکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور سید قاسم حسین بھی باہر نکل آئے۔ کیونکہ شہر بانو نے بھی فیصلہ سنانے کے لئے اندر آنا تھا۔ ملازمہ اس کے لئے چائے اور ساتھ میں کافی لوازمات لے کر آئی تھی، مگر ہارون کو ان چیزوں سے نہیں صرف اور صرف شہر بانو سے مطلب تھا، لیکن پھر بھی ایک اچھے مہمان کی طرح اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔ بلیک پینٹ اور وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے ہاتھ میں چائے کا کپ لئے وہ بہت شاہانہ انداز میں بیٹھا اتنا پرسکون لگ رہا تھا کہ اسے دیکھ کر شہر بانو کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ اور شاید ''دھڑکا'' بھی پہلی بار تھا۔ اور اس ''دھڑکے'' کا پتہ ہارون کو بھی چل گیا تھا، تبھی تو چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں وہ خاموش سر جھکائے کھڑی تھی۔

''شہر بانو۔'' وہ یکدم کپ ایک سائیڈ پہ رکھ کے صوفے سے کھڑا ہوگیا۔

''کیسی ہو تم؟'' وہ اپنے دل کی لپک، اپنے دل کی تڑپ پہ قابو پاتے ہوئے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے اس کے قریب آیا تھا، ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ اتنے دنوں بعد ملنے پہ اسے اپنی بانہوں میں بھر ڈالے، تاکہ اتنے دنوں سے بے چین دل کچھ سنبھل جاتا۔

''خاموش کیوں ہو شہر بانو؟ اب تو تم اپنے گھر میں ہو، پہلے تم میری قید میں تھیں، اب میں تمہاری قید میں ہوں، جو چاہو فیصلہ سنادو، تمہیں پورا پورا اختیار ہے، تم حاکم ہو اس وقت اور میں غلام۔'' ہارون نے بھاری سنجیدہ آواز میں کہتے ہوئے اس کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا اور اس کے ہاتھوں کی سخت گرفت سے اس کی دیوار جان کو ایک مضبوط سہارا ملا تھا۔

''بولو شہر بانو کیا کرو گی آج قید یا آزاد؟'' اس نے اس کے کندھوں پہ دباؤ ڈالا اور اسے کچھ کہنے پہ اکسایا تھا، اس سے پہلے کہ وہ اس کا چہرہ اونچا کرتا وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی ہارون کے سینے سے لگ گئی تھی، اس کے ضبط اس کے صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا، لیکن اس کی [illegible] اختیارحرکت پہ ہارون کا بے چین دل سچ مچ سنبھل گیا تھا، اس کی لپک اس کی تڑپ کو

سکون سا ملا تھا اور ''تسلی'' ہوگئی تھی کہ وہ اسے اپنا قیدی رکھنا چاہتی ہے، آزاد نہیں چھوڑ سکتی۔

''تھینک یو شہر بانو، تھینک یو سو مچ۔'' وہ اسے بانہوں میں بھینچتے ہوئے بے پناہ خوش ہوا تھا، شہر بانو نے اسے شکست سے بچالیا تھا، اس نے اس کی محنت کو رائیگاں ہونے سے بچالیا تھا، اس نے اس رسم کو توڑتے ہوئے سید قاسم حسین کی بیٹی زرینہ کو بچالیا تھا اور نہ جانے کتنی بیٹیوں کی زندگی کو قبر بننے سے بچالیا تھا، چاہے اس کے لئے اسے اپنوں سے ہمیشہ کے لئے بائیکاٹ کرنا پڑ رہا تھا، مگر یہ سودا مہنگا نہیں تھا اور اس سودے پہ زہرا اور ماں جی بہت خوش تھیں، انہوں نے شہر بانو کا حوصلہ بڑھایا تھا اور ساتھ ہی اس کا چھوٹا موٹا سامان بھی تیار کردیا تھا، عثمان کو نئے کپڑے پہنائے تھے اور جی بھر کے...... پیار کیا تھا۔ تب جاکر شہر بانو ہارون سے ملنے گیسٹ روم میں آئی تھی۔

''یار مجھے کیا پتہ تھا تم مجھے اتنی بے تابی اور اتنے والہانہ انداز سے ملو گی۔ ورنہ قسم سے پہلے ہی مرشد سائیں کے ساتھ یہ میٹنگ طے کرلیتا۔ بہت بڑی غلطی کی میں نے دیر کرکے۔'' وہ اپنے آپ کو شرارت سے کوس رہا تھا اور شہر بانو اس کی بات سن کر یکدم اس سے الگ ہوگئی تھی، چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ ''اوکے یار کوئی بات نہیں، باقی کی کسر گھر جا کے پوری کرلینا، جب تک تم کہو گی میں تمہارے سامنے سے نہیں ہٹوں گا۔'' اس نے شہر بانو کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

''پلیز ہارون!'' وہ رخ موڑ گئی تھی۔

''ہارون کی جان۔ دل خرید لیا ہے تم نے تو۔'' وہ بڑے فریش موڈ اور بڑی ترنگ میں تھا، جب اس نے اسے بریک لگائے تھے۔

''کیا واپس نہیں چلنا آپ نے؟''

''چلتے ہیں یار چلتے ہیں، پہلے تم میرے شہزادے کو تو لے کر آؤ۔ تب تک میں تمہارے چچا سائیں یعنی اپنے مرشد سائیں سے مل کر معاملہ سنبھالتا ہوں۔'' وہ شہر بانو کو...... محبت بھرا لمس دے کر باہر نکل آیا تھا۔

اور شہر بانو کو ہارون کے ساتھ جانے کے لئے تیار دیکھ کر سید سراج حسین کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور سید قاسم حسین کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہوگیا تھا، جبکہ سید معراج حسین اور باقی سبھی افراد خاموش تھے۔ شہر بانو نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ سید معراج حسین نے اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا تھا، کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ اس کا کچھ بھی

کہنا فضول ہے، کوئی بھی نہیں سنے گا اور شہر بانو سب پہ ایک سسکتی ہوئی نظر ڈال کر پلٹ گئی تھی، لیکن قدم بہت مضبوط تھے اور رسم کو توڑ ڈالنے کا خیال اور عزم اس سے بھی زیادہ مضبوط تھے، اس کا بیگ ہارون نے تھام رکھا تھا، جبکہ عثمان کو شہر بانو نے اپنی آغوش میں بھینچا ہوا تھا۔

''رب راکھا شہر بانو، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش، آباد اور سدا سہاگن رکھے۔'' زہرا نے ان کی گاڑی کے قریب آتے ہوئے کہا تھا، ماں جی بھی انہیں رخصت کرنے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔

''بہت شکریہ ماں جی۔ آپ کبھی بھی فکر مت کرنا، آپ کی بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''جیتے رہو، خوش رہو، اللہ جوڑی سلامت رکھے۔'' انہوں نے بہت سی دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا اور ہارون ایک فرسودہ رسم کو توڑ دینے کی خوشی میں سرشار عثمان کو بار بار پیار کرتا اور شہر بانو کو شرارت سے چھیڑتا ہوا اپنے گاؤں کی سمت گامزن تھا اور شہر بانو کو یقین ہو چکا تھا کہ اگر انسان کا ارادہ اور عزم نیک ہوں تو تعبیر پا ہی لیتے ہیں جیسے ہارون نے پائی تھی، کیونکہ نیک ارادہ اس نے کیا تھا اور تعبیر اللہ نے دی تھی۔